

SARDAR DYAL SINGH

PUBLIC
LIBRARY

NEW DELHI



Class No. 928. 31431

Book No. 1 / 1

Accession No. 1 / 1

DYAL SINGH PUBLIC LIBRARY

ROUSE AVENUE, NEW DELHI-1.

Cl. No. 928.91431

ب 475

Ac. No. 1134

Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below.
An overdue charge of 0.6 P. will be charged for each day the book
is kept overtime.

[illegible]

بیدل

بیدل

خواجہ عبداللہ اختر

ادارہ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
محفوظ ہیں۔ اقتباسات، اختصارات وغیرہ
کے لئے ناشرین سے اجازت ضروری ہے

طبع اول - ۱۹۵۲
طبع دوم - ۱۹۶۱
تعداد ایک ہزار

محمد اشرف ڈار (سیکرٹری) نے دین محمدی پریس
سرکلر روڈ۔ لاہور سے چھپوا کر ادارہ ثقافت
اسلامیہ لاہور کے لئے شائع کیا ۔

فهرست مضامین

۵ - ۱	۱- عرض حال
۸۵ - ۶	۲- چهار عنصر
۷۹ - ۵۴	شاه کابلی
۸۱ - ۷۹	تصویر
۸۵ - ۸۲	مرقد
۱۰۷ - ۸۶	۳- تذکره
۱۳۰ - ۱۰۸	۴- نکات
۱۶۰ - ۱۳۱	۵- محیط اعظم
۱۹۰ - ۱۶۱	۶- عرفان
۱۹۸ - ۱۹۱	۷- طلسم حیرت
۲۱۵ - ۱۹۹	۸- طور معرفت
۲۳۳ - ۲۱۶	۹- رباعیات
۳۵۶ - ۲۳۴	۱۰- دیوان بیدل
۲۵۰ - ۲۳۸	امروز و فردا
۲۷۹ - ۲۵۰	تجدد امثال
۲۸۹ - ۲۷۹	انتباه
۲۹۸ - ۲۸۹	سیر دل

۲۹۸-۳۲۷

خودی

۳۲۷-۳۲۹

ریش

۳۲۹-۳۳۱

سجده و زنار

۳۳۱-۳۳۲

رسم و عادت

۳۳۵-۳۵۶

اخلاقیات

۳۵۷-۳۶۵

قطعات

۳۶۶-۳۹۶

مقام بیدل



بیدل

عالی صاحب دل است اما کسے بیدل نشد

از کتاب بیدلے گر نقطہ آید بدست
نسخہ آتش تو اں زد تخته یا باید شکست

صد چمن باید بطوفان تغافل دادنت
تا بخون دل توانی ایں قدر ہارنگ بست

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض حال

ابو المعانی مرزا عبدالقادر بیدل کا کلام میرے زیر مطالعہ گذشتہ زائدا از چالیس سال رہا ہے۔ اگرچہ اس کے افکار کی بلندی تک میری رسائی نہیں۔ لیکن جو کچھ اور جہاں تک میرے فہم میں آیا پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ بلند پایہ شخصیت ہے جسے مرزا اسد اللہ خاں غالب ایسے ”سجریکڑاں“ اور ”مویٹا بے صاصل“ اور ہمارے علامہ اقبال مرحوم ”مرشدِ کامل“ کہتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے بھی دادِ سخن دی ہے۔ اس کا نظیر متقدمین میں چند ہستیاں ہیں۔ متاخرین میں اس کا مثل بحشل پیدا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ساتھ فنونِ لطیفہ بلند درجہ سے گرتے جاتے ہیں۔ یونان نے ”ہومر“ اور عرب نے ایام جاہلیت کے شعرا پھر پیدا نہیں کئے۔ تمدن کا ارتقاء پیٹ کے دھندوں سے فرصت لینے نہیں دیتا۔ فنونِ لطیفہ سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کی طرف توجہ تو ان حضرات کی ہوتی ہے جو گوشہٴ قناعت میں بیٹھ کر فقر و فاقہ قبول کرتے ہیں۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ علامہ اقبال کی ایک صحبت میں مٹا کہ فرمایا ”بیدل اپنی طرز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی“ جو جدت اور ایجاد اس کے کلام میں ہے وہ اس کے ہم عصر شعرا میں نہیں۔ ان کے سامنے شہدائین کا کلام بھی ایک نمونہ تھا اور اسی کا اتباع

بیدل

ان کا نصب العین تھا۔ اس لئے بیدل کو ”خارج آہنگ“ کہتے۔ میر غلام علی آزاد لکھتا ہے کہ یہ ان حضرات کا صریح ظلم ہے۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے متقدمین کی چترانی لکیر جو متاخرین عرصہ سے پیٹتے چلے آئے تھے چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی۔ جس سے ہم عصر شعرا ناواقف تھے۔ اسے نئی نئی ترکیبیں بھی اختراع کرنا پڑیں۔ جس نے زبان میں اور وسعت پیدا کی۔ اس کے سوا چار نہ تھا خیالات کے اظہار کا آلہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جب اس کا دامن تنگ ہو تو وسعت خیال کے لئے اسے پھیلا نا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ بیدل مشکل پسند سمجھا گیا۔ لیکن یہ تصور فہم کا ہے۔ اس لیے جب تک طبائع اس کے کلام سے مانوس نہ ہوں بیدل کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔

ایک دفعہ لاہور کے کالجوں کے طلباء نے ”یوم غالب“ منایا۔ علامہ اقبال زندہ تھے۔ ایک وفد باریاب ہوا اور شمولیت کی دعوت دی۔ فرمایا کہ مناسب تھا کہ تم یوم بیدل منائے۔ اچھا الٹ سوال کو زیر بحث لاؤ کہ کیا وجہ ہے کہ غالب کا کلام غلام آباد ہندوستان میں مقبول ہے اور بیدل کو کوئی جانتا بھی نہیں لیکن بیدل کا کلام آزاد ممالک افغانستان میں تلاوت ہو رہا ہے اور غالب کو وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ پھر فرمایا کہ غالب کا تقصوف افسردگی پیدا کرتا ہے اور بیدل کا تقصوف حیات بخش تر و تازگی کے ساتھ ابھارتا ہے۔

بیدل کے تعارف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال اس کے مداح ہیں۔ کلیات بیدل میں مطبوعہ کلام ہی ملتا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کا حوالہ مذکروں میں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے پاس کسی جرد و کا مکمل نسخہ بھی ہو۔ بیدل کے مزار واقع دہلی میں سالانہ عرس کی تقریب پر شعرا جمع ہوتے ہیں یہاں مکمل نسخہ موجود تھا۔ اکثر شعرا نے نقل اسی سے ہم پہنچائی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتا ہے کہ بیدل نے ایک لاکھ سے زائد اشعار لکھے۔ مجھے کلیات وہ بھی کئی ہاتھوں سے گزرتی ہوئی ملی تھی اس وقت میں مدرسہ کا ایک طالب علم تھا۔ گذشتہ فسادات پنجاب میں میرے کتب خانہ

کے ساتھ یہ بھی نہ رہی۔ کابل میں امیر حبیب اللہ کی توجہ سے بیدل کا دیوان شائع ہوا۔ یہ بھی ردیف دال پر ختم ہو گیا۔ امیر شہید ہو گیا اور یہ بھی ناقص رہا۔ خوش قسمتی سے کلیات ایک کرم فرمانے دوروز کے لیے عاید تھی۔ ان دونوں میں میں نے کچھ اشعار نقل کیے۔ اور حسب وعدہ کلیات واپس کر دی۔ جسے مرے عنایت فرما بجا اپنا ”سرمایہ حیات“ سمجھتے ہیں۔ چار سال سے ”ریسرچ“ میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کی سعی مشکور فرمائے۔ اور میں تو شکر گزار ہوں۔ اگر وہ صرف دوروز کے لیے بھی کلیات نہ دیتے تو بہت باتیں رہ جاتیں۔

میں تو پہلے ہی تصور فہم کا اعتراف کر چکا ہوں۔ میں تو میں علامہ اقبال سی بلند پایہ شخصیت بھی یہ اعتراف فراخ دلی سے کرتی رہی کہ میں بیدل کی سطح کی بلندی تک نہ پہنچ سکا۔ اس لئے ان اوراق میں اگر کہیں غلطی نظر آئے اور ضرور ہے کہ غلطی ہو تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ غرض تو اتنی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔

بیدل محض باتونی نہیں۔ وہ انفس و آفاق کا مشاہدہ غائر نظر سے کرتا ہے۔ اس کلام میں صرف شاعرانہ تخیل حسین الفاظ کے زیور سے آراستہ نہیں حکیمانہ تفکر بلند پایہ بھی ہے۔ یہ صرف دعوئے نہیں، دلیل اس کا کلام ہے۔ اگرچہ اس کے کلام کا موضوع وہ سب کچھ ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں مشاہدہ ہوتا ہے مگر ہم نے ایک خاص موضوع کو نمایاں کیا ہے اور یہ فلسفہ خودی اور بخودی ہے۔ اسے ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال نے واضح کیا۔ علامہ مرحوم ایک ایسے زمانہ میں تھے جبکہ مسلمان من حیث انعم شریعت سے پستی کی طرف گر رہے تھے، اور ان کی غلامانہ ذہنیت جس پر مغربی امپیریلزم پورے طور پر مستط تھا اتنی پست ہو چکی تھی کہ ابھرنے کی توقع جاتی رہی تھی۔ میر سید غفرلہ سے لے کر علامہ مرحوم تک قائدین ملت ان کو بھنجوڑ رہے تھے۔ اور یہ ٹکس سے مس تک نہ ہوتے۔ علامہ نے فلسفہ خودی کو سیاسیات پر اطلاق کرتے ہوئے پیش کیا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ بیدل ہستی کی گتھی سلجھانا چاہتا ہے۔

وہ سیاسیات و معاشیات میں اس لئے بھی نہ اُلجھا کہ وہ عہد مسلمانان ہندوستان کے انتہائی عروج کا تھا۔ وہ ان سے الگ ہو کر خود شناس بننا چاہتا تھا، اس نے راز ہستی ممکن حد تک معلوم کر لیا اور جس خوش اسلوبی سے وہ بیان کر رہا ہے بلامبالغہ اسی کا حصہ ہے۔

بیدل کا کلام نظم و نثر کا مجموعہ ہے نظم کو وہ کلی اور نثر کو پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔

اسنجا کہ تمیز محرم تجر و کل است بے شئی و کی لازم انگور و مل است
در گناش اعتبار قدرت بنجاں آرائش نظم غنچہ و نثر گل است

یہ تشبیہ اس کی نظم و نثر پر بالکل منطبق ہوتی ہے۔ اس بے باغی کا مفہوم تو یہ ہے کہ غنچہ میں حسن و خوبی کی رنگینی جمع ہوتی ہے۔ اور جامع الفاظ نظم میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ رنگ و بوسہ کچھ اس میں ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ جب یہ غنچہ کھلتا ہے تو گل بن جاتا ہے۔ اس کی پتھر طریاں اگرچہ بیوستہ ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی طرح نظم کی شرح نثر ہے۔ بیدل کے کلام نظم و نثر میں رنگینی ایک جیسی پائی جاتی ہے۔ ہم نے ان اوراق میں اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ یہ مشکل موضوع ہے۔ چند اشارے کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق زیر بحث سے ہے۔ اگر بیدل کی شاعری پر لکھتے تو مستفاد ہیں اور معاصرین کے ساتھ مقابلہ کرتا پڑتا۔ خود بیدل اسے مذموم قرار دیتا ہے۔ ہم نے منزا اسد اللہ خاں غالب کا ذکر ضرور اس لئے کیا ہے کہ ایک اہل الرائے نے غالب کے کلام کو سراہتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ بیدل نے فارسی شاعری کو بھگاڑ دیا تھا جس کی اصلاح غالب نے کی۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس مضمون کا جائزہ لینا پڑا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب کے فارسی کلام کی قدر و منزلت کم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی سخن گسترانہ بات اس ضمن میں آگئی ہے تو اس کو ان مضمون میں محمول نہ کیا جائے۔

کلیات میں مثنوی عرفان، طلسم حیرت، طور معرفت، دیوان، رباعیات، قصائد، قطعات نظم میں ہیں۔ نمشر میں چہار عنصر (کلیات کی تشریح نظم میں) اور رقعات میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے جو ہمارے پیش نظر موضوع ہے ہم نے اگرچہ علاحدہ علاحدہ ہر ایک جزو کلیات کو ان اوراق میں، جگہ دی ہے۔ مگر جیسا کہ خود بیتدل نے نمشر کو غزل و رباعی و قطعہ سے مرتب کیا ہے ہم نے بھی اس کا اتباع کیا ہے۔ بیتدل نے ایک یا دو رسالے اور بھی لکھے ایک کا نام وہ کلیات کے دیباچہ میں بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔

آخر میں یہ انتباہ بھی بے محل نہ ہو گا جسے مولانا روم ان نفلوں میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل

ہست محسوس و ہست اہل دل

ایک عالم حکیم کے احساسات کا فہم عوام کو نہیں ہوتا۔ اور بعض "ذہن" کی ساخت ہی عام اذہان سے کچھ علاحدہ ہوتی ہے جو کچھ وہ مشاہدہ کرتے ہیں وہ ماو شہ نہیں کرتے۔ بیتدل نے چہار عنصر میں بعض واقعات قلم بند کئے ہیں، جس کا وہ نور شاہد ہے۔ ان کی توجیہ کسی علم کی شاخ سے ہم نہ کر سکیں تو نقص ہمارے علم میں ہے۔ واقعات واقعات ہی ہیں ان کا انکار تو نہیں ہو سکتا۔ عدم علم، علم عدم نہیں ہے۔ اور یہ ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ان کی بھی توجیہ عقلاً ہو سکے گی۔

فیض معنی ورنہ نور تعلیم ہر بے مغز نیست

نشہ راجول بادہ نتوان در دل پمانہ ریخت

ہم نے ان اوراق میں علامہ اقبال کی ایک نظم درج کی ہے جو بیتدل کے ایک شعر پر آئینہ ہے۔ وہ کافی انتباہ ہے۔

چہار عنصر

بیدل کا کلام اس کے سوانح حیات ہی میں۔ اس کے مشاہدات و احساسات و افکار کا مجموعہ ہے۔ چہار عنصر میں اس نے وہ واقعات جنہیں عرف عام میں سوانح زندگی کہتے ہیں خود قلم بند کئے ہیں۔ تذکروں میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ نے بیدل کے حالات لکھے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اصل چغتائی برلاس ہے۔ ۵۴ ہجری میں بلدہ عظیم آباد پٹنہ میں ولادت واقع ہوئی۔ تاریخ ولادت بیدل خود لکھا ہے ۷

بسائے کہ بیدل بملک قہور زفیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبردار از مولدش کہ ہم فیض قدس است و ہم انتخاب
بیدل کی پیدائش شاہ جہاں کے عہد میں ہوئی۔ مغلیہ شہنشاہیت انتہائی عروج پر اور نگارِ عالمگیر کے دورِ حکومت میں تھی اس دور سے گزر کر جانشین شاہانِ مغلیہ کا عہد بھی محمد شاہ رنگیلے تک پایا۔ یعنی یہ ایام بھی دیکھے، جب مغلیہ سلطنت پستی کی طرف جا رہی تھی۔ یہ چراغِ سحری ٹٹکارا تھا اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر پر گُل ہو گیا۔

بیدل مؤرخ نہیں۔ اگر وہ اپنے زمانہ کی تاریخ قلم بند کرتا، تو نہایت معتبر

ہوتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کا صحیح مشاہدہ ہے۔ اُس کے رفات اوپر چہار عنصر اور بعض رباعیات میں ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس کے اپنے زمانہ میں رونما ہوئے۔

”چہار عنصر“ بیدل نے اکتالیس برس کی عمر میں لکھی۔ یہ کتاب نشر میں ہے۔ اس میں چند اللہ والوں کا تذکرہ ہے جن کی صحبت اکیسراثر نے مرزا کو کیا بنا دیا۔ وہ انہی کی مدح میں رطب اللسان ہے۔ اور ان شعراء کی دیویوزہ گری کی مذمت کرتا ہے کہ فطرت نے ان کو ذہن روشن عطا کیا، لیکن امراء و وزراء کی مدح سرائی میں صرف کیا۔

ای بسا معنی روشن کہ ز حرص شعرا
وی بسا نسخہ کہ در مکتب تشویش طبع
خاک جولا نگاہ اسپ و خراب جاہ است
روسیاہ ابدان مدح و وزیر شاہ است
صلہ مشتاق گدا طبع ز مضمون بلند
گر ہمہ پائے برا فلاح نہد در جاہ است
مرج معنی ایں سست خیالان در باب
تا بدانی چہ قدر فطرت شاہ کوہ است

مادح اہل صفا باش کہ در علم یقین

وصف ایں طایفہ تفسیر کلام اللہ است

وہ ان گدا طبع دیویوزہ گر شعرا کو شیطان پرست اور ان کی شاعری کو محض شیطنیت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے مدح شاہ و وزیر و امرا کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے :-

ایک تعریف سلاطین کردہ
مشق تعلیم شیا طین کردہ
تو بادشاہوں کی مدح گوئی کرتا ہے تو
سمجھ لے کہ شیطان تیرا معلم ہے جو کچھ
تجھے سکھاتا ہے وہی کچھ تو کہتا ہے،
یہ شیطانی علم کیا ہے؟ حب جاہ ہے
تیرا استاد اور پیشوا شیطان ہے،
انہم تخت و کلاہی بیش نیست
ابدی روسیاء ہی کے سوا تجھے اور کیا

لیگا تو اتنی بات پر غر کرتا ہے کہ بادشاہ کا
درباری شاعر ہوں یہ تو سمجھ کہ بادشاہ
خود کیا بلا ہے۔ ایک تخت و تاج ہی تو
ہے، اور دونوں پتھر۔ ایک سر پر پڑا
دوسرا پاؤں کے نیچے تخت بن گیا چاندی
کا تخت اور سونے کا تاج جادات ہی تو
ہیں۔ ان دو پتھروں کی رگڑ سے آگ
پیدا ہوتی ہے، اس کا نام ہے بادشاہ
لیکن ہر ایک اگنی کا پوجاری اس حقیقت
سے آگاہ نہیں، یہ آگ تیرے دین پر
بجلی بن کر گرتی ہے اور تیرے خرمین ایمان
کو جلا کر راکھ کرتی ہے، اگر تو بادشاہ کا
مقرب ہے تو بلاشبہ تو آتش پرست کافر
ہے، تیرا دین ایمان گیا، آتش پرست کبھی
حق پرست نہیں ہو سکتا۔

امتیاز تابانی شاہ کیست
این نفس پروردہ و ہم جاہ کیست
بر سرش افادہ آن زتین رخام
آمدہ پایش بسنگے تخت نام
تخت سیم و افسر زریں دوسنگ
او چو آتش در میلاں این دوسنگ
فی الحقیقت آتش است این شاہ نیست
ایک ہر آتش پرست آگاہ نیست
قرب این آتش بلائی جان نیست
برق دین و خد من ایمان نیست
گر بہ بزم شاہ قرب اندیشہ
بیگماں زردشت کافر پیشہ
رفقہ گیر آئینہ زینت زدمت
نیست ہرگز حق پرست آتش پرست

♦ ♦ ♦

کافر دین اور ایمان تو سنئے آئے تھے لیکن بیدل نے فوقے کفر و شعری
ان شعرا کے حق میں بھی صادر کیا جو سلاطین اور وزراء کی شان میں مدحیہ
قصائد لکھتے رہے۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ شعرا حرص کی وجہ سے اپنے معنی
روشن کو اُمرا کے گھوڑوں کے پاؤں کی خاک میں ملاتے ہیں۔ اکثر شعراء نے
بادشاہوں کے گھوڑوں کی تعریف میں قصائد لکھے۔ انسان اشرف المخلوقات اگر
اسب و خمر کی مدح کرے تو ان سے بھی گیا گزرا۔ اور وہ بھی خود داغ ہی تھے جو
اپنے گھوڑے کی تعریف میں کرا نام و اکرام سے شعرا کو مالا مال کر دیتے تھے
ضمن میں لکھتا ہے کہ حمد و ثنا تو خاص حق تعالیٰ کے لیے ہے۔ مگر ذات باری

کا کمال ہماری حمد و ثناء سے بے نیاز ہے۔ البتہ ”اگر باخمن مدح خاصا نش بار توفیق توانی یافت، حصول دولت غلّی پندار، و اگر بخل وصف مقربا نش را ہی توانی شگاہ، وصول مقصد رقصی شمار“ اگر خاصاں و مقرباں بارگاہ الہی کی مدح کی توفیق حاصل ہو تو یہ سمجھ کہ تجھے سعادت دایم ملی۔ اور وہ اعلیٰ مقصد تجھے حاصل ہو گیا جو دنیا داروں کو نصیب نہیں۔

بیتل ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ مناسب برائے دیگران ہوتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی امیر و وزیر کی مدح میں کچھ نہیں لکھا۔ اوائل عمر میں شہزادہ محمد اعظم پسر عالمگیر کی ملازمت اختیار کی۔ شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر ہوتا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے بیتل کی تعریف میں کہہ دیا کہ بلند فکر کا مالک ہے۔ شہزادہ نے کہا کہ اسے کہو کہ میری مدح میں قصیدہ کہے تاکہ اس کی شاعری کی حد بھی معلوم ہو جائے۔ بیتل نے سنا تو بخشی سرکار کو استعفا حوالہ کیا۔ بیتل کی تصانیف میں ”رقعات“ بھی ہیں۔ یہ سب اس کے عقیدت مند دوست تھے۔ جن سے خط و کتابت تھی۔ ان کی تعریف میں نثر و نظم میں چند فقرات لکھ دیتا ہے۔ ان میں سے شکر اللہ خان اور شا کر خان دو بھائی شاہ عالمگیر کی فوج میں افسر تھے۔ شکر اللہ خان ولایات دہلی وغیرہ کا صوبہ دار بھی رہا۔ عموماً اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کرتا۔ اس خاندان سے بیتل کے تعلقات مدت العمر رہے۔ مغلیہ دور دورہ میں عموماً وزراء و امرا سخن گو تھے۔ اور اہل سخن کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ شکر اللہ کے منصب میں جب کبھی اضافہ ہوتا، بیتل رقعہ میں مبارک باؤ کے ساتھ قطعہ تاریخ بھی لکھ دیتا۔ چنانچہ ایک رقعہ میں کہتا ہے کہ

شکر خدا کہ صاحب ماراز فضل حق جمعیت اصناف اقبال سرمدیست
تا شکر ایں عطیہ بروں آید از حساب تاریخ او مراتب تائید ایزدیست
میواتی سخت شورہ پشت قوم تھی۔ گاہے گاہے شہر سی فوج ان کی سرکوبی کرتی رہتی۔ مگر یہ پہاڑوں میں بیٹھ کر حکومت کو اکثر پریشان کرتے۔ ان کا

سردار ”بجے رام“ تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ ایک دفعہ تو وہ ہڑپونگ بچائی کہ رعایا ان کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آگئی۔ بادشاہ نے شکر اللہ خاں کو مامور کیا۔ اس نے تھوڑے عرصہ میں امن قائم کر دیا۔ میوات کی صوبہ داری اسی صلہ میں عالمگیر نے شکر اللہ خاں کو تفویض کی۔ اس فتح کی مبارک باد اور تاریخ فتح بھی بیدل نے ایک رقعہ میں لکھ کر ارسال کی ہے

سرخیل نروکہ یا بجے رام	از باد و برودت پشیم درد دست
باہفت پسر کہ ہر کد امش	چوں کوہ سرے بہ تیغ می بست
عمرے و رکو ہزار میوات	می بود چو خرس از خودی مست
باشکر خان آسماں جاہ	گردید طرف ز فطرت پست
یعنی بہ پناہ قلعہ کوہ	بر جنگ مبارزاں کمر بست
آتش زندہ بہادران خورد	چند آنکہ ز سنگ چوں شر جست
بگریخت بصد ہزار تشولیش	تا از دم تیغ بی اماں رست
در تاریخش مہندس فکر	فرمود دل نرو کہ بشکست

۱۱۰۷ھ

۱۱۰۶ھ میں بھی کسی ہم پر شکر اللہ خاں کا میاب رہا۔ بارہ فقروں کا ایک رقعہ لکھا۔ ہر ایک فقرہ تاریخ فتوحات ہے۔ ۱۱۱۴ھ میں جب شکر اللہ خاں کو منصب صوبہ داری میوات تفویض ہوا تو نو فقروں کا ایک رقعہ لکھا۔ ہر ایک فقرہ تاریخ مبارک باد ہے۔ آخری فقرہ ”خان صاحب مبارک باد ہے۔“

شاہ عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور دوسرے سال گول کنڈہ فتح کیا، بیدل نے ایک رقعہ میں نواب شکر اللہ خاں کو قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا۔ اور یہ فقرہ بھی لکھ کر دیا کہ ”اللہ الحمد اندیشہ و ماگو بہانہ جوئی تقریبی است کہ باں وسیلہ تحفہ فقرا پیش گزار دیا مصرعی در آنجناب معروض دارد و گر نہ چہ نواب و کد ام مستطاب بلکہ چہ عالمگیر و کد ام بدر منیر بطریق شوق بے پروا کاغذی دارد، و آہنگ ساز

بے نیازی سراز پر دہ بری آرد، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کو شاہ عالمگیر سے کچھ عقیدت ضرور تھی۔ اس لئے شوقیہ قطعہ تاریخ کہہ دیا اور ساتھ ہی اپنے استغنا کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ قطعہ کسی صلہ کی اُمید پر نہیں لکھا گیا۔ قطعہ حسب ذیل ہے:-

شاہ عالمگیر یعنی حضرت اورنگ زیب
عزمش از اقلیم دہلی کرد آہنگ خروج
اُولیں سالے کہ فتح ملک بجا پور بود
ساخت بر کلکندہ ریات ظفر سال دوم
گشت از روئی جمل در دیدہ اہل حساب
سال فتح اُولیں "جمشید نصرت" جلوہ گر

۱۰۹۷ھ

خوایسم روشن شود آئینہ فتح دوم
ہست یک معنی کہ تعبیر از دو تاریخش کند
دار شوخیہائی اور اکم دریں مصرع خبر
اعظم مطلوب "فتح بادشاہ نامور"

۱۰۹۸ھ

۱۰۹۸ھ

چھ سال چھ ماہ کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ دو یتیم والدہ کی آغوش تربیت میں تعلیم پاتا رہا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا۔ اس کے بعد صرف نحو عربی پڑھی۔ چچا مرزا قلندر کیفیل رہا۔ بیدل طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ جب "احاد" یعنی نو سال سے گزرا تو "عشر" یعنی دہائی میں داخل ہوا۔ ایک ہم درس ہمیشہ منہ میں قرنفل (لونگ) رکھتا، جب بولتا تو اس کے منہ کی خوشبو سے مخاطب کا دماغ محط ہوجاتا۔ میں نے ایک رباعی کہی ہے

یادم ہر گاہ در سخن می آید بوئے عجیبش از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا مگہبتِ گل یا رانیہ مشکِ ختن می آید

یہ رباعی مشہور ہوئی تو بعض توحیران ہوئے کہ اس نوعمری میں یہ کلام اور اکثر نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک طفل مکتب ایسی برجستہ رباعی کہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ جو کچھ کہوں گا کسی کو نہ سناؤں گا۔ مشق تو

جاری رہی مگر کسی کو علم نہ تھا۔

بیتل کے خاندانی شیخ طریقت مولانا شیخ کمال قادری قصبہ رانی ساگر میں جو ملک ”بہار“ میں واقع ہے اقامت پذیر تھے۔ بنارس سے ایک فرسخ کا فاصلہ ہے۔ بیتل کا چچا مرزا قلندر بھی حلقہ ارادت میں داخل تھا۔ بیتل کو بھی اپنے ساتھ زیارت شیخ کیلئے لایا۔ بیتل چار عنصر میں مولانا کے زہد و تقویٰ اور تشرع کی بہت تعریف کرتا ہے۔ کہ آپ کا شہرہ باہر اور گرد و نواح میں اس حد تک تھا کہ لوگ بصد عقیدت و ارادت حاضر ہوتے۔ اور آپ کا یہ اثر تھا کہ جو بھی ایک دفعہ آپ کے پاس آنا کم از کم منہیات شرعیہ سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو جاتا۔ اور بعض ایسے بد قسمت انہی بھی تھے کہ آپ کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔ کہ مبادا آپ کی صحبت کے اثر سے اور جذبہ توجہ سے فسق و فجور سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مولانا لوگوں کو وظائف بتاتے۔ اور جو کچھ مرزا قلندر کو تلقین فرماتے بیتل خاموشی سے اخذ کرتا رہتا۔ اور تنہائی میں لکھ لیا کرتا۔ مولانا کے پاس اکثر بیمار بھی آتے، اور آپ جو کچھ پڑھ کر دم کرتے بیتل یاد رکھتا۔ بعض اوقات تعویذ بھی لکھ کر دیتے۔ بیتل کہتا ہے کہ میں بھی بیماروں پر اس کا تجربہ کرتا رہا۔ ”اگرچہ اس قسم کی حرکات کی وضع کھیل تماشہ ہی تھا مگر رحمت ایزدی بہانہ جو ہے بیمار صحت یاب ہو جاتے“ مرزا قلندر کو بھی اس کا علم تھا۔ مولانا کی خدمت میں حالات بیان کرتے تو آپ خوش ہوتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا کہ اس گھر کے صاحب خانہ کی زوجہ آسیب جن میں مبتلا ہے۔ گذشتہ دو شبانہ روز سے غلبہ اس حد تک ہے کہ بے ہوش پڑ چکی اور شاید کوئی دم کی ہمان ہے۔ کئی عوام خواں آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میرے دل میں شوق بے پرواہ نے چٹکی لی۔ ایک محرم خانہ کو بلوایا اور اس کی اچھلی پر اسم اعظم دم کیا۔ اور حسب تلقین مولانا شیخ کمال ہدایت کی کہ مرینہ کے کان میں اچھلی ڈال دو۔ اُس نے تعمیل کی۔ مجر و عمل گویا نیزہ دیو پر جیم کے سینہ میں لگا۔ دود سپند کی طرح چلا یا۔ اور فوراً مرینہ سے جدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ

شہرت نہ ہوتی۔ مولانا نے بھی سنا۔ مجھے بلوایا اور کمال التفات سے پوچھا کہ تو نے کونسا عمل کیا ہے۔ یہ بات محض حرف و صوت و ذائقہ اور توہیدوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے عرض کی کہ حضور ہی کی عنایت ہے اور آپ ہی کا فیض ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ ایک کتاب جس میں اعمال غریبہ وغیرہ مذکور تھے مجھے عنایت کی۔ اور فرمایا کہ میں نے اس عرصہ تک فوائد علمی جو کچھ جمع کئے اس میں درج ہیں۔" باخبر باش کہ تیرا طالع سلیمانی نظر ہے اور تیرا دم عیسوی اثر ہے۔ ان اشغال میں سے جو اس میں مندرج ہیں تو جس میں مشغول ہو گا مبارک ہو۔"

بیتدل لکھتا ہے کہ اس دن کے بعد میں نے جو بھی عمل کیا اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ حالانکہ لوگ ایک عمر کوشش کرتے ہیں پھر بھی کُل مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے فطری قابلیت اور اس کے بعد مناسب اسباب جمع ہوں تو نتیجہ خاطر خواہ ہوتا ہے۔

فانوس شمعہا اثر قابلیت است۔ بیرنگ پہنچ جلوہ مصور نمی شود
 شمع میں قابلیت موجود ہے۔ اور اسی قابلیت کا اثر ہے کہ جلانے سے جلتی ہے
 ورنہ جس جلوہ میں کوئی رنگ نہ ہو اس کی تو کوئی صورت ہی محسوس نہ ہوگی۔

از شعلہ کسب نور چراغ فسرده را
 بے روغن و فقیلہ میسر نمی شود

چراغ بجھا ہوا ہو، ہزار شعلہ دکھاؤ کبھی روشن نہ ہوگا جب تک اس میں تیل
 اور ہتی نہ ہو۔ جب یہ مناسب اسباب جمع ہونگے تو چراغ فسرده شعلہ سے کسب نور
 بھی کرے گا۔

ساحل کہ اصل طینش از جوش تشنگی است
 دریا ست در کنار دلبش تر نمی شود

ساحل کی طینت میں وہ فطری قابلیت نہیں کہ اس کی خشکی دور ہو۔ اگرچہ
 دریا اس کی کنار میں ہے مگر اس کے لب تر نہیں ہوتے۔

بیدل

آئینہ آب دارد و نم آسکار نیست
 در سنگ آتش ست و منور نمی شود
 آئینہ میں آب تو ہے مگر بے نم ہے۔ اسی طرح پتھر میں آگ موجود ہے وہ
 خود روشن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ تاریک ہی رہے گا۔

صدیق و ارفیض ازل را نتیجہ ہاست
 بوجہل را ز دار پیمبر نمی شود
 ہر ایک شخص کی فطرت میں خاص خاص قابلیت فیض ازل ہے۔ حضرت
 صدیق اکبرؓ نے اس حضرتؑ کے دعوائے رسالت کی فوراً تصدیق کی۔ لیکن عمر بن
 ہشام جو ابو جہل کے نام سے مشہور ہوا، آخر دم تک منکر ہی رہا۔ اس میں نہ قبولیت
 کی صلاحیت تھی اور نہ اس نے قبول کیا۔ خواجہ حافظ کہتا ہے کہ
 حسن زبیرہ بلال از جلیش صہیب از شام
 ز خاک مکہ ابو جہل این چہرہ بواجہبست

خواجہ حسن بصریؒ تابعین میں سے ہیں اور حضرت بلالؓ بن مؤذن جلیشی اور حضرت
 صہیبؓ دونوں اصحاب رسول کریمؐ ہیں، تینوں سے اس حضرت کا کوئی تعلق
 قرابت نہ تھا۔ ابو جہل قریشی اور اس سے قرابت بھی تھی اور مکتی بھی تھا۔ اول الذکر
 تین تو آسمان اسلام کے درخشندہ ستارے ہیں، اور ابو جہل محروم ہی رہا۔
 بیدل جو واقعہ بیان کرتا ہے اس سے ایک نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، اور اس پر
 حکیمانہ بحث بھی کرتا ہے، ہمارے زمانہ میں وظائف اور اوراد اور تعویذ اور اس
 قبیل کے عملیات پر تعلیم یافتہ طبقہ کا ایمان نہیں۔ عموماً جہلا ہی ان کی تاثیر پر
 یقین کرتے ہیں۔ بیدل نے اشعار مذکورہ میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ”سخن“ کا اثر
 ضرور ہوتا ہے مگر ”سخن گو“ کی فطری قابلیت اس میں کار فرما ہوتی ہے۔ یہ موضوع
 نفسیات کا ہے۔ انسان کو حیوان ناطق اسی لئے کہتے ہیں کہ دیگر طہقات پر اس کو
 ”سخن“ کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ لیکن انسانوں میں بھی تاثیر سخن کے مختلف

مدارج ہیں خواجہ حافظ بھی فرما گئے ہیں :-

چہ رشک می بری بے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

ایک موزونی نفس و گراست	آں نفس نیست مطلع سحر است
بحر صد رنگ موج و قطرہ شکست	آنچہ موزوں فاد گو ہر است
ہر کہ موزوں نباشد انسان نیست	فہم نیز نگ معنی آسان نیست
طبع موزوں نہ کبھی و عملی است	از عطیات فیض لم یزلی است
آدمی فطر تست و قطرہ نام	نیست روشن مگر ز لطف کلام
حسن اس شاہد سراپا ناز	جلوہ گر نیست جز بخلوت راز
بے تکلف حنا چنگ نہ بست	تا دلے خوں نکر در نگ نہ بست

باتیں تو سب بناتے ہیں لیکن لطف کلام موزونی طبع میں ہے۔ اور یہ موزونیت کبھی نہیں بلکہ فطری ہے، عطیہ فیض رحمانی ہے۔ قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است، بعض اشخاص کی تقریر میں وہ اثر ہوتا ہے کہ ہزاروں آدمی ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اور چند تقریروں سے انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات ہر ایک شخص کو نصیب نہیں۔

خامش نفسی کہ طبع موزوں دارد صد غنچہ بہار از دل پر خوں دارد
تغیر پر ز اد سخن آسان نیست این جان نفس سوختہ افشوں دارد
بیدل نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا تعلق علم نفسیات و ارتقاء وغیرہم سے ہے۔ یہ بحث دقیق ہے اور بیدل نے جن غفلوں میں بحث کی ہے وہ اذوق ہے۔ ہم کو شش کرتے ہیں کہ بیدل کے نظریہ حکمت کو عام فہم عبارت میں واضح کریں۔

بیدل لکھتا ہے کہ کل کائنات ”کلمات“ ہیں۔ قل لو کان البحر ملاً

الکلمت ربی لایۃ“ (دکھف ع ۱۲)

بہر رنگ آیات حرف است و بس نفس در عبارات حرف است و بس
 حقیقت کہ آن سوئے ماد من ست چو بے پردہ شد حرف پیراہن ست
 چہ مقدار بے تاب اظہار شد کہ آخر در انا نمودار شد
 تمام کائنات ایک کتاب ہے۔ اور کائنات حروف ہیں یا کلمات ہیں،
 ”ہر نقشے کہ می بینی حرفیست کہ می شنوی“ اشیاء کائنات یا ان کے تصورات جو
 ہمارے قلب میں ہیں جن کو خیالات سے موسوم کرتے ہیں، فی الحقیقت حروف
 ہیں جن کے ذریعہ اشیاء کائنات ہم سے ہم کلام ہو کر اپنا مافی الضمیر واضح کرتی
 ہیں۔ کتاب کائنات مصوّر ہے اور یہ تصویری حروف یعنی اشیاء کی صورتیں ہم
 دیکھتے اور سنتے ہیں، اس حقیقت پر توکل حکماء کا اتفاق ہے کہ کوئی خیال
 بلا حروف قلب انسانی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت ”کلمہ مجرد“ ہے،
 اور حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے۔ جب تک کہ وہ کسی صورت میں نہیں
 محسوس نہ ہو، اور یہ صورتیں حروف ہیں، اس لئے بیتل کہتا ہے کہ جو حقیقی مادہ
 سمع و لفظ ہے۔ ”تحقیق جو ہر لفظ بی آئینہ سمع صورت وقوع نہ بندد، و لفظین کیفیت
 سمع بے ظہور لفظ بہ تحقیق نہ پیوندد“ یعنی لفظ اور سمع لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی
 تصدیق دوسرے کے تصور کے بغیر ممکن نہیں۔

گو حرف یقین و گرماں می شنوی از عالم بے لفظ و بیار می شنوی
 خاموش شود و بے لفظ و شنود چیزی می گوئی و ہماں می شنوی
 حقیقت مجردہ کلمہ بے حرف و صوت ہے، ماکان بشوان یکلمہ اللہ الا
 وحیا آدم و ادم و حجاب (۲۵)

کلام الہی حقیقت مجردہ ہے اور کسی انسان میں یہ تاب و طاقت نہیں کہ اس
 حقیقت پر مطلع ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا وحیا یا ”من و ادم و حجاب“ ”وحی“
 کلام ہے حروف کی صورت میں قلب انسانی سنتا ہے۔ ”بیتل“ کلمات ”میں نکلتا ہے
 کہ اگر بر نبوت ایمان داری با خطرات ولی جو بہ تعظیم پیش میا، و اگر بر تجلی یقین داری

بیچ جانب چشم بے ادب کشا، ”خطرِ دل“ تحریکاتِ فطری ہیں۔ اسی کو وحی اور الہام اور اھاسے موسوم کرتے ہیں۔ عام فہم غفلتوں میں خیالات ہیں۔ لیکن یہ کہاں سے آتے ہیں؟ کتابِ کائنات سے، ”اتل ما ادھی الیک من الکتاب“ (۱) اور ”لداینا کتب ینطق بالحق“ (۲) وحیِ بلنطہ ہوتی ہے اور اس کے فہم میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ حیواناتِ وحی کے تحت عمل کرتے ہیں اور کبھی غلطی نہیں کرتے، ”من وراہ حجاب“ تصورات میں جو بیداری اور خواب میں رونما ہوتے ہیں، غلطی ان میں بھی نہیں، لیکن ان کی تعبیر کرنے ہوئے انسان غلطی بھی کرتا ہے۔ ان کا فہم تذکرہ و تدبیر و تفکر سے غفلتاً حاصل ہوتا ہے، یعنی اس نسبت کا دریافت کرنا جو صورتوں کو اپنے حقائق سے ہے لیکن

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام

کاندراں بے حرف مے روید کلام

(شٹنوی معنوی)

رباعی مذکورہ کا یہ مفہوم ہے کہ جو بھی دل میں خیال پیدا ہوتا ہے خواہ یہ یقینی ہو یا ظنی انسان کا پیدا کردہ نہیں وہ الہام کہہ لے حرف و صوت سے نازل ہوتا ہے۔ ذرا خاموشی اختیار کرو تو معلوم ہو گا کہ تم خود ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہو اور آپ ہی سنتے ہو۔ اس لئے ”پسج“ صورتے در ذہن نقش نتواں بست کہ بخارج جلوہ نماید، و پسج کیفیت در خیال خارج جلوہ نتواں داد کہ بظاہر جام عبارتے نہ پماید“

”ہاں رمز کہ سمع و لطف دریافتہ است نتواں گفتن باصرہ نشکافہ است“
 ”شمع کہ مقیم خلوت فانوس است چوں دانگری جملہ بروں تافہ است“
 دل میں کوئی تصویر پیدا نہیں ہو سکتا جس کا مشاہدہ مجزواً یا کلاً خارج میں نہ کیا ہو۔ اور دل میں کوئی کیفیت یا مافی الضمیر کا اظہار نہیں ہو سکتا جب تک عبارت تحریر یا تحریر میں نہ ہو۔ اس لئے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں سنتے ہیں وہ ایک ہی حقیقت

بیست

ہے شمع گو فانوس میں مقیم ہے مگر اس کی روشنی فانوس اور شمع دونوں سے باہر جلوہ نما ہے۔ اقبال کے ماں بھی اس کے مماثل یہ معنوں میں ہے۔ کسوت مینا میں ہے، مستور بھی عریاں بھی ہے۔ "ایں جا مستحق گردیدہ سخن روح کائنات است و اصل حقیقت موجودات ہر گاہ باخفائی معنی کو شد جہانے را نفس وز دیدن است، و چوں افشائے عبارت جو شد عالمے را بر خود بالیدن" اس سے ثابت ہوا کہ سخن روح کائنات اور اصل حقیقت موجودات ہے۔ جب اپنے معنی کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ کائنات دم بخود ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ اور جب عبارت میں ظاہر ہوتی ہے تو ایک عالم کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔

باخفا حقیقت با فشا مجاز	بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز
سہ حرف از کتاب کماش "ابد"	"ازل" را ہماں از سرخوش سند
تامل بدن، نفس در نبات	بجواں صدا و در انساں لغات
چہ دنیا؟ رہ لفظ سرگرداںش	چہ عقبی؟ بمعنی نظر کردنش
زاسما اگر جملہ اسرار اوست	چو در جلوہ آید سخن نام اوست
نہ اعجاز ایں عیسیٰ افسوں مہر	جہاں زندہ اوست افروز مہر
نہ ہستی ظہور انتظام است ازو	عدم نیز ممتاز نام است ازو
کدام است جان آشنائی سخن	چہ مردن؟ تہی گشتہ جائی سخن
امم را رسول از سخن شد دلیل	نیاورد غیر از سخن جب شریل
بفہمی اگر رمز روح و مسلم	بغیر از سخن چہیست آسما رقم
بسرشتہ و ہم دیگر پیچ	کہ غیر از سخن در جہاں میت پیچ

یہ کائنات عالم غیب و شہادت ہے۔ عالم غیب میں یہی سخن حقیقت ہے۔ اور شہادت میں مجاز سے موسوم ہے، غیب تنزیہ ہے اور یہ سخن تنزیہ میں "راز" ہے اور شہادت تشبیہ ہے اور ہم عالم اسی کو کہتے ہیں، کائنات کے دو کنارے "ازل" اور "ابد" ہیں۔ یہ فی الحقیقت اسی سخن کا کمال ہے۔ یہی حقیقت جمادات

میں خاموش ہے، اور نباتات میں نفس، اور حیوانات میں آواز، اور انسان میں لغات کی صورت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ دُنیا کیا ہے؟ اسی سخن کے الفاظ کی صورت عقبیٰ کیا ہے؟ اسی کے معنی کا مشاہدہ اُسی سے جہان زندہ ہے یہی روح کائنات ہے ہستی کا نظم و نظام اسی سے قائم ہے، بلکہ عدم بھی اسی کی وجہ سے نام سے متنازع ہوا، جان کیا ہے؟ جو سخن سے آشنا ہو۔ موت کیا ہے؟ سخن کی جگہ خالی ہونا، زندے ہی باتیں کرتے ہیں مُردے خاموش ہیں۔ یہ سخن (دُجی) ہی ہے جس سے رسول اُمت کی رہنمائی کرتے رہے اور جبرئیل نے سخن کے سوا کچھ اور نازل نہیں کیا۔ اگر لوح و قلم کی رمز سمجھ لے تو معلوم ہوگا کہ لوح پر سخن ہی رقم ہے اور قلم سخن ہی لکھتا ہے، زیادہ وہم میں نہ الجھنا سمجھ لے کہ جہاں میں سخن کے سوا اور کچھ نہیں۔ مختصر یہ کہ محسوسات عالم صورت حروف کی مثل ہیں عقبیٰ عالم حقیقت معنی کی مانند ہے۔

بیدل نے طویل بحث اس موضوع پر کی ہے اور اسی سے استدلال ”وحدت وجود“ پر بھی کرتا ہے اس پر بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ میر دست تحقیق بیدل یہ ہے کہ حقیقت سخن، ارادہ محض“ اور ”امر الہی“ ہے۔

کہ ایں صدا نغمہ ساز کن ہماں دستگاہِ ظہور سخن
”بدیع السموات والارض آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا جب
واذا قضیٰ امرًا فاما یقول لہ کن کوئی امر مقرر فرماتا ہے تو اتنے کہنے پر کہ ہو جا
وہ ہو جاتا ہے۔“

فیكون“ (۱)
”انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یہ تو صرف اس کا امر ہے جب کسی شے کا
ارادہ فرماتا ہے تو اتنے ہی کہنے پر کہ ہو جا وہ
امر ظہور میں آتا ہے پس وہ ذات پاک ہے
جس کے دست قدرت میں ہر ایک شے کی
بادشاہی ہے اور تمام امور کا رجوع بھی

بیدل

خاصان بارگاہ الہی اسی امر اسی ارادہ الہی کے تحت ہوتے ہیں۔ انہیں معیت حق حاصل ہوتی ہے۔ ”گفتہ“ اور ”گفتہ“ اللہ بود، گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود۔“ مقرران بارگاہ الہی کا کیا مذکور ہے، عوام الناس بھی جب کسی امر کا ارادہ کرتے ہیں تو مناسب اسباب کے ساتھ ظہور میں آجاتا ہے۔

قصبہ رانی ساگر سے ایک کوس کے فاصلہ پر سرائے بنارس میں ایک مجذوب ”شاہ ملوک“ نامی کی رہائش تھی، ”مدتے چوں سایہ بہ پائی درخت درکشیدہ بود“ ایک عرصہ سے ایک درخت کے نیچے سایہ کی طرح مقام تھا۔ برہنہ سایہ کی طرح گرم و سرد سے بے خبر تھا۔ دور و نزدیک سے ارادت مند آتے۔ بیدل بھی گاہے گاہے اور اسٹھکتا۔ شاہ صاحب عموماً بڑے ہانکتے رہتے۔ مگر اس ضمن میں باتیں پتہ کی کہتے۔ ایک روز حضرت شیخ کمال مریداں باصفا کو منازل سلوک تلقین فرما رہے تھے، فرمایا کہ ایسے لوگوں کی مجلس سے احتراز کرنا چاہئے جو ”جنون کسوت“ اور ”وحشی مزاج“ ہیں اور لوگ ان کو مجذوب خدا رسیدہ سمجھتے ہیں، ”اگر در بزم صحبت برہنگی از شرائط معقول ہست خرس و پوز نہ افضل ادب کسوتان خواہد بود، و اگر ہنگام تکلم کف بدہان آوردن از قواعد فصاحت باشد شتر را افصح معنی بیاناں تصور باید نمود۔“ یعنی اگر کسی ننگے کی صحبت میں بیٹھنا کوئی معقول بات ہوتی تو یہ کچھ اور بندہ سے بڑھ کر آداب سے واقف اور کون ہوتا اور بڑے ہانکتے وقت منہ سے کف جاری ہونا قواعد فصاحت میں داخل ہوتا تو اونٹ سے بڑھ کر فصیح کلام کس کا ہوتا۔ انسان صاحب ”احسن تقویم“ ہے۔ اس کو اس رسوائی میں مشاہدہ کرنا بصرو بصیرت کی توہین ہے۔

انبیاء صاحب دعوت بودند	مورت و معنی لغت بودند
عمر با اثر سعی وفاق	عرضہ دادند طریق اخلاق
تا تو زان شوہ مکرم گشتی	غویت محو شد آدم گشتی
اگر ایں وضع بقانون می بود	ہمہ کس اُمت بخون می بود

انبیاء لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور انہی کے اُسوۂ حسنہ اور تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ انسان جو پہلے غول بیابانی کی طرح رہتا تھا آدم بنا۔ اگر یہ وضع جوان برہنہ مادر زاد لوگوں نے اختیار کر رکھی ہے انسانیت ہوتی تو پھر تمام لوگ اُمتِ مجنوں ہی کیوں نہ ہوتے۔

ادھر تو مولانا شیخ کمال یہ پند و نصائح ارشاد فرماتے، اُدھر شاہ ملوک اپنی بڑ ہانکتے کہ :-

آفتاب کو برہنہ تصور کرنا اور آنکھیں چندھیائیں اور چشم انصاف پر پردہ ڈالیں تو اثر خفاشی ہے نہ بینائی ”پس مرگاں نمی توان بست تا غفلت درمی بخشاید“ چشم نہ توں پوشید تا خواب غلبہ نماید ”یہاں برہنہ کون ہے کہ جسے تکلف سے چھپایا جائے اور مستور کون ہے کہ اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ تقوٰیٰ یہ ہے کہ ماسوئے کے وسوسوں کی طرف توجہ نہ ہو نہ کہ اشیاء کے حسن و قبح کی تفتیش کی جائے۔

مخور از پاکی داماں زاہد قریب نور بے ایمان زاہد
صفا در جُبہ و عمامہ اش صرف طلسم قیر زو اندودہ برف
چو آتش ظاہر و باطن تباہی بسر و کستر و در دل سیاہی
لیکن اکثر دیکھا گیا کہ کبھی مولانا کمال کا گذر اس طرف ہوتا حضرت مجذوب ”بے اختیار خود را برقع چھپیدے و بعد دل تنگی غنچہ مقیم پردہ کسوت گردیدے۔“ مجذوب اپنی برہنگی چھپاتا اور شاہ صاحب بھی بلا توقف گزر جاتے۔

مولانا یہ بھی فرمایا کرتے کہ اکثر لوگ صاحب عقل و ہوش ہیں اور تمیز خیر و شر بھی کرتے ہیں، مگر بظاہر دیوانہ بن جاتے ہیں تاکہ تکالیف شرعیہ سے معذور سمجھے جائیں اور بآباد وجود قوتِ عمل بیکارمی اور کاہلی و سیلہ تن آسانی اختیار کرتے ہیں۔ اور بعض ”جنون سیرت“ ارباب سلوک کی نسبت طنزاً عبارت عقلی کے ساتھ فقرے چست کرتے ہیں جب علم معقولات سے ان کو اتنا بہرہ ہے تو حفظ مراتب میں مجہول کیوں

بننے ہیں۔

بمعی از پیش خویش آگاہ اند برفلک رفتہ اند و در چاہ اند
بمخوفزین کج خرامی جہل ہمخان غرمت شاہ اند
بسہانا رساندہ طرف فروغ طشت خورشید ساغر ماہ اند
بحر پیمائی رشعہ شبینم کوہ پرواز و پرہ کاہ اند

تا نگر دند خاک جادہ شرع

گر ہمہ منزل اند گمراہ اند

بعض لوگ غلط فہمی سے فریب نفس میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے تکلفات اور تصنع سے آزاد ہیں۔ بیتدل نے پتہ کی بات کہی کہ تمام کائنات میں تکلف و تصنع محسوس و مشہور ہو رہا ہے۔ دور عالم فہور انسانی کہ انجام مراتب حقیقت است۔ بے تکلف بودن غفلت تحصیل کمال است، و بے تصنع زیستن باعث تشویر و انفعال۔“

در صومعہ باید تواضع بودن در مصطبہ سرخوش تجرع بودن

یعنی نقص حقیقت یکرنگی است در عالم صنع بے تصنع بودن

ارباب تحقیق دریا کے دل میں رہتے ہوئے تو ہم ساحل میں مقیم ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ ”خاک بر سر دانش گردن است“ اور اہل یقین تماشہ گاہ میں خیال شب میں آنکھیں موندھ لیں تو بصرو بصیرت کی مٹی خراب کرتا ہے۔

ایک دن قلندر روں کی ایک جماعت شاہ صاحب کے پاس آئیں۔ اور اس ”شیر بیشہ جلال“ سے بے ادبی کے ساتھ پیش آئے۔ یہاں تک کہ زبان سے ہاتھوں پر اُتر آئے۔ ناگاہ برق غیرت شاہ صاحب کی زبان پر شعلہ بار ہوئی اور رعد کی طرح گرج کر کہا کہ ”کتواس خرقہ میں کچھ نہیں اپنا پوست پھاڑو۔ یہ سننا تھا کہ سب ایک دوسرے پر چوب و خشت سے حملہ آور ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ”خرقہائی ہستی دہیدند وہاں غبار رفتہ خاک گور بر سر ہم پاشیدند“

الحمد را ی غافل از چشم بخود پیچیدگان ای باکشی که در طوقاں ایں گردایفت
ہر کجایینی مراقب لہنتی تسلیم نشو ہم بیایہ سجدہ باید برد و نحراب رفت
یکمائی دانشی گر کردہ کسب ادب مست جو اکیر چوں بیتابی از ستارفت
جان از راز ادب الفت بہت پیکر است اہر وئے زندگی ہم رفت چوں دلایفت

بیدل یہ جاننے کے لئے مضطرب تھا کہ آں نمکدہ عالم اسرار از چہ کیفیت
مترنم فلغکہ جوش است کیا بات ہے کہ شاہ صاحب اس حالت میں ہیں اور وہ کیا
شے محرک سلسلہ خروش ہے، اس لئے بوقت فرمت شاہ صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب بھی مہربانی فرمانے لگے۔ ایک روز فرمایا کہ جو میں کہوں
لکھتے جاؤ۔ بیدل تین شبانہ روز لکھتا رہا۔ قریب چالیس بیت لکھے۔ شاہ صاحب
ایک شعر پڑھتے اور اس کی تشریح کرتے۔ اور اس تشریح میں وہ معارف اور
محکات بیان کرتے کہ ”مدرکہ در فہم مراتب آں سر اسیم می گردید“ شاہ صاحب نے
جو تقریر فرمائی وہ ایک کتاب معنی تھی۔ لیکن چونکہ زبان ہندی تھی اس لئے
بیدل نے اسے ”چہار عنصر“ میں نقل نہیں کیا۔

ای بسا معنی کہ از نامحرمی ہائی زبان باہمہ شوخی مقیم نسخہ ہائی راز ماند
نغمہ بابیاری بود اما ز جہل مستمع ہر قدر بے پردہ شد و پردہ ہائی ساز ماند
حسن در اظہار شوخی رنگ تعمیری داشت چشم با غفلت نگہ شد جلوہ محو ناز ماند
جذبہ شوق بیدل کو ایک اور یگانہ روزگار ”شاہ یکہ آزاد“ کی خدمت میں لے
گیا۔ عمر بزرگوار میرزا قلندر نے شاہ صاحب کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے شاہ
صاحب خود ہی میرزا قلندر کے ہاں تشریف لائے۔ گرمی کا موسم زور پر تھا۔ بیدل
پنکھاسے ہوا داری کی خدمت بجالایا۔ شاہ صاحب مسکرائے اور بیدل کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا کہ عنقریب تیرے ریشہ فطرت سے نہال قامت آرائی کرے گا۔
اور تیرے ہیولائی استعداد سے ایسی صورت ظہور میں آئے گی کہ اس کی کیفیت
کے فہم سے بلند آنگاہ بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

ای نوائی درد دل نو میدافسون میباش آزار ضبط نفس شو قیامت می شوی
دی ہر شک تو ان چنے دگر با صبر باش مایہ ات چوں جمع شد قاف علامت می شوی
اس حوصلہ افزائی کے بعد ثانوی معنوی کے چند ابیات پڑھے۔ یہ رموز خودی
تھے۔

ایں توئی ظاہر کہ پنداری توئی ہست اندر توئی تواری بے توئی
اودا ست امانہ ایں تو کہ منیست آں توئی کاں برتر از ما و منیست
توئی تو در دیگرے آید و فیں من غلام مرد خود بین چنیں
اس موضوع پر بیتل نے جو کچھ لکھا ہے مناسب مقام پر زیر بحث لایا
جائے گا۔

بیتل شاہ صاحب کی کرامت کا ذکر کرتا ہے کہ ایک دفعہ دریا گنگا سے
عبور کرنے کے لئے کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی میں اور لوگ بھی سوار تھے۔ جب منبھار
میں کشتی پہنچی، ملاحوں نے کشتی سوال ہر ایک شخص کے سامنے پیش کی جسب توفیق
سب نے جو کچھ دینا تھا دیا۔ شاہ صاحب کی باری آئی، یہاں کیا رکھا تھا۔ ہر چند
فقر کیا کہ بابا میں فقیر بے نوا ہوں۔ مستحق خدمت خیرات ہوں۔ مگر کون سُناتا ہے۔
ملاح درپے آزار ہوئے۔ شاہ صاحب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ کھڑے ہو گئے اور
دریا میں کود پڑے اور ”چوں شکن در طرہ موج نشست“ کشتی میں لوگوں نے
شور مچایا، شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ اے بے خبر و ناتوانی کی وجہ سے اتنا
لڑنا ہوا نہیں ہوں کہ دیش موج میرا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اور سبکساری کے فیض
سے اتنا آپے سے باہر نہیں ہوا کہ جناب کی پشت خم پل کا کام نہ دے۔ اس کے
بعد ہوا کے جھونکے کی طرح دریا عبور کر گئے۔ اور آنکھ کی جھپک میں نظروں سے
غائب ہو گئے۔ سچ ہے ”ترا کشتی آؤ و مارا خدا“

بیتل نے اس موقع پر جو اشعار لکھے ہیں وہ انگلستان کے مشہور شاعر
گرے کی ”ایلیسی“ کے ہم معنی ہیں۔

ای بسا روشن دلے کرنے نیاز یہاں شوق
چوں فروغ مہر بر خاک سیاہ افتادہ است
ای بسا آئینہ کز کسوت ز نگار ریش
یو فستائے بخل و نگاہ جاہ افتادہ است
معنی اقبال فقر از غافلان پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں ہست نگاہ افتادہ است
ہر کجا گرد شکستے سرمہ آرا ید بچشم
بے تامل نگذری آنجا کلاہ افتادہ است
ذرہ تا خورشید عرفاں جلوہ است اما چہ سود
دیدہ ہائے خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است
عالے محل بدوش و ہم جولاں می کنند
کیست تا فہم کہ منزل ہم براہ افتادہ است
ایک اور مقام پر اسی کے ہم معنی ارشاد ہے کہ :

ای بسا آئینہ کز در و قفاں ہائی حسن
ریشہ داری از زمین یا سر بالا نکرد
وی بسا تخمے کہ از بے التفاتی ہلے ابر
خاک شد در زہر رنگ جو ہری پیدا نکرد
شیدہ ہاد محفل افسوس مکاں چوں حباب
خود بخود در ہم شکست و با مئے سودا نکرد
گر ہمہ رنگیست موقوف بہار جلوہ ایست
در ہمہ بویست بے گل بال شونی و انکود

ہچماں کز حسرت دیدار می بالہ نگاہ
نالہ را ہم جز ہوائی قامت رعنای نکرد
قید کلفت بر نہاد و شبنم مہر آشنا
کیست منظور تو شد کز علم استغنا نکرد
ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ استعداد خواہ موجود ہو جب تک مناسب سبب
مدد نہ دیں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔

آئینہ میں استعداد موجود ہے لیکن اگر حسن ہی قفاں برتے تو کوئی صورت
نہیں کہ اس کی استعداد ظاہر ہو۔ ریشہ کو حسرت ہی ہے کہ زمین سے ذرا سر اونچا
کرے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے لیکن اگر ابر ہی آبیاری نہ کرے تو اس کا نشوونما
نہیں ہوتا اور وہیں گل سرور کرہ جاتا ہے۔ اسی طرح شیشے حباب کی طرح ٹوٹ
پھوٹ جلتے ہیں اور شراب سے لین دین کی نوبت ہی نہیں آتی، خواہ کوئی
شے سہ تپا یا رنگ ہو اس کا جلوہ بہار پر موقوف ہے اور اگر بو ہے تو گل کے بغیر
اس کی شوقی کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض جب تک مناسب اسباب استعداد کے

بیتدل

ساتھ نہ ملیں ظہور کمال نہیں ہوتا۔ بیتدل میں بھی فطری قابلیت موجود تھی۔ اگر ایسے صاحبان علم و فضل کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو کج یہ بھی ایک گمنام شخصیت ہوتی۔ تاریخ کے صفحات پر کتنے نامور اشخاص کا تذکرہ ہے جن کی تعریف میں لوگوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مناسب اسباب اور حالات کی سازگاری نے انہیں نامور بنا دید و نہ ملن ہے کہ بلحاظ استعداد اور بھی ہوں بلکہ بڑھ چڑھ کر ہوں۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔

بیتدل نے ”چہار عنصر“ انہی حضرات کی تعریف و توصیف میں نذر کر دیے ہیں۔ خوش قسمتی سے عمر بزرگوار مرزا قلعندری کی تربیت نصیب ہوئی۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ”تربیت فقیر بیتدل بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک نشاء بلوغ بعہدہ اتفاقات خود داشت، و با اتفاق ربوبیت در تعلیم مراتب ادب و تدبیر معانی اخلاق توجہ کمال می گماشت“ ان فوائد کے علاوہ کہ ”ملعہ نظمی کہ امروز رونق افزائی کا نون تخیل است“ اسی آفتاب کا پر تو ہے جس کے زیر سایہ میری تربیت ہوئی۔ لطف یہ ہے کہ خود اُمی تھا مگر

کمالات بے سعی کسب حصول	حقائق ہماں بے بیان نش وصول
نگردیدہ بر حرفے انگشت سا	بمعنی چو معنی بحر ف آشنا
فیض ازل محرم ہر کلام	دلے امی از کسب فضل عوام
فضائل را در اک او خوشہ چیں	زہے اُمت خاتم المرسلین

آخری شعر میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اُن حضرت ”بھی اُمی“

تھے۔

”نگار من کہ بہ مکتب زلفت و خط نوشت“

(حافظ)

بغزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد“

ہزاروں رازی اور غزالی اسی ”اُمی“ کے فیض یافتہ ہیں، ارشاد قرآن

ہے۔ کہ:

”وما کنت تتلوا من قبلہ“ تو اس سے پیشتر نہ تو لکھا ہوا پڑھ سکتا تھا
 من کتب ولا تحطہ بمینک اذا لا رتاب المبتلون بل هو
 اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھنا ہی جانتا تھا
 اگر ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے شک و شبہ میں پڑتے
 ایت بدینت فی صدرا الذین حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن آیات ان لوگوں کے
 او تو العلم“ (۲۱) ذہن میں ہیں جن کو علم عطا کیا گیا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ :

”الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم“ (۲۲) اللہ ہی نے قلم سے سکھایا اور وہ کچھ سکھایا
 جس کا علم انسان کو نہ تھا۔

لیکن نوک قلم پر آنے اور صفحہ قرطاس پر رقم سے پیشتر انسانی ذہن میں آیات
 بینات تھیں۔ یعنی اہل علم کے قلب سلیم میں جو کچھ تھا، وہی کچھ قلم نے لکھا۔

چشمے داری و عالمی در نظر است دیگر چہ معلم و کتابت باید
 مدرسہ کی بک بک کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو کہ بتبدیل لکھتا ہے کہ ایک روز

مدرسہ علماء میں ایک مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی ”دانش مند بے انصاف“ نے لاف و گزاف
 سے مجلس گرم رکھی اور آوازہ ضرب یضرب سے ”علم خفت عقل“ بلند کر رکھا تھا۔

قیل و قال کی خاک سے وہ دھول ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈالی کہ علم کو رسوا
 کر کے چھوڑا۔ مرزا قلندر بھی اس مجلس میں موجود تھا، اسی دن سے بتبدیل کو منع کیا کہ

علم مدرسہ بے فائدہ ہے، فرمایا کہ اگر یہی آثار علم ہیں تو بہتر ہے کہ تو جاہل ہی رہے اور
 اگر تحصیل کا فائدہ بھی کچھ ہے تو مناسب ہے کہ توبے حاصل ہی رہے۔ کیونکہ اس کا

نتیجہ سوائے پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ نہیں۔ جب کبھی کسی مسئلہ کی حاجت
 ہو ”قاضی در محکمہ نردہ است“ اور جب کبھی نصیحت منظور ہو ”واعظ را از منبر گرگ

نبردہ“

”غزوہ دانش نگردی از قسون لفظ چند ای زمعنی بے خبر علم حقائق دیگر است“
 ”ایں سخن ہائی کہ یاران ام عرفان چیدہ اند جز خوشی آنچہ فطرت راست لائق دیگر است“

آفتاب کو آفتاب کی روشنی میں دیکھنا بدیہی علم ہے، اور کسی کو ر مادر زاد کو استدلال عقلیہ سے سمجھانا اور شے ہے۔

چوں نہیں منحرف افتاد دلائل بالید راستی رفت کہ ممنون عصایم کردند
اگر ان علماء کی قیل و قال اور بحث و مجادلہ کو دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ بیدل نے سچ کہا ہے:

از تعصب جا ہلاں دین ہدی را دشمن اند عاقبت دجنگ ایں کوراں عصا خواہد شکست
”دین ہدی“ تو ان اندھوں کی صراط مستقیم پر رہنمائی کر رہا ہے، اور بمنزلہ ”عصا“ ہے لیکن یہ اس عصا سے ایک دوسرے کے سروں کی تواضع کر رہے ہیں اگر یہ بے مغز نہ ہوں تو اسے توڑ کر نہ رکھیں۔

اں کیست کہ گرد د طرف مولوی امروز یک تیغ زباں دار دو صد نوک شاں بخش
اکبر مغلیہ شہنشاہ ابتد میں بہت دیندار آدمی تھا۔ اور علماء کی قدر و منزلت بھی دل میں بہت تھی، علم حدیث صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے سیکھا جو امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔ بدایونی اپنی تاریخ ”منتخب التواریخ“ میں لکھتا ہے، کہ اکبر کے دل میں اس کا یہ احترام تھا کہ اس کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سیدھی کرتا۔ اسے یہ اختلاف جو مختلف فرقوں میں تھا پسند نہ تھا۔ اس لئے ایک مجلس علمیہ منعقد کی۔ غرض یہ تھی کہ اختلافی مسائل پر علماء باہمی بحث کے بعد ایسے امور پر متفق ہوں کہ اختلاف رفع ہو جائے۔ اس مجلس میں چوٹی کے علماء موجود تھے لیکن حالت یہ تھی کہ اپنا تفوق جمانے کے لئے اگر ایک کسی شے کو حلال یا مباح کہتا تو دوسرا حرام اور مکروہ قرار دیتا اور دونوں فریق روایات اور ائمہ دین کے اقوال تائید میں پیش کرتے۔ بحث کی گرمی میں بادشاہ کی موجودگی کا بھی پاس نہ کرتے۔ لام دکاف تک نوبت پہنچ جاتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک روز اکبر نے اس طوفان بے تیزی سے تنگ آکر کہا کہ آئندہ جو حضرات آداب مجلس کا پاس نہ کریں گے بھگوا دئے جائیں گے۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا دینی زبان سے کہا کہ پھر تو یہ سب نالائق

اسی لائق ہیں۔ اکبر نے یہ فقرہ سن تو یا، لیکن تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ کیا کہتا ہے، عرض کی حضور کچھ نہیں آپ نے سچ فرمایا علماء کو اخلاق سے کام لینا چاہئے ان مذاکرات علمیہ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کرام عوام کی نظروں سے گر گئے۔ اکبر مذہب سے بدظن ہو گیا۔ اور ان علماء کی وہ گت بنائی کہ پھر نہ ابھرے۔ اس وقت تک دینی حکومت کے ساتھ دنیوی حکومت بھی ان کے ہاتھ میں تھی، اکبر نے چھین لی۔ عبدالنبی اور عبداللہ مخدوم الملک وغیرہ کو مکہ کا راستہ بتایا اور خود اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ خانقاہوں کے پیروں کو بھی نہ چھوٹا۔ خواجہ اجمیری کا یہ احترام تھا کہ جب کبھی زیارت کے لئے جاتا دس کوس ادھر ہی پایادہ چلتا۔ اس کے پورے متولی کو قلعہ گوالیار میں قید کیا۔ حرم نے بہت سفارش کی، کہا کہ یہ گمراہ جب بھی قید سے باہر آئے گا لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ وہ قید و بند میں مر گیا۔ اکبر کا پوتا شہنشاہ دین پناہ اکبر کو ”جدا کفر“ کہتا ہے۔ صبح، لیکن اس کی تمام تر مذہب داری علماء کرام ہی پر عاید ہوتی ہے۔ دین کی غرض تو ہدایت ہے اس کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا آلہ کار بنانا کوری نہیں تو اور کیا ہے۔ اکبری عہد کے علماء کی دنیا طلبی کا یہ حال تھا کہ عبداللہ مخدوم الملک مر گیا تو اس کے ترکہ کا جائزہ لیا گیا۔ کسی مخبر نے جھوٹی کہ صحن خانہ میں چند قبریں ہیں ذرا ان کے ”راز دروں پر وہ“ کی خبر لینی چاہئے۔ اکھڑوائی گئیں تو سونے اور چاندی کی اینٹیں برآمد ہوئیں یہ ہے علماء دین کی اوقات۔

”حافظامی خور و زندگی گن و خوش باش وے

دام تزویر مکن چوں دگر ان تر آن را“

یہ بے روزگار بیکار جماعت ہے اگر پیٹ پالنے کے لئے دین فروشی نہ کریں تو کیا کریں۔ عقل کے اندھے اور گمانٹھ کے پورے بھی ان کو اکثر مل جاتے ہیں۔ بیدل ان کے تجبہ و دستار اور ریش کی خوب خبر لیتا ہے۔ اسی ٹٹی کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، بیدل ہی نہیں شیخ سعدیؒ بھی کہتا ہے کہ

بیتدل

”زہارِ ازاں قوم نباشی کہ فریبند

حق را بسجودے و نبی را بدردے“

اللہ اور رسول کو کیا دھوکا دیں گے سادہ لوح لوگوں کو دامِ تزویر میں پھانس ہی لیتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں جمعیتہ علماء ہند نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ پاکستان نہ بنے اور ابھی تک ہندو کانگریس کے گن گاتے ہیں۔ جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں

گر مسلمان ہیں است کہ حافظ دارد

و امی گرا ز پس امروز بود فردائی

ہم نے یہ چند کلمات اس لئے لکھے ہیں کہ بیتدل کے کلام کا ایک موضوع یہ بھی ہے۔ جس پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

بیتدل شاہ فاضل قدس سرہ کا بھی ذکر کرتا ہے کہ میرزا قندران کی صحبت

میں بھی لے گیا۔ جو کچھ میں نے ان کے بیان کی شگفتگی سے رنگینی مشاہدہ کی ہزار جوش بہا میں اس کی گل چینی میسر نہ ہوتی۔ اور جو نشہ آپ کی کیفیتِ تکلم سے اخذ کیا ہزار دور سا غر فکر سے بھی حاصل نہ ہوتا۔ جب کبھی آپ کچھ ارشاد فرماتے میں بہت گوش ہو کر سنتا اور کامل توجہ کی وجہ سے حافظہ میں محفوظ بھی ہو جاتا۔ شاہ صفا میرے حال سے بے خبر نہ تھے، کبھی کبھی میری رسائی ذہن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے کہ کاش تجھ جیسا سامع میری باتیں سننے اور سمجھنے کے لائق ہوتا کہ میں بھی قیدِ خاموشی سے آزاد ہوتا۔ اور تیرے جیسا طالب ہوتا کہ میں اپنے عقیدہ دل کو کھول کر رکھ دیتا، اب تو یہ کیفیت ہے کہ جو کچھ دل سے اب پڑنا چاہتا ہے۔ پھر دل کو بی کرتا ہے۔ سچ ہے کہ

مہل قابل و دانگہ نصیحت قابل

چو گوشِ ہوش نباشد چہ سود جس متقل (سعدی)

اندھے کے آگے رونا بھینس کے سامنے بین بجانا ہے۔ اگر لوگوں کے

فہم میں کج روی نہ ہوتی خاموشی کو سخن پر ترجیح بھی نہ ہوتی۔

عندلیبے بہم نوائی دگر شکوہ سرکرد کائی نوا پرور
شور ز انغم دریں چمن بار است گفت خاموش زارغ بسیار است
عالم از جنس ایں خروش پر است از نوا ہائے ہرزہ گوش پر است

ایک عندلیب نے اپنی ہم نوا عندلیب سے شکایت کی، ہم تو اس باغ میں چہچہاتی اور نغمہ سرائی کر رہی ہیں۔ مگر یہ کوؤں کی کائیں کائیں ایسی سمع خراش ہے کہ دل پر گراں گزر رہی ہے۔ اس نے کہا کہ چپکے رہو اکثریت کوؤں ہی کی ہے۔ ایک دنیا اس جنس کے شور و غوغا سے پڑ رہے۔ ان کی یا وہ گوئی سننے سننے کاں بہرے ہو گئے۔

ان اہل علم و فضل اور ارباب صدق و صفا کی محبت میں جو کچھ ان کے ارشادات تھے تبدیل انھیں بھی اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے مثلاً شاد فاضل کی مجلس میں فقراء کی ایک جماعت چوں مڑگاں بہم پیوستہ خلوت آرائی انجمن یکتائی یو دند "ان سے ایک نے سوال کیا کہ منصور نے بھی انا الحق کہا اور فرعون نے بھی "انادیکم الاعلیٰ" کہا۔ دونوں ایک "مقام" کی راگنی الاپ رہے تھے، منصور میں کونسا کمال تھا کہ قابلِ تحسین ہے، اور فرعون کا نغمہ کہاں سے بے سرا اور بے تال ہوا کہ قانون آفریں سے خارج ہو گیا۔ فرمایا کہ منصور بے یقینی فقر کی وجہ محرم اسرار یقین تھا۔ یعنی جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس پر اسے کامل یقین تھا اور کسی حالت میں اس کے پائے استقلال نہ ٹٹکھڑائے۔ یہاں تک کہ اس کے ایمان پر خون شہادت نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ منصور نغمہ وحدت الاپ رہتا تھا، فرعون غرور و اسباب شوکت میں گمراہ تھا، جب امتحان کا وقت آیا رنگِ استقلال اُڑ گیا۔ جب اس کا دفتر گیر و دار آب نیل میں ڈالا گیا۔ تمام نقوشِ دعویٰ باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ ایک ہی موج کے تھپڑے نے حواسِ خمسہ درست کر دیے، بے اختیار چلا اٹھا "آمنت برب موسیٰ و ہارون" میں موسیٰ اور ہارون کے پروردگار

بیدل

پر ایمان لایا، ثابت ہوا کہ کذب لازم کثرت نمائی ست و صدق دلیل وحدت
آشنائی

سلطنت سرمائے توحید نتوان ساختن یعنی اس جارشتہ اظہار وحدت درہم است
اعتبار غیر بسیار است در اسباب جاہ بافقیری ساز کاہنجا ماسوائے حق کم است
زنگ ہائی اس چمن یکسر شکست آمادہ اند اسی اسیر و رنگ بیرنگی بنائی محکم است
عبثتے حاصل کن اسی غافل نہ نخل میوہ دار چون تعلق یار دل شد استغنا خم است
ایک دفعہ شاہ صاحب کی خدمت میں ایک دوست نے یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

میتوان در کلبہ باہم شبی را روز کرد
بوریا اگر نیست نقش بوریا افتادہ است

اسی ایک شعر میں حرف مدعا کلی واضح کیا۔ شاہ صاحب نے بیدل کو کہا،
مجھے اس عبارت آرائی کی زحمت سے نجات دواور بے تکلفانہ جواب لکھ دو کہ
نقش بوریا کا وہم راحت پسندوں کو ہوتا ہے اور کلبہ و کاشانہ عمارت اندیشوں
کی عشرت کا تخیل ہے یہاں جو کچھ ہے نقش سادہ کے سوا کیا رکھا ہے۔ بیدل نے
بے تامل جواب میں چند اشعار لکھ دئے۔

خود بیا و حال ما بنگر کہ در ملک فنا

روزگار ما روز و شب جدا افتادہ است

کلبہ و سواس است نقش بوریا زنگار طبع

کار با باشیوہ صدق و صفا افتادہ است

بوریا و کلبہ را در عالم ما بار نیست

ہر کجا ما ہم نقش مدعا افتادہ است

کلبہ آتش زن، نقوش بوریا را محو کن

در بساط فقر ما بین چہا افتادہ است

تا تخواہ سوخت از ما برخواہ داشت و ست

نستی مارا چو آتش در قفا افتادہ است

حاضرین نے یہ برجستہ جواب بہت پسند کیا، شاہ صاحب بھی غلطو ظہوئے اور تحسین کے بعد دعاء خیر بیدل کے حق میں کی۔

بیدل کا خال مرزا ظریف فقہ و احادیث میں خوب ماہر تھا، ۱۰۷۱ھ میں جبکہ بیدل کی عمر سترہ سال تھی اپنے ہمراہ اوڈیسہ میں لے گیا۔ بیدل کو عم بزرگوار مرزا قلندر سے جدا ہونا پڑا۔ انہی ایام میں شاہ ابوالقاسم ترمذی بھی اوڈیسہ میں وارد ہوئے۔ مرزا ظریف آپ کا بہت معتقد تھا۔ تین سال مسلسل بیدل کو شاہ صاحب کی صحبت نصیب ہوئی۔ بیدل لکھتا ہے کہ میں اکثر اہل اللہ کی خدمت میں گیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک یگانہ روزگار تھا، اور ان کے فیض صحبت سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا مگر دل میں ایک تڑپ تھی۔

تمام شوقم یک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد

بلکہ بدایغ کہ می نشیند نفس باہ کہ می خرامد

شاہ صاحب کی صحبت میں آخر مقصد حاصل ہوا۔ بودیم آنچه بودیم او وانمود مارا۔“

شاہ صاحب سے پہلی ملاقات کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ زمین مردہ پانی کو ترستی ہے ابر کرم آتا ہے اور برستا ہے، نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیدل لکھتا ہے کہ شہر گنگ دریا کے کنارہ پر صدر مقام صوبہ اوڈیسہ کا ہے۔ یہاں میں مرزا ظریف کے ساتھ چند روز ہوئے کہ ٹھیرا ہوا تھا۔ مرزا حسب معمول درس دے رہے تھے اور ہر ایک آیت کی تفسیر بھی بیان کر رہے تھے، اتنے میں ایک درویش جو شاہ صاحب سے منسوب تھا آیا اور کہا کہ شاہ صاحب آپ کی ملاقات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ اس طائفہ سے اعتقاد وراثت میں ملا ہوا تھا۔ مرزا ظریف اور میں استقبال کے لئے بڑھے، اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ شاہ صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ الحمد للہ کہ آپ

اور میں ایک ہی دن اس شہر میں وارد ہوئے ہیں، ”فرصت ہا مفت شوق است وصبت ہا غنیت ذوق“ اس کے بعد وہی آیات قرآن حکیم جو ہم تلاوت کر رہے تھے آپ نے پڑھیں اور وہ معانی اور نکات بیان فرمائے کہ کسی مفسر نے نہیں لکھے تھے، مجھ پر تو ایک بیخودی طاری ہو گئی اور مرزا ظریف باہمد دعویٰ بحر ملی حیرت میں آگیا۔ اس محیط قدرت کے سامنے اعتراف عند قطرہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ چالیس سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں نے مدرسہ ثقات کا اتباع کیا اور تفسیروں سے اتنی سند تحقیق بھی حاصل کی، اگر علم یہ ہے جس پر مجھے ناز تھا افسوس میں نے ایک عمر بے تمیزی ہی کسب کی اور ان اوقات کے ضائع ہونے کا افسوس ہے جو مشقت غفلت پر صرف ہوئے۔

”دریں غفلت سرا عرفان ما، ہم ناز کی وارد

سرا پا مغز دانش گشتن و چیزے نفہمیدن“

شاہ صاحب نے فرمایا کہ اگر اس مدرسہ عالم کا علم ایک ہی جنس اصطلاح پر منحصر ہوتا تو لوگ اس کے مطالب مختلف عبارت میں ادا نہ کرتے۔ سب بھانت بہانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ہر ایک ساز اپنے اپنے رنگ میں شوخی آہنگ کا اظہار کر رہا ہے بالخصوص قرآن عظیم ساز حقیقت قدرت ہے اور قانون سرائر عزت، تصنع عبارت سے منزہ ہے کہ باہنگ نقصان نش سرانید اور اشارات کے تکلف سے پاک ہے کہ ”بمضرب کمالش واستانید“ اس کے نعمات کی بے پردگی سازندہ کی استعداد کا پتہ دیتی ہے اور اس کے مقابلات کی بے نقابی نوازندہ کی فطرت کی شوخی بتاتی ہے ”ہر کس ایں جا از مقام و حال خود گوید خبر“ اہل علم و فضل نے جو کچھ اس کے مطالب بیان کئے یہ سمجھنا چاہئے کہ اپنی تحقیق کی حد کا نشان دیا۔ ان کا نغمہ بے سراور بے نال نہیں۔ اس بحر تحقیق میں من و تو زبانیں ہیں جو موج کی طرح سرگرم گفتگو ہیں، ہر ایک موج سے ایک شور پیدا ہو رہا ہے لیکن سب اپنے شور سے بے خبر ہیں، اگر ذرا خاموشی طاری ہو جائے تو منکشف ہوتا کہ دریا کے

منہ میں کتنی زبانیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مراتب کلام تحریر و تقریر بقدر فہم و عقل سامع ہیں۔ آفتاب جب تک خاکِ زمین پر جُبَّہ سائی نہ کرے سایہ کی طبیعت سے رنگ دور نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحبِ علم و فضل کو باہمہ بلندی درجاتِ عوام کی دستگیری کے لئے تنزل کرنا پڑتا ہے تاکہ عوام کی طبیعت سے جہل مطلق رفع ہو۔ اگر حسن تحقیق اپنے ذاتی کمال سے جلوہ نما ہو تو ان آنکھوں پر ظلم ہو گا جو ضعیف نگاہ ہیں۔ اس لئے بقدر طاقت برداشت ہی بات کرنی پڑتی ہے اور اس طرح بات بھی بنتی ہے، اور اسی لحاظ سے نظریوں میں اختلاف اور تفاوت بھی ہے۔

سلسلہ تقریر ختم ہوا تو شاہ صاحب اٹھے، مرزا ظریف نے چند قدم مشایعت کی، مگر میں سایہ کی طرح ساتھ ہو گیا۔ چلتے چلتے شاہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میں تو تمہارے ہی درد کی دوا بن کر آیا ہوں، مجھے اپنا شریک حال و اشغال سمجھو، اس بزم کے ساتھی مستوں کے حوصلہ کے مطابق ہی پلاتے ہیں اور اس محفل کے شاہد شائقوں کی تاب و طاقت کے مناسب، نقاب کے بند کھولتے ہیں۔ اس کے بعد دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تیرے مشرب استعداد کو کمال تک پہنچائے۔ شاہ صاحب کی مجلس میں عموماً اہل علم و فضل کا مجمع رہتا۔ کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو شاہ صاحب میری طرف بھی توجہ فرماتے کہ ماں تم بھی کچھ کہو میں جو کچھ خیال میں آتا نظم و نشر میں گزارش کرتا۔ شاہ صاحب تحسین کے ساتھ حوصلہ افزائی اور کبھی کبھی اصلاح بھی فرماتے، ایک دن شاہ صاحب کے بھائی میر عبد السلام مجلس میں موجود تھے، شاہ صاحب سے کہا کہ ایسا قابلِ نو عمر اس لائق ہے کہ آپ کی توجہ سے کسی وقت اوج کمال پر پہنچے اور تھوڑے عرصہ میں مشہور ہو جائے۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ یہ ان لوگوں سے ہے جن کو فضل حقیقی نے ازل سے جوش عطا فرمایا ہے اور ابداً ان کا احوال خیرانہ غیب میں پوشیدہ ہے۔

ایک روز مرزا ظریف نے ازراہ تہفہ جو بزرگوں کو بیٹوں کی تربیت کے لئے

لازم ہے جب مجھے دیکھا کہ میں پیشوا یا بن عالم اور فقرا کا سارا ن طریقہ فلسفے عموماً
 اختلاط رکھتا ہوں شاہ صاحب کی خدمت میں شکایت کی ”یہ زیاں کا نقد آگہی“
 بے معرفت لوگوں سے جو اہل تقلید میں رہتا ہے ناممکن ہے کہ تحقیق سے اسے کبھی کچھ
 بہرہ ہو۔ اور جس فائدہ کا لالچ ہے وہ آخر نقصان کی صورت میں ملے گا۔ یہ اپنا
 وقت ضائع کر رہا ہے، اگر یہی وقت جناب کی صحبت میں صرف کرے تو مفت
 دولتِ عظمیٰ ہاتھ آئے۔ بیدل آنکھیں نیچی کئے خاموشی سے سنتا رہا۔ شاہ صاحب
 نے فرمایا کہ ہر صفت اور ہر استعداد کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے
 کہ اس کی بنائے فطرت کمال متانت سے مضبوط ہے اور بساط طینت نہایت صاف
 اور سموار ہے۔ لیکن جوانی کا بھی کچھ تقاضا ہے، اور یہ بے پروائی اس لائق ہے کہ نظر
 انداز کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی طرح اس کے اوقات میں خلل واقع نہ ہوگا۔
 خواہ یہ کسی طرف مشغول ہو تہمت غفلت اس پر عاید نہ ہوگی۔ آپ مطمئن رہیں،
 بیدل حیران تھا کہ

خافلاں سرگرم طعن و محرماں مست ثنا من ہماں آئینہ حیرت پرستیا ہائی خویش
 خلقے از مشت غبارم آسمانہا در نظر من بچشم نقش پا حیراں ز پستیا ہائی خویش
 یہ خوب رہی، شاہ صاحب تو میری تعریف فرماتے رہے اور خالو صاحب
 زجر و توبیخ، جب آپ اٹھ کر چلے گئے تو میں ویسے ہی سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاہ صاحب
 نے فرمایا کہ بزرگوں کے کہا کا بُرا نہ ماننا چاہئے۔ ناصح اپنے اعتقاد میں جو کچھ پسند و
 نصیحت کرتا ہے تو غرض ترغیب ہے اور معلم کو بھی تہذیب اخلاق ہوتی ہے۔

بیدل شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا بھی ذکر کرتا ہے، کہتا ہے کہ ان ایام
 سعادت انجام میں سید محمود جو مولانا یعقوب چرخ کی اولاد سے تھا اڑیسے میں صوبدار
 تھا۔ شکنجہ مرض میں متصدیان امور تقدیر نے ایسا بکڑا رکھا تھا کہ مسندِ صحت پر
 ایک ساعت بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں نہر سرایت
 کر چکا تھا۔ اس مرض کو داء الثعلب کہتے۔ ہر چند اطباء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا

ہے۔ آخر مشکل اسے باہر نکالا۔ نشہ تو سب ہرن ہو چکا تھا۔ پانی سے منہ دھویا مگر چہرہ پر سیاہی ایسی جمی کہ دھوئی نہ گئی۔ گویا بیدی رو سیاہی کا داغ تھا جو مٹائے سے نہ مٹا، کہا ر آٹھا کر اسی حالت میں گھر تک لے گئے۔

”منکر انسان کامل ہر کجا آید بچشم“

بے تامل شدیقین سگ بود یا خبر بود است

انسان کامل کا منکر جہاں دیکھو یہ سمجھ لو کہ یا کتنا ہے یا گدھا۔

”زانکہ در ہم جنس نتواں یافتن بوئے حسد“

طبع ہائے مختلف از ہم مکرر بودہ است

ہم جنس تو ایک دوسرے پر حسد نہیں کرتا کتنے ہی ایسا کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک جنس دوسری جنس سے نفرت ہی کرتی ہے۔ ”روح را صحبت با جنس غذا نیست الیم“

”جنس یکسر ہیئت معنی است بے ترکیب“ ژالہ را مشکل اگر گویند گوہر بودہ است

”گر ز باطن برنجیزد اختلافِ خامیت“ آتش و یا قوت در ظاہر برابر بودہ است

ہر ایک جنس کی حقیقت ایک ہے۔ اور اس کے خواص بھی اسی حقیقت کے

مناسب ظاہر ہوتے ہیں، بظاہر اولہ اور موتی کی ایک صورت ہے اور اسی طرح

آگ سے دھکتا ہوا کوئلہ اور ہیرا بھی چمک دمک میں ایک جیسا ہے، اگرچہ ژالہ

اور گوہر کی اصل پانی اور کوئلے اور ہیرے کی اصل بھی ایک ہی ہے مگر ان کی

معنوی صورت جس شکل میں ظاہر ہوئی ہے وہ مختلف ہے خواہ محسوس صورتیں

طبی جلتی ہیں۔

چوں بصورت واری گل نیز ساغر بودہ است

از ہما تا چند یکسر مشتے از پر بودہ است

ورنہ خرس اندر بزرگی از کہ کمتر بودہ است

زین سبب بولہبب خصم ہم پر بودہ است

مگر دوش رنگ از جہان نشہ پیائے جداست

غیر معنی گزہ نقش محض بار شد اشتراک

پس یقین شد آدمی معنی بود بیدست دیا

علت افتاد خلق اوج و ضعیض فطرت است

در ثبوت ایں حقیقت شاہدے دکار نیست ہر کہ خصم انبیاء بود است کافر و وہ است“
 تبدیل ایسی ایسی نئی ترکیبیں ”جہان نشہ پیا“ آپ ہی اختراع کرتا ہے، ایسا
 معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شاعرانہ تخیل زبان میں زیادہ وسعت کا مطالبہ کرتا ہے، اور
 حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کا حکیمانہ تفکر اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ زبان پر پوری
 قدرت حاصل تھی، یہ اسی کا حصہ ہے، اُردو میں کوئی ترجمانی کیا کرے۔

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صرف صورتوں میں مشابہت نظر کی جائے اور
 معنی یا حقائق کو جو فطری ہیں نظر انداز کیا جائے تو ہمارے اُردو دونوں مشت پر ہی
 تو ہیں۔ اس لحاظ سے تو ان میں کچھ فرق نہیں۔ پھول بھی تو پیالہ کی صورت میں۔
 لیکن پھول میں وہ نشہ بادہ کہاں جو ساغر میں ہوتا ہے۔ اس عالم صورت میں اہل
 نظر ان حقائق کو دیکھتے ہیں جو ان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں، صورتوں میں
 تو اتنا اختلاف نہیں اور ایک ہی جنس کی صورتوں میں بہت کم ہوتا ہے لیکن جب
 ان کا مقابلہ دوسری جنس سے کیا جائے خواہ ان کی نوع ایک ہی ہو تو ان کے
 جوہر واضح ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ آدمی ان ہاتھ اور پاؤں کا
 نام نہیں، آدمیت ایک حقیقت ہے، کچھ ہاتھ پاؤں کے لحاظ سے بزرگی میں
 آدمی سے کمتر نہیں۔

”خلق“ اور ”خلق“ دونوں کی اصل ہی ہے ”خلق“ کا اطلاق ظاہر پیدا نشی
 صورت پر ہوتا ہے اور ”خلق“ معنوی یا ذہنی ساخت ہے۔ اور ”عادت“ کے
 معنی میں استعمال ہوتا ہے، نوع انسان میں ہر ایک شخص کی فطرت کی بلندی و پستی
 سے ہی ان کے اخلاق میں اختلاف کی حقیقت مضر ہے، یہی وجہ ہے کہ ابی لہب
 اُن حضرت کا دشمن تھا، کہ دونوں کے اخلاق ایک دوسرے کی ضد تھے۔
 اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مسلم ہے کہ نبیوں کا جو بھی منکر ہے
 کافر ہے۔

یہ واقعہ تو ادھر رونما ہوا۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ اسی بے ادبی کا خمیازہ

بیدل

تھا جو اس مردود ازلی کو بھگتنا پڑا۔ حضرت شاہ اپنے دولت خانہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، بیدل اور مرزا ظریف بھی ہمراہ تھے۔ ابھی رخصت نہ ہوئے تھے کہ اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ ادب خان دوران سید محمود کا آدمی بھی آیا اور عرض کی خان کی گزارش ہے کہ جناب اپنے الطاف کریمانہ سے اس بے ادب کا جرم گستاخی معاف فرمائیں۔ ایک عمر میری مصاحبت میں رہا ہے۔

”دریادلان کہ سینہ بگو ہر جلا دہند

خاشاک بلچو گل بسر خویش جا دہند“

بحر کے شکم میں آبدار موتی ہوتے ہیں اور سطح پر خس و خاشاک بھی۔

مفہوم یہ ہے کہ خود ریادل ہیں اہل صفا ہیں ان کے سینہ بے کینہ میں وہی موتی کی آب اور روشنی کا نور باطن ہے جس سے وہ منور ہے پھول کی طرح پست فطرت لوگوں کو بھی سر پر اٹھاتے ہیں۔

”رنگینی و فاست کہ از سرگذشتگاں

چوں شمع گل تقابل تیغ آزما دہند“

شمع کا روشن حصہ جو سر ہو تا ہے اصطلاح میں ”گل“ کہلاتا ہے، اور اسی رعایت سے بتی کو ”خار شمع“ کہتے ہیں۔ شمع نے بھی سر ہتھیلی پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے جانباڑوں کی رنگینی و فاکا تقاضا ہے کہ شمع کی طرح ”تیغ آزما“ یعنی قاتل کے سامنے اپنا سر پیش کریں۔ شمع کا گل مقراض سے کاٹتے ہیں، تو اس گل کی رنگینی یعنی روشنی اور شمع ہوتی ہے۔

”بد طینتے اگر سپرد راہ غفلتے

خوباں ز کف عنان تحمل چرا دہند“

اگر کسی بد طینت نے غفلت کی روش اختیار کرتے ہوئے کوئی ناشائستہ

کلمہ کہہ بھی دیا تو نیک سیرت اور خوب سرشت عنان تحمل ہاتھ سے یکوں دیں۔

خان دوراں کے فرستادہ کی زبانی عرض سن کر شاہ صاحب چپیں بھی ہیں ہوئے

اور فرمایا کہ میں مدح و ذم کے تاثرات سے بالاتر ہوں۔ اگر کسی ہرزہ گو نے مجھے برا کہا تو کیا لیکن حقرا کی غیرت کا تقاضا کچھ اور ہے فی الحال بارگاہِ قضا سے یہ حکم صادر ہو چکا ہے کہ اس بے ایمان کی جان اسی بدستی میں قبض کی جائے۔

شاہ صاحب یہ باتیں کر رہے تھے کزبر آئی کہ اس بے ادب کی زبان بند تھی طبعیوں نے ایک قدر مے اس کے منہ میں اندیلا کہ شاید اس کی حرارت سے نقوہ کے شکنجے سے گلو خلاصی ہو لیکن یہ عمل بھی مؤثر ثابت نہ ہوا۔ اس کا گلا بند ہو گیا اور غرغر کرتا ہوا ہلاک ہوا۔

شاہ صاحب نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جب کوئی حاکم کسی مملکت پر مامور ہوتا ہے اس کا اولیٰ فرض یہ ہے کہ وہ اہل فساد کا قلع قمع کرے تاکہ امن قائم ہو۔ آج ان ممالک کا اختیار میرے قبضہ تصرف میں دیا گیا ہے، اگر اس طرح تادیب نہ کی جائے تو نسقِ آداب حق شناسی کا نظم و نظام بھی درہم برہم ہو جائے۔

اس واقعہ عبرت نما کے ظہور کے بعد شاہ صاحب کی محفلِ قدس میں حکیم طاہر گیلانی بھی باریاب ہوا۔ بات کرتے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ موزوں طبیعت کلماتِ سنجیدہ میزان و قار میں گو ہر فرد شکی کرتی تھی۔ شاہ صاحب کی اس کے حال پر زیادہ توجہ ہوئی۔ ایک دن فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ تیرا باطن بھی تیرے ظاہر کی رنگینی سے متصف اور تیرا اعتقاد بھی تیرے صفائی کلام کے ہم رتبہ ہو۔ اگرچہ تا حال اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا لیکن جو امر ہوتا ہے وہ مقررہ وقت پر ہی ظہور میں آتا ہے۔

تا شاہد قبول نصیب کنار کیست	ما و تو جملہ منتظر فضل و رحمتیم
تا جلوہ ماہل چمن انتظار کیست	در ہر بساط آئینہ ہادہم چیدہ است
بر رشحہ سحاب کرم اختیار کیست	از سبزہ ماہنہال جگر تشنہ اندلیک

تیسرے روز حسب معمول مجلس گرم تھی کہ کسی نے کہا کہ حکیم طاہر بحران سودا میں مبتلا ہو گیا۔ اور آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے، اور آپ کی قدم بوسی کے لئے بے قرار ہے۔

اگر اجازت ہو تو یہاں لائیں۔ شاہ صاحب نے مرزا ظریف اور مجھے بیمار پڑسی کیلئے بھیجا، لیکن ساتھ ہی تاکید فرمایا کہ اگر یہاں آنا چاہے تو ہرگز ساتھ نہ لانا اور کہہ دینا کہ دو روز اور صبر کرے ارادہ الہی کے مطابق میں ہدایت اسی طریق سے کروں گا۔ اور آپ ہی یہاں لاؤں گا۔ قصہ جب ہم بیمار کے سرے پہنچے تو اس کی گریہ و زاری سو قدم پیشتر استقبال کے لئے آئی۔ ہم نے خیر و عافیت دریافت کی، تو کہا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ بات کہنے کی نہیں مگر آپ آں جناب کے محرموں میں سے ہیں۔ آپ سے کیا چھپاؤں بات یہ ہے کہ عرصہ ہوا امیر والد حکیم نور الدین فوت ہو گیا۔ اور اسی کلفت خازن کے پائیں باغ کے صحن میں مدفون ہے۔ حقوق پدری کا تقاضہ ہے کہ میں فاتحہ خوانی کے بہانہ زیارت کے لئے جایا کرتا ہوں، جس روز شاہ صاحب سے رخصت ہو کر گھر آیا، حسب معمول شام کے وقت فاتحہ کے لئے گیا۔ معاً بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ قبر سے ایک عفریت کی صورت نے سر نکالا، جب غور سے دیکھا، کچھ نظر آیا۔ رات کا وقت تھا، میں وحشت زدہ ہو گیا۔

در دل شب چارہ از وحشت نداید کس لوح سود ایک قلم منقوش اوہام است و بس
سایہ خود ہم سیاہی گر کند بنی دہم نیست خاصہ ہر گہ سایہ آفاق گیرد پیش و پس
میں نے چاہا کہ لوٹ جاؤں ناگاہ خرس نے فریاد شروع کی کہ ”اے طاہر میں نور الدین تیرا باپ ہوں مجھ سے کیوں ڈرتا ہے، میری مثالی صورت سے تو عبرت حاصل کر۔ یہ سب کچھ ان گناہوں کا نتیجہ جھگت رہا ہوں کہ اپنا باطل مذہب عبادت سمجھتا رہا، یہ عذاب جس میں تو مجھے مبتلا دیکھتا ہے یوم قیامت کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ جس کا انتظار کر رہا ہوں، جو مجھ پر گذر رہی ہے کسی دشمن کے نصیب نہ ہواد۔ جو میں دیکھ رہا ہوں کوئی کافر بھی نہ دیکھے، میں جسے ایسا سمجھتا رہا کفر تھا۔

کرد خرسے کہ دین رفض ایجاد مرکز صد ہزار نفریں باد
ہالات دیکھ سن کر میرے حواس بجا نہ رہے۔ بے ہوش ہو کر گرا، مجھے یہاں اٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جس طرف نظر کرتا ہوں وہی نقشہ روبرو

ہے، آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان اسرار کا کشف جو مجھ پر ہوا محض حضرت شاہ صاحب کی توجہ کا اثر ہے۔ اگر اسی حالت کش مکش میں مر جاؤں تو کیا ہو گا۔ خدا را شاہ صاحب کی خدمت میں میرا حال زار بیان کریں۔ میری ہزار بار توبہ، افسوس صد افسوس۔

فرست از کف رفت دل کارے نکد افسوس عمر

کارواں بگذشت و من در خواب غفلت وائی من

میں نے کہا کہ شاہ صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ دو روز اور صبر کرو، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ تمہاری عاقبت محمود ہے، غرض ہر طرح تسلی ہمیز باتیں کیں اور رخصت ہو کر شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور تمام حالات عرض کئے۔ تیسرے روز صبح کا وقت تھا، دوست و ظائف سے فارغ ہو چکے تھے کہ حکیم طاہر کی آمد کا شور ہوا۔ جونہی شاہ صاحب پر نظر پڑی، نعرہ مار کر قدموں پر گرا۔ شاہ صاحب نے اٹھایا اور بغل گیر ہوئے۔ اور کمال لطف سے اپنے سامنے بٹھایا۔ اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ابیات زبان مبارک سے فرمائے۔

باجام جہاں نمائے ذاتیم مالا دئی عالم صفاتیم
کو مردہ بیا کہ روح بخشیم کو تشنہ در آ کہ فراتیم

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیض عام ہے۔ بندہ خواہ کتنا ہی گنہگار ہو ایک آہ ندامت سے غفلت کی گرہ کھل جاتی ہے، جہاں اس کا فضل کار فرما ہے وہاں گناہوں کی حقیقت ہی کیا ہے خوش ہو کہ تیری ندامت اشک نے تمام سیاہ کاری کے نقش مٹا دیے اور تیری توبہ ”مردہ ساز محض رستگاری ہے۔ اس کے بعد اپنی دستار حکیم کے سر پر رکھی، ہر طرف سے نوائے مبارک باد و مرجا بلند ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد حکیم نے شاہ صاحب کے قدم چومے اور کہا کہ اس عطیہ کا شکریہ ہزار گانہ سے کم نہیں، ایک دو سانس جو میری زندگی کے باقی ہیں اجازت دیں کہ اپنی منزل گاہ پر جا کر دو گانہ اخلاص ادا کروں۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا

کہ ایسے کار خیر میں تاخیر نہ چاہئے۔ یا ران محفل میں سے بعض حکیم کو گھر تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ ابھی چند قدم واپس لوٹے تھے کہ چپ وزاس سے شور مٹھا اور معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد حکیم کا ”لغش جبین بسجدۂ ابدی پیوست“ تمام اجاب شاہ صاحب کی معیت میں نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے سپرد خاک کیا۔

ہم چوانخوان عمر باور بند غفلت کرد صرف یوسفی در جلوہ آمد تا بروں از چاہ شد
در دپیداکن کہ این دریا سرا سر برہم است نیست محروم اجابت گر خموشی آہ شد
شوتخی نظارہ بود افسون طراز ما و من چون مرہ آمد بہم افسانہ ہا کوتاہ شد
بیتدل اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رافضیوں کے عقائد پر تنقید کرتا ہے کہ

”ستم می پرورد آغوش گل از خار پروردن

ز بانے را کرد کار درو آید بہ سب مکشا“

”دوستی و رخصتہ برائے معصومین ظلمے ست صریح، و لاف حسب ایں طایفہ
با آن تقدس نسبتاں تہمتے ست قبیح، کہ ہر گاہ دم از حب می زند نفس ہا
تو ام بہ بغض می بالہ، و تا صرف ہر بر زبان می آرند، معنی مترادف
حسد می نالد، فحش در چہ مذہب از شعبہ ہائی عصمت ست و تا سزاوار
کدام ملت سزاوار ستائش غفلت، می گویند تو لائی عمروئی تبرائی زید
صورت نمی بندد، اما نفہیدہ اند کہ اتفاق ایں دو تخیل در یک محل چہل
فطرت می خندد، ترا از غیر محبوب فراموشی می خواہد نہ بر خیال اضداد
سرگوشی، پس محبت با عداوت جمع کردن، برق در مزرع آگاہی
کا شتن اشت، و زنگار در آئینہ پروردن ستم بر حقیقت صفا جائز
داشتن“

مفہوم اس عبارت کا یہ ہے کہ اجتماع ضدین محال ہے۔ حب و بغض اضداد ہیں اور ایک وقت ایک ہی محل میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ ائمہ معصومین کے بارہ میں

لاف حب بھی ہو اور اصحاب رسول کریمؐ سے بغض بھی ہو ایک دل میں کیسے جمع ہوں مناسب تو یہ ہے کہ ماسویٰ محبوب جو کچھ بھی ہو بھول جائے نہ کہ غیر محبوب سے سرگوشی جاری رہے اور محبوب سے بھی دعوئے محبت ہو۔ اس محبت اور عداوت کو جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے برق کو خرمن میں پرورش کرنا یا آئینہ کو زنگار آلودہ کرنا اور پھر اس کی صفائی پر فخر کرنا۔ علاوہ ازیں کس ملت اور کیش میں کسی کو ایسے الفاظ ناشائستہ سے یاد کرنا جائز ہے، بدی بدی ہے اور نیکی نیکی نہ بدی نیکی اور نہ نیکی بدی ہو سکتی ہے، اگر ایک شخص بد کلام ہے تو اس کو خوش کلام نہیں کہیں گے جس کے دل میں بغض، حسد اور کینہ کے جذبات ہیں اور وہی زبان پر بھی آتے ہیں۔ ایسا دل اور زبان گندی ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ وہ وقت جو سب و شتم میں صرف ہوتا ہے کاش درود حسنینؑ پر صرف ہوتا۔ جس کا کچھ اجر بھی ملتا۔

ستمی پرورد آغوش گل از خار پروردن
زبانے را کنز و کار درود آید بہ سب مکشا

سعدی کہتا ہے :-

شنیدم کہ مردان را و خدا دل دشمنان ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام کہ باد و ستانت خلافاست جنگ

بہر حال اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ سنی اور شیعہ کے جھگڑوں نے مسلمانوں کو اس حد تک نقصان پہنچایا کہ یہ تنزل میں آ رہے اور نامسلمان ان پر مسلط ہو گئے۔ مدح اور سب صحابہ سے تو صحابہ بے خبر ہیں اور نہ ایسی باتوں سے تلافی یافت ہو سکتی ہے، بیدل نے ایک رباعی میں شیعہ اور سنی کے عقائد سے الگ ہو کر ایک بات ایسی کہی ہے کہ اس لائق ہے کہ آپ زہر سے لکھی جائے۔

ہر سانحہ کہ شد بافساد دلیل بیکاری خلق اور است کفیل

موسیٰ تا ہنوز می شکافد دریا فرعون تا حال غوطہ خورد بہ نیل

جس واقعہ یا حادثہ میں افسانوی پہلو نکلتا ہو یا پیدا کیا جاسکے بیکار لوگ اس کو

اپنا لیتے ہیں۔ نہ صرف اس میں رنگ آمیزی اور مبالغہ کرتے ہیں بلکہ گڑبی مغل اور اور مجلس آرائی اسی میں سمجھتے ہیں کہ انھیں بار بار دہرایا جائے۔ موسیقی اور فرعون کا واقعہ تاریخی ہے جو ایک دفعہ رونما ہوا اور گزر گیا اولیٰ الابصار کے لئے درس عبرت چھوڑ گیا۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ اس کا تکرار ہر ایک زمانہ میں کیا جائے۔ سوائے اس کے واعظان شہر کو اور کچھ مطلوب نہیں کہ اسے افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہوئے اپنی محفل گرم کریں۔

”علیٰ راسرگزشت رفتگاں از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست“

کسی زمانہ میں بے فکرے امیر جو تمام دن بیکاری کی وجہ سے رات آرام سے سو بھی نہ سکتے تھے ان کا محبوب مشغلہ تفریح ہی تھا۔ رات پتنگ پر لیٹے اور قصہ خوان حسب معمول حاضر ہو گیا، اس نے داستان امیر حمزہ شروع کر دی اور نواب حسب کو سلا دیا۔ اس لئے علم ادب میں قصہ اور خواب نے ایک تلمیح کی حیثیت اختیار کر لی، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بیدل کہتا ہے کہ جو حضرات گزر گئے اپنے اپنے وقت اچھا یا بُرا جو کچھ بھی کام کیا کر گئے۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہم اپنے زمانہ کے حالات سے نپٹیں، یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ :-

”یکے نیمہ از عمر خود کم کنم ۛ جہانے پُر از نام رستم کنم“ (دردوسی)

اپنا وقت عزیز ”سرگزشت رفتگاں“ کو دہراتے دہراتے ضائع کریں جس کا

فائدہ ان کو بھی نہیں جن کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ حافظ نے کیا اچھا کہا ہے کہ

عیب رنداں مکن از یاد پاکیزہ سرشت کہ گناہ و گریہ تو نخواستہ است

من اگر نیکم اگر بد تو بد و خود را باش ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت

کسی کے عیب بیان کرنا اخلاقاً میوہ ہے، اگر کسی نے کوئی گناہ کیا تو اسی کے

نامہ اعمال میں درج ہو گا یہ تو نہ ہو گا کہ اس کا عیب تیرے نامہ اعمال میں لکھا جائے۔

اگر کوئی نیک ہے تو نیکی کا فائدہ اسے ملتا ہے اور اگر کوئی بدی کا مرتکب ہوتا ہے

تو اس کا وبال اس کے اپنے نفس پر جو جیسا ہوئے گا ویسا کاٹے گا۔ تو کسی کو برا کہہ کر خود برا کیوں بنتا ہے؟ تلک امة قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون“ (۱۳)

بیدل اپنا ایک واقعہ خواب بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی مجلس میں اہل علم و فضل بیٹھے ہوئے تھے اور مسئلہ ”جیا“ پر گفتگو ہو رہی تھی۔

برنگے سخن در جیامی گذشت کہ شبنم ز روئے ہوامی گذشت
دل از سینہ تالاب عرق گشتہ بود گداز نفس در طبق کردہ بود
بیاں بسکہ تعلیم آداب داشت نگہ پرزدن در رگ خواب داشت

شاہ صاحب کا معمول تھا کہ جب کوئی ایسا موضوع زیر بحث ہوتا تو میری طرف اشارہ فرماتے کہ ہاں تم بھی کہو تمہارے خیال میں کیا آتا ہے۔ میں کوئی شعر یا نکتہ موزوں مناسب مقام عرض کرتا جس سے حضار مجلس بھی محفوظ ہوتے۔ حسب معمول شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیرے خیال میں کیا آتا ہے، میں نے عرض کیا

”جیا خواندم نگہ در گرد خط ماند

ادب کردم رقم خط در نقط ماند“

یہ تو خواب کا معاملہ تھا۔ چند روز گزر گئے۔ ایک روز شاہ صاحب کی مجلس میں ”تذکرة الاولیاء“ پڑھا جا رہا تھا کہ ایک شخص بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آیا۔ اور باتوں باتوں میں مسئلہ ”جیا“ کی بابت استفسار کیا، پیر بسطام نے جو کچھ جواب دیا پڑھ کر مجھے تامل ہوا کہ یہ جواب کس عنوان سے رنگ عبارت اختیار کرتا ہے، شاہ صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ صحیح تو وہی ہے جو تو نے اس رات نظم میں کہا تھا لیکن طریق بیان میں اشارات بہت ہیں اور بے حرف و صوت عبارات بے شمار۔

دانا نہ ہیں صوتِ صدامی گوید اکثر بہ اشارات و ادا می گوید

بے کام و زباں ہزار حرف است اینجا آئینہ برئے تو چہا می گوید

بیتدل

ملائی دل کو دل سے ہے براہ راست خاموشی
جو محرم ہیں زباں کے وہ نگہ سے کام لیتے ہیں (مؤلف)

بیتدل نے اس واقعہ کے تحت ”کشف“ پر لطیف بحث کی ہے، ہمارے زمانہ میں اب تو نفسیات کے عالم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ”دل را بدل رہیت دریں گنبد سپہر“ کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور اسے ”شلی پیتی“ وغیرہ اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسے واقعات جن کا تذکرہ بیتدل کرتا ہے،

۱۸۸۵ء میں انگلستان میں چند نامور حکماء نے ایک انجمن کی طرح ڈالی۔ اس کا نام ”سوسائٹی فار سائیکیکل ریسرچ“ (تھا)

ان مشاہیر میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ سر ولیم ہیرٹ

۲۔ پروفیسر سجویک

۳۔ ایف۔ ڈبلیو۔ ایچ، مارٹس

۴۔ ایڈمنڈ برگے

۵۔ سر ولیم کروکس

۶۔ سر ادیور لاج

۷۔ جے۔ آر تھرہل

ان حکماء کی غرض یہ تھی کہ یہ جو لوگ دعوائے کیتے ہیں کہ ہم روحوں سے باتیں کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک حکیم مستند عالم کسی نہ کسی علم کا ہے، اور صاحب تصنیف بھی ہے سوسائٹی نے کچھ سوالات مرتب کئے اور یورپ اور امریکہ میں شائع کئے۔ ان سوالات میں ہر ایک شخص کو دعوت دی گئی تھی کہ روحوں کے بارے میں اپنا مشاہدہ بیان کرے۔ جو جوابات موصول ہوئے ان کو ترتیب دے کر کئی جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ان پر تبصرہ ”مسٹر بل“ نے لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”میرا مذہب نہ تو روحانیت ہے اور نہ ادبیات اور نہ مجھے علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے“

حکماء یورپ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ تا حال کسی علم سے جو آج تک معلوم ہو چکے ہیں ان کی توجیہ نہیں ہوتی۔ اس لئے یا تو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ روحانیات کی دنیا مادیات سے الگ ہے اور اس کے قوانین بھی ملاحظہ میں جن کا علم ہمیں نہیں۔ یا یہ بھی مادہ ہی کے خواص اور آثار ہیں بہر حال جو کچھ بھی ہے ہم اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔ اور محض عدم واقفیت کوئی دلیل انکار کی نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) بھی کہ نہیں۔ لیکن سوسائٹی کی روئداد سے یہ ناقابل انکار حقیقت اتنی ضرور واضح ہوتی ہے کہ کچھ تو ہے اور واقعات بتینہ کی توجیہ اس وقت تک کسی علم کی شاخ سے نہیں ہوتی مگر بعض واقعات ایسے ثقہ لوگوں نے بیان کئے جن کی نسبت یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دیہہ دانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ شاید ذہنی ارتقاء کے ساتھ کسی آئندہ زمانہ میں اس کی توجیہ تسلی بخش ہو جائے۔ ان میں سے دو باتیں ایسی ہیں جن کو حکماء نے تسلیم کر لیا ہے۔ ایک ”ٹیلی پتھی“ (

اور دوسری ”سب ہینل سلف“) آخر الذکر دو لفظوں سے مرکب ہے ”سب“ بمعنی ”نخت“ اور ”لین“ بمعنی ”دبیر یا آستانہ“ اس کو تحت الشعور کہہ سکتے ہیں، اول الذکر کی مثال یہ ہے کہ آپ کا کوئی عزیز یا دوست آپ سے ہزاروں میل فاصلہ پر رہتا ہے، کسی خاص تاریخ اور وقت پر آپ اس کو ایک خاص پوشش اور وضع میں خواب میں دیکھتے ہیں ایک خاص حادثہ آپ اس پر سے گذرتا ہوا دیکھتے ہیں یا وہ یہ حادثہ آپ سے بیان کر رہا ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور اسی وقت اور اسی مشاہدہ شدہ پوشش وغیرہ میں یہ حادثہ من وعین اس پر واقع ہوا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور آپ کے وہم و گمان میں بھی عزیز یا دوست کا خیال نہیں، لیکن عین بیداری میں یہ آپ کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ آپ خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور وہ صورت غائب ہو جاتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ اور وقت پر آپ کا عزیز یا دوست رحلت کر گیا۔

تحت الشعور کے ضمن میں جو کچھ سطر علی نے لکھا ہے وہ ہمارے زمانہ میں علم نفسیات کا موضوع ہے، تجزیہ نفسیات پر ”فرؤیدے“ نے بہت بحث کی ہے مگر یہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰ کے نیچے)

بیدل لکھتا ہے کہ :-

”آگاہی صاحب دلال از احوال بنا بر آنست کہ اجزائی کب بے غبار
موانع پیوستہ در یک دیگر می جوشند، و غفلت مقیدان بعلت این کہ
عنصر سنگ جن بحجاب و انزوگی نمی کوشد، اگر یکسر آب حرکت دہند
بسر اسر روئے دریا میدود، و اگر ہزار سنگ بر ہم کو بند پہلو یا متاثر
جنبشے نمی شود، آئینہ داران معنی صفا اگر ادا بطن کدورت طینتاں
نیز اسرار واکشند بعید نیست، زیرا کہ جو ہر آب بقوت لطافت ہم سیاح
ساحت ہواست، و ہم غواص طبیعت خارا، در خانہ کہ آئینہ نصب
کرده باشند، ہر چہ در آن خانہ جلوہ نماید این جاثر نیست، و آنچه در
آنجا بعرض آید دریں مقام متجلی“

”اسمائی ظہور با ننگ قوس دل است اشیا ہمہ اعتبار محسوس دل است“
”ہرزہ دریں دشت چراغے دارد یعنی این جملہ چشم جاسوس دل است“
”ہر چند آئینہ کمال این طائفہ حکم وار شکی مثال گذاراست، و آبیں
چشمہ ہائی استغنا از بلند و پست امواج بے نیاز، اما جو ہر صفائی
آں بالطبع در امتناع احوال خلایق ناچار است، و در انشائی،
رموز مستتر بے اختیار“

”آئینہ آہن ہم و گر نور صفاست عکس صورا ست آنچه کہ در عے پیدا است“
”بیدل تو ہمیں بصیقل دل پرداز کایں آئینہ چوں صاف شد اندیشہ نماست“

(بقیہ حاشیہ ص ۴۹) علم ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے وہ لکھتا ہے کہ تحت الشعور ہماری قوت ارادی بھی کم کتنی
ہے اور ہم غفلت بھی بن جاتے ہیں۔ تحت الشعور ہم پر ایسے اہم انگشتا فات ہوتے ہیں جو بیداری میں
باہم ذہنی کاوش نہیں ہوتے بیداری میں خواہ کتنی ”آمد“ ہو ”آورد“ سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن تحت
الشعور آمد ہی آمد ہے۔ ایک شاعر تحت الشعور اسی طرح شعر موزوں کرتا چلا جائیگا جس طرح بیداری
میں بے تکلف گفتگو کرتا ہے۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل دل کا تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب اس درجہ تک ہوتا ہے کہ جو کچھ آئینہ کے سامنے آئے اس کی صورت بعینہ اس میں رونما ہوتی ہے، اگرچہ ان حضرات کی وارستگی اور استغنا اس سے بالاتر ہے کہ لوگوں کے دلوں کے پوشیدہ حالات دریافت کریں لیکن ان کے آئینہ دل کی صفائی بالطبع بلا ارادہ ان حالات سے آگاہ ہوتی ہے جیسے آئینہ میں ہر ایک صورت جو بھی رد و برد ہو نظر آتی ہے۔ اسی طرح آئینہ قلب جب صاف ہو ”اندیشہ نما“ ہوتا ہے یعنی دوسروں کے خیالات کا عکس اس پر پڑتا ہے، اس ضمن میں بیکل نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صاحبِ دل کی مجلس میں چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے، حاضرین میں سے ایک کے دل میں یہ آیا کہ اگر یہ بزرگ صاحبِ کشف ہے تو میری خواہش انگور ہے ضرور عطا فرمائیں گا۔ صاحبِ دل نے انگور منگوائے اور پیش کئے حاضرین کے دل میں یہ خیال آیا کہ مجمع میں اور آدمی بھی تو تھے صرف اسی ایک کے حال پر اتنی توجہ کیوں ہے، یہ وسوسہ بھی صاحبِ دل پر منکشف ہوا۔ فرمایا کہ اس شخص کے دل میں رغبت انگور تھی اور دل ہی دل میں چٹخارے لے رہا تھا، یہی کیفیت میرے دل میں بھی پیدا ہوئی۔ وقوعِ این حرکت بمثال شخص مقابل است، نہ از خواہش ہائی آئینہ صافی منزل، ایں جامعے کہ یہ بساط بے طلبی آرمیدہ اند، ارادہ دیگران را مراد خود نمیدہ، کشفِ قلوب از معنی ہائی ایں عبارت ست و اشراق ضائر از مضامین ایں استعارت است۔“ جسے کشفِ قلوب کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ اہل دل کا آئینہ قلب خود تو صورتیں پیدا نہیں کرتا جو شے رد و برد ہو اسی کی صورت ہوگی۔ اور یہ صورت اس شخص کی خواہشات اور ارادہ کی ہوگی جو مقابل ہے۔ بہر حال کشفِ احوال خواہ ارادتاً ہو یا بلا ارادہ تصفیہ قلب پر موقوف ہے اور یہ تقویٰ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اہل دل کی مثال پانی کی ہے کہ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان میں لطافت اس درجہ ہے کہ ہر ایک شے میں خواہ ہوا ہو یا جمادات نفوذ کرتے ہیں۔ جو لوگ اہل غفلت ہیں ان کی مثال چھری سی ہے کہ شے سے مس نہیں ہوتے لیکن پانی کو ایک سرے سے حرکت دیا

تو تمام اجزا متحرک ہوتے ہیں جو اہل صفا ہیں نہ صرف اہل صفا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ جو کدورت طینت لوگ ہیں ان کے باطن سے بھی باخبر ہوتے ہیں کیونکہ پانی، ہوا اور جمادات میں یکساں نفوذ کرتا ہے، مزید بحث مناسب مقام پر کی جائیگی۔ ۱۰۸۳ھ کا واقعہ ہے، بیدل دہلی میں تھا۔ ایک رات شاہ صاحب کو خواب میں دیکھا، اس حالت میں کہ پانی کا پیالہ بیدل کے ہاتھ میں تھا، دل میں آیا کہ پنی جاؤں، آئین ادب و حیا نے پسند نہ کیا اس لئے پیالہ شاہ صاحب کے پیش کیا۔ آپ بے تکلف پنی گئے۔

دوسری رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ کہ شاہ صاحب کے ہاتھ میں ساغر ہے اور شیشہ بخل میں، جس طرح مست ایک دوسرے کو پلاتے ہیں شاہ صاحب نے ساغر میرے پیش کیا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ ”اٹھو اور آں محفل عصمت از آرائش و مینا معرا، واد ضاع آں انجن تمکین از تہمت اسباب بے اعتدالی میرا“، لیکن بحکم تسلیم میں نے قدح پتہ کیا اور پیش کیا، فرمایا کہ میرا دور پیمانہ کل رات ختم ہو گیا۔ اتنا اب تیری قسمت ہے جو تجھے دے رہا ہوں۔ بعد ازیں سرخوش قدح پچائی شوق میباش، و دماغ اندیشہ بخار ہائی کدورت مخراش“

”سیراں میکدہ ہنگامہ دورے دارد ہوش ہر کس قدم جادہ طورے دارد“
 ”ما گذشتیم ازیں ورطہ تو خود را در یاب ہر گریباں سر کیفیت غورے دارد“
 ساقی اصرار نے چند ساغر پے در پے دئے، اسی عالم قدس میں میرے پاؤں مستوں کی طرح لڑکھڑانے لگے چنانچہ آج تک یہ نشہ نہیں اُترا۔

ان دو واقعات سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شہسوار میدانِ عزت اس وادی امکان کے غبار سے گزر گیا۔ تیسری رات عالم رؤیا میں مشاہدہ کیا کہ چند نورانی صورتیں جمع ہیں، میں داخل ہوا تو سب مجھے کہنے لگے کیا ہی اچھا ہوا اگر شاہ صاحب کی رحلت کی تاریخ کہو میں نے فوراً کہا:

”زبی تعینی ذات“ رفت نام ”صنت“ ۱۰۸۳ھ
 ۱۶۵۲

سن کر وجد میں آگئے اور کہا کہ الحق اس سے بڑھ کر لطیف تاریخ نہیں ہو سکتی، میں بیدار ہوا تو یہ مصرع صفحہ خیال پر نقش تھا: ظاہر الفاظ شمار کئے تو تحقیق واقعہ درست نہ تھی، ذرا غور کیا تو بطریق تعبیہ حساب اعداد موافق سال درست تھے۔ ”بی تعینی ذات“ کے اعداد ۱۶۵۳ ہیں اور ان میں سے صفت کے اعداد ۵۷۰ منفی کئے تو ۱۰۸۳ ہے۔

یہ واقعہ تو خواب میں رونما ہوا۔ چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اوڈیسہ میں کوئی خبر نہ ملی، حیران تھا۔ کبھی یہ شبہ گذرنا کہ شاید یہ محض وہم و خیال ہو۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات میں وہم و عقل سے زیادہ پیش میں ہوتا ہے یعنی عواقب امور میں باہمہ شکوک زیادہ صاحب یقین ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی خیال آتا کہ ایک عمر ہم درس ملہم اسرار رہا ہوں اس قسم کی معانی کا وارد ہونا عالم خطا سے نہیں ہو سکتا۔ اور ایسے مضمون کا ظہور عبارت لغو نہیں ہو سکتی۔ آخر الامر چند دوست اوڈیسہ کی طرف سے آئے اور شاہ صاحب کی رحلت انہی ایام میں تحقیق ہوئی ناچار میں نے تاریخ پر چند مصرعے اور کہے :

شہ سر پر یقین قاسم ہوا الہی	کہ داشت ذات حقش ملک انتظام صفت
دماغ ہمت عنقائش رسائی کر د	پرے فشاند ز آشوب گاہ دام صفت
حضور ذات ے شوق و حدش پیوود	تغافلے زدو برہم شکست جام صفت
بعافیت کدہ غیب بردشع شہود	رساند تا احدیت پے خرام صفت
ز سالی واقعہ اش یخودی بگو شمع گفت	ز بی تعینی ذات رفت نام صفت

یاد رہے کہ بیدل جیسا کہ ہم مناسب مقام پر واضح کریں گے ”ذات بحث“ کو

منزہ از اسما و صفات کہتا ہے، یعنی ذات کسی نام یا صفت سے متعین یا مشخص نہیں ہو سکتی وہ بے تعین ہے، لیکن اسما و صفات جن سے ہم ذات کو معین اور مشخص کرتے ہیں یہ تعلق کائنات سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بحیثیت ذات بے تعین منزہ از صفات ہے اور بہ تعلق کائنات صفات سے مشخص ہوتا ہے، ذات

”ایمپرنل“ اور صفات ”پرنس“ ہے متکلمین نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے۔ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے۔

شاہ کابل | بیدل لکھتا ہے کہ میں اوڑیسہ تھا۔ ایک رات عالم افکار و غلبہ وجد میں بے اختیار یہ شعر میری زبان پر جاری ہو گیا۔

”از ہرچہ سرا میت فرونی خود گوئی چہ گویت کہ چونی“
مصرع اولی کا مفہوم دہی کچھ ہے جوشنخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ :

ای برتر از خیال و قیاس گمان و وہم دز ہرچہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بیایاں رسید عمر ما پہچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم
مصرع ثانی میں بیدل نے ایک بات پیدا کی ہے کہ جب یہ مسلم ہے کہ جو کچھ
میں تیری حمد و ثنا میں کہوں تو اس سے بالاتر ہے تو یہ جاننے کے لئے کہ تو کیا ہے
تیرے سوا اور کون بتا سکتا ہے، تو ہی اپنے آپ کو جانتے ہے، غرض میں اس شعر کو
حالت وجد میں تکرار کرتا رہا یہاں تک کہ مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی ناگاہ الہام
کہہ بے حرف و صوت سے یہ ندا سنی :

”از ما با ماست ہرچہ گویم ما پھو توئی دگر چہ گویم“
اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک شخص اپنے آپ کو جانتا
ہے دوسرا شخص جو اس کا غیر ہے نہیں جان سکتا جب تک عین وہی شخص نہ
بن جائے۔ اس لئے جو کچھ میں اپنی نسبت کہوں وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں کوئی اور
نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن بیدل نے اس شعر کی شرح خود ہی اس کے بعد ایک غزل میں
کی ہے کہ :

”من آں شوقم کہ خود را در غبارِ خویش می جویم“

رہے دہ جیب منزل کردہ ام ایجاد و می پویم“

میں وہ شوق ہوں کہ اپنے آپ کو نہ کہ کسی غیر کو اپنے ہی غبار میں ڈھونڈھ
رہا ہوں، منزل کی جیب میں ایک راستہ ایجاد کیا ہے اور اسی پر چل رہا ہوں۔

یعنی جادہ و منزل دونوں میں آپ ہی ہوں یا دونوں مجھ سے باہر نہیں ہیں :

”بروں از رنگ و بو طرح بہار حیرتے دارم

دماغے می کشم درخون، گل تحقیق می بویم“

بہار کی رنگینی تو محسوس ہوتی ہے مگر میں اس عالم رنگ و بو سے باہر طرح

بہار حیرت رکھتا ہوں، خون سے دماغ رنگین کر رہا ہوں اور ”گل تحقیق“ پیدا

کرتا ہوں، یعنی محسوسات سے جو صرف صوتیں ہیں الگ ہو کر میں اس حقیقت کی

تلاش میں ہوں جو ان صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔

”نگہ درویدہ می دزدم خیالے نقش می بندم

نفس در سینہ می کارم ہجوم نالہ می رویم“

میں نے نگاہ آنکھ کے پردہ میں چھپالی یعنی محسوسات کو نظر انداز کرتے

ہوئے اپنے باطن کی سیر کر رہا ہوں، میرا سانس بیرونی ہوا سے بے نیاز ہو کر

میرے سینہ ہی میں سرگرم عمل ہے اور ”ہجوم نالہ“ پیدا کر رہا ہے۔ یعنی میں عالم

تشبیہ یا محسوسات خارجی کے اسباب سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر اپنے

ہی دل میں وہ بات مشاہدہ کر رہا ہوں جو اصل حقیقت عالم شہادت کی ہے جسے

غیب کہتے ہیں۔ اور منزہ اسما و صفات سے ہے۔

”حدیث غیر تنزیہ دماغسم بر نمیدارد

زبان وحدتم حرفے برائے خویش می گویم“

تنزیہ کے سوا کسی بات کی برداشت میرے ذہن کو نہیں، میں وحدت

کی زبان ہوں، خود ہی کہتا اور خود ہی سنتا ہوں۔

”بچندیں اختلاف صورت ومعنی من بیدل

جزا و دیگر چہ خواہم وانمود آئینہ اویم“

کائنات عالم کثرت ہے اس میں جتنی صورتیں اتنے ہی معانی بھی ہیں لیکن

باہر اختلاف میں بیدل، حقیقت نما آئینہ ہوں جس میں اگرچہ صورتوں کی کثرت

جلوہ گرہے مگزن میں حقیقت ایک ”وحدت“ ہے میں چونکہ اسی وحدت کا آئینہ ہوں اس لئے اسی حقیقت کو جلوہ دیتا ہوں، ”ما بھو توئی دگر چہ گویم“ آئینہ میں بھی وہی صورت حقیقت ہے جو آئینہ کے مقابل ہے، اس موضوع پر بیدل نے دادِ تحقیق اکثر اشعار میں دی ہے، مناسب مقام پر تشریح کی جائے گی۔

۱۰۷۶ھ کا واقعہ ہے کہ بیدل دہلی میں چند دوستوں کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجذوبوں کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک نے کہا کہ ان دنوں ایک مجذوب آیا ہوا ہے اس کا عجیب حال ہے۔ میروں کھالے پیٹنے کی چیزیں بے تکلف ہضم کر جاتا ہے اور اگر کچھ نہ لے تو کئی ہفتے بے آب و نان پڑا رہتا ہے، کسی سے بات نہیں کرتا، جب کبھی زیارت کے لئے جانا ہوتا ہے اکثر اوقات لمبی تالے سویا ہوا پایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسے کابل میں دیکھا اس لئے آپ کو شاہ کابلی کہتے ہیں:

اے نشہ غیب فارغ از عرض ظہور از بسک تعینے ندارد منظور

جائے ہمہ ہوش است ندارد خبر در جائے دگر بے خبر و جملہ شعور

وہ خود تو کسی سے بات کرتے نہیں اس لئے آپ کا نام وحسب و نسب کیسے معلوم ہو۔ اب شاہ کابلی لوگوں نے نام رکھ دیا اسی نام سے مشہور ہیں:

مارا کہ علم است نہ معلوم شدن نے خواہش منشور نہ منظوم شدن

مضمون ظہوری بخیاں آمدہ است باید بزبان حلق موسوم شدن

اگر غور کیا جائے تو ہر ایک شخص زبانِ خلق ہی سے موسوم ہے۔ خود شناس لاکھوں میں شاید ایک ہو اکثر اپنے آپ کو وہی کچھ سمجھتے ہیں جو لوگوں نے ان کے دماغ میں ٹھونس رکھا ہے۔ اشیاء کا ثبات ہوں یا ذات باری تعالیٰ زبانِ خلق سے ہی موسوم ہیں:

از ہر چہ بگفتہ از کم و بیش نشانے دادہ اند از دیدہ خویش

منزہ ذاتش از چند و چہ و چوں تعالیٰ شانہ عما یقولون

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یک نخت شاہ کابلی نمودار ہوئے۔ سب سر و قد

تنظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ مسکرا رہے تھے اور نگاہ میری جانب ہی تھی، اور میرے ہی پاس بیٹھ گئے۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا، کھانا پنا گیا۔ چند لقمے بھی نہ کھائے اور مجھ بے دست و پا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح شہر کے باہر اس مقام تک لائے جہاں بیٹھا کرتے تھے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں تو ادب و آداب کی وجہ سے چپکا بیٹھا منتظر تھا کہ شاہ صاحب کچھ فرمائیں اور شاہ صاحب خاموش۔

حق خاموش است باتو بصدرنگ گفتگوست شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجوست
موقوف اضطراب اگر نیست عرض راز گرواہی اشارہ تحقیق موبہ مست
ہرگز نظر خطاب کند حرف خامشیت ہر جا بہار ساز شود نفعہ رنگ بوست
عشق است چنگ و غلغل این چنگ مینواست دل شیشہ است و قفل این شیشہ بے گلوست
کثرت حجاب جلوۂ وحدت نمی شود مرگاں بہر چہ باز کنی دیدہ خواوست

نماز عصر سے شام اور شام کے بعد رات کا کچھ حصہ اسی طرح خاموش بیٹھے بیٹھے گزر گیا۔ ناگاہ شاہ صاحب قہقہہ مار کر ہنسے اور وہی بیت جو عالم غیب سے اتر گیا میں نے سنا تھا کہ ”از ما با ماست ہر چہ گوئیم

ما بچو توئی دگر چہ گوئیم“

شاہ صاحب نے پڑھا۔ معائن کر میرے حواس باختہ ہو گئے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا، پوچھا کہ یہ بیت کس کا ہے؟ پھر ہنسے اور کہا کہ میرا ہے۔ اس میں تشبہ کی کونسی بات ہے۔ اتنا کہا اور پاؤں دراز کئے اور کہا کہ ”اے جاکشاؤ چشم غیر از حیرت چیزے ندارد، باید خوابید“

”شور تعمیر ہوس گردد دماغت جستہ نیست گوشہ امنی بغیر از چشم ہر ہم بستہ نیست“
”عاقبت خواہی برفع جرأت نظارہ کوشش ہوئی راحت نیست تا مرگاں ہم بستہ نیست“

یہ بیداری کا کرشمہ ہے کہ ہوس کی عمارت کا شور و شغب دماغ میں بلند ہوتا ہے آنکھیں موندھ لو تو گوشہ امن ہے آرام و آسائش تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب بک سے بک ملی رہے، آنکھیں مٹتی ہوں تو نظارہ کثرت کب میں سے مٹنے دیتا ہے

شاہ صاحب تو سو گئے اور میں وہیں عالم حیرت میں بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ رات آخر ہونے کو تھی مجھ پر بھی خواب کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

شوئے کہ بہ بزمِ بزمِ انسوں کرد آمد بربایاں وحیرتم افسوں کرد
حرفے کہ بہ پردہ خیال می گفت بررو آورده از خودم بیرون کرد
وہ شوخ جو چپکے چپکے مجھ پر جادو کر رہا تھا، بات کی اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، وہ بات جو میرے خیال ہی میں کہی تھی میرے منہ پر کہی اور میں آپے سے باہر ہو گیا۔

صبح ہوئی، آنکھ کھلی، میں تو وہیں تھا، مگر شاہ صاحب موجود نہ تھے، ادھر ادھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے، دہلی کی خاک کئی دن چھانٹا پھر نہ ملے، آخر تھک کر بیٹھ رہا۔
آں جلوہ غیب کایں تیر آراست ونگہ چونکہ ز پیش چشم برخواست
گر گویم خضر بود ترک ادب است آنجا کہ حق است خضر و الیاس کجاست
جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا وہ جلوہ غیب ہی تھا جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، پھر میرے دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ اگر کہوں کہ خضر تھا تو ترک ادب ہے۔ جہاں ”حق“ ہے وہاں خضر و الیاس کا کیا مذکور ہے۔

دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ بیدل کو بھی ایک جگہ چلن نہ تھا۔ موسم گرما کی شدت، آشوب چشم کا عارضہ، ”بند رہا بن“ سے گزر کر شہرِ تھرا میں پہنچا۔ بازار لگا ہوا تھا۔ دوکانوں میں سوائے جنسِ مروت اور متاعِ ناشناسی سب کچھ تھا۔ بیدل چاہتا کہ کہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر سستلے، لیکن کوئی شناسا نہ ملا۔

حضور و عدم تم جز در دل محرم نمی گنجم
چہ سماں داشت یارب شگاہے بسترانی
می بینائی تحقیق بطرف کم نمی گنجم
کہ من در ملک دل ہوں نفس یکدم نمی گنجم
ہشتم گر شود آئینہ چوں آدم نمی گنجم
گہے در مدعیط آغوش یک شبنم نمی گنجم
گے صدا آسمان دچشم موری می کم جولاں

گئے زان رنگ میکا ہم کہ سرد زردہ مید زدم گئے زان شوق می بالم کہ در خود ہم نمی گنجم
 چو گوہر وقت طبعم ہوں افگندہ زیں دریا بخود گنجیدہ ام چندا نکہ در عالم نمی گنجم
 بیدل یگانہ روزگار تھا اس کی یکتائی کسی محرم راز وحدت کی تلاش میں تھی، کہ
 جہاں اس کی گنجائش ہو مینائی تحقیق کی شراب کسی کم طرف میں کہاں رہ سکتی ہے۔ یہ
 وحشت جو میرے جنوں کی شکل و صورت گرد آلود رکھتی ہے اگر بہشت بھی پیش نظر ہو
 تو وہاں بھی آدم خاکی کی طرح میری گنجائش نہیں، کبھی تو ضعیف چوٹی کی آنکھ میں سو
 آسمانوں کو گردش میں لاتا ہوں، اور کبھی سو سمندر بھی ہوں تو ایک قطرہ شبنم کے
 برابر میری ان میں گنجائش نہیں کبھی تو اس وضع سے اتنا حقیر ہوتا ہوں کہ ایک ذرہ
 میں سما سکتا ہوں، کبھی شوق مجھے اتنا بڑا بنا دیتا ہے کہ اپنے آپ میں سما نہیں سکتا۔
 جس طرح دریا موتی کو باہر پھینک دیتا ہے اسی طرح اس بحر ہستی سے میری وقت
 طبع مجھے باہر لے آئی میں اپنے آپ میں اتنا گنجان بن گیا ہوں کہ ایک عالم میں میری
 گنجائش نہیں ہے۔

اتفاقاً ایک رفوگر پر نظر پڑی، جس دوکان پر بیٹھا ہوا سوزن کا ری کر رہا
 تھا اس کا متلع بھی اکیلا تھا۔ نگاہ کی طرح دیدہ و تصور میں غیر کی گنجائش ہی نہ تھی،
 جب تک خود پہلو تہی نہ کرے کسی دوسرے کی اس میں سمائی نہ تھی مگر دیدہ سوزن
 میں رشتہ کی طرح مجھے بھی جگہ دی، اب مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں میں بارِ خاطر
 نہ ہوں، میری گراں جانی اس کے پہلوئے اخلاق میں سوئی کی طرح ٹوٹ کر نہ رہ
 جائے؟

بیک دور روزہ سرو برگ زندگی پسند کہہ بر خلق پے سود خور زیاں باشی
 اگر غبار شومی محو دامن خود یا شش چناں مباش کہ تشویش دیگر ایں باشی
 ابھی ایک ساعت نہ گزری تھی کہ ایک شخص دوکان کے سامنے آیا۔ رفوگر
 کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ اگر تشریف رکھیں مجھے اٹھنے کی عزت بخشیں۔ اس نے
 کہا کہ نہیں یہ دوزمند میرا دوست ہے پرسش احوال چاہتا ہوں میں آنکھیں بند کئے

بیٹھا تھا آواز سے شناسا معلوم ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شاہ کابلی رفوگر کی جگہ بیٹھے مسکرا رہے ہیں، میں آچھل پڑا۔ فرمایا کہ تھوڑی سی دیر سو رہو۔ عالم بخودی عین شعور ہے اور صحبت خواب آئینہ حضور، میں نے آنکھیں بند کیں اور زمیند کا غلبہ اتنا ہوا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو وہی دوکان اور وہی رفوگر، شاہ کابلی غائب تھے، لیکن عارضہ چشم بالکل رفع ہو چکا تھا۔

آں طبیب افسون نیرنگی نمایاں کرد و رفت
در چشم را علاج از چشم حیراں کرد و رفت

حیران تھا کہ میرے حال پر اتنی التفات بھی ہے۔ اور دور دور ہی رہتے بھی ہیں، یا ابھی یہ ماجرا کیا ہے؟ دو سال اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں میں عقد نکاح میں جکڑا جا چکا تھا۔ اور آبائی پیشہ سپاہ گری بھی اختیار کر لیا، کہ سایہ تبخ ہی میں امان ملے۔

بدفع چشم زخم خلق گمنامی فسون دارد بوس تا زاز در شہرت کہ شہرت بلوی خود ادا سلامت پیشہ را بنود بہ از دیوانگی کبے جنوں کن یا سپاہی شو سپاہی کم جنوں ارد وجہ معاش کی وجہ سے ایک کو نہ سہولت اور اطمینان تو تھا مگر وہ دارستکی کہاں جو تجرد میں میسر تھی، آخر مجھ پر حقیقت کھلی غصہ تو ہم فقر و غنا سے نجات ملی اور یہ منکشف ہوا کہ طلب مقصد بلا جہد ہمت سے دور ہے اور آرزوئے طلب کے ساتھ اگر رنج و کوشش پسند نہیں کرتا تو تیرے ہی فقر کا قصور ہے۔ جو کچھ تجھے دولت فقر سے ملا تو نے کم نہ کیا کہ اس کے لئے زحمت جستجو کرنی پڑے۔ اور جو تیرے پاس تھا دور نہیں گیا کہ اس کے پیچھے دوڑنا پڑے، ”صاحب لباس پوستانہ عریانی دیناں دارد، و شخص عریاں دامن کسوت بے سعی بدست نمی آرد“ پس فقر ہمہ حال موجود ہے۔ اور غنا اکثر مقام میں مفقود ہے۔ ہمت کا تقاضا ہے کہ مشکلات پر کوشش سے غالب آئے نہ آرزوئے تن آسانی۔ بیدل اس مقام پر فقر و غنا پر بحث کرتا ہے کہ :

ای تخیر بعت بزم فنا
 اعتبارات جہاں عز و قر
 گر زہستی فقر باشد مدعا
 عرض قدرت خارج اسباب نیست
 ذات موسوم است بے ساز صفت
 فرستے می خواہد ای بے معرفت
 یک سامان صفت چوں بزرنگ
 او بصد قدرت صفت پیدا کند
 خاک را یک ٹمر باید خورد نخوں
 شاخ و برگ آہدم کہ خواہد ریختن
 رشتہ ما یا موم باید جمع کرد
 شمع گر صد شعلہ بر توان گن است
 ایں ہر عرض غنائے پیش و پس
 مدعا ایں است کہ ہر وہم وطن
 خاصہ اسبابے کہ بے درد سرت
 فقرت از سیر گریاں حاصل ست
 گر با سانی نشود اسباب جمع
 بے تردد جمع اسباب معاش
 در معیشت مایہ عیش تو بس
 از تردد ہر چہ یابی کلفت است
 کو غنا کو فقر ای غنا فل توئی
 ان ابیات کا مفہوم یہ ہے جسے مولانا جامی نے اپنے شیخ طریقت خواجہ
 عبید اللہ احرار کے وصف میں لکھا ہے کہ :

پو فقر اندر لباس شاہی آمد ز تہ بسیر عبید اللہی آمد
 بیدل کے ابیات میں ایک خاص بات ہے فقر بلا غنا اور غنا بلا فقر ایسا ہی
 ہے جیسے ایک شخص مادرِ زادن کا ہو یا لباس ہو مگر کسی کے بدن پر نہ ہو۔ وہ عریانی
 کی پوشش ہے۔ خواہ جسم عریاں ہو آخر جسم ہے۔ محض لباس اگر جسم کی پوشش اور
 زینت نہ ہو بے معنی ہے۔ اس لئے فقر تو بہر حال مقدم اور مقصودِ حقیقی ہے۔ ”فقر“
 کے معنی لغوی زمین شور ہے جس میں کچھ پیدا نہ ہو، اصطلاح میں احتیاج اس کا مفہوم
 ہے ”اللہ غنی وانتم الفقراء“ غنی تو اللہ ہی ہے۔ انسان تو پیدا لشی فقیر ہے۔
 جو کچھ دیا ہوا ہے اللہ ہی کا دیا ہے۔ اس پیدا لشی احتیاج کو بقدرِ ضرورت رفع
 کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مناسب سبب بھی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ جمع ہوں تو احتیاج
 رفع ہو جاتی ہے اس لئے وہ اسباب جو احتیاج رفع کرتے ہیں ”غنا“ سے موسوم
 ہیں۔ بیدل استدلال یہ کرتا ہے کہ اگر ہستی کا مدعا محض فقر ہی ہوتا تو ”جلوہ بیرون
 عدم تازہ چرا“ تو عدم سے ہستی کا ظہور ہی کیوں ہوتا۔ اور یہ اسباب غنا جو رفع
 احتیاج ہیں پیدا ہی کیوں ہوتے آخر ان کی کچھ غرض اور مقصد بھی ہونا چاہئے ورنہ
 یہ کائنات ہی باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدرتِ اہمہ کا ظہور انہی اسباب سے
 ہوا ہے۔ دریا میں پانی تو ہے لیکن شوخی طوفاں بھی اسی میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر
 یہ ساکن ہی رہے تو شوخی طلاطم کیوں ہو، بیدل نے اسی ضمن میں ایک اہم مسئلہ
 کو حل کیلئے جو ہمیشہ بحث کا موضوع رہا، یعنی:

ذاتِ مہوم است بے سازِ صفات پس غنا ما وصف باشند فقر ذات
 یہ متکلیف اور تصوف کا دقیق مسئلہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذاتِ صفات سے
 منزہ ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارے فہم کی رسائی ہے ہستی مطلق یا ذاتِ باری تعالیٰ
 مہوم ہوتی اگر صفات نہ ہوتی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ فقر ذات کا وصف غنا ہے، اسی
 وصف اسی صفات سے ہم نے اتنا سمجھ لیا کہ ”ہست“ وہ واجب الوجود ہے۔ اب
 زیرِ بحث فقر و غنا کے ضمن میں ذات و صفات ہیں۔ ذات بے صفات عریاں ہے

صفات بے ذات وہی جسم اور لباس کی مثال ہے۔ غلط فہمی نہ پیدا کرنی چاہئے۔ یہ مثالیں فہم تفہیم کے لئے ہیں۔

اور برون از وہم و قال و قیل من
خاک برفرق من و تمشیل من
(عارف رومی)

ذات کو بھی رنگ صفت کے ظہور کے لئے عرصہ درکار ہے۔ لیکن یہ سامان صفات بجلی کی سرعت کی طرح معدوم ہو جاتا ہے۔ مٹی ایک عمر میں خون جگر پی کر شاخ و برگ کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے لیکن شاخ ٹوٹ جاتی ہے اور پتے جھڑ جاتے ہیں تو مٹی میں مٹی ہوتے دینہیں لگتی۔ دھاگہ اور موم جمع ہوں تو ایک شعلہ شمع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دھاگہ اور موم کو بننے میں کافی عرصہ چاہئے لیکن ایک پھونک شمع گل کرنے کے لئے کافی ہے، یہ تمام اسباب غنا جو تو اپنے آگے پیچھے دیکھ رہا ہے اگر تو ان سے تغافل برتے تو فقر ہی فقر ہے۔ اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ یہ ربط جو اسباب غنا میں ہے تو اسے توڑ پھوڑ کرنے رکھ، لیکن یہ بھی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان اسباب کی فراہمی کے لئے کچھ تردد کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ”آزار“ ہے۔

”مدعا از ہستی ما بس ہمیں آزار بود

ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود“

یہ شعر اسی بیت کے ہم معنی ہے کہ :

”گر ز ہستی فقر باشد مدعا جلوہ بیرون عدم تازد چرا“

لیکن ہر ایک کوشش کی ایک حد ہے۔ اسباب غنا سے بقدر ضرورت ہی لینا چاہئے۔ اور اس کو مقصد بالذات نہ سمجھنا چاہئے۔ نفس انسانی ”کثرت“ پسند ہے، اور فراہمی کثرت کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ کثرت مال، کثرت اولاد، غرض کثرت کی طلب جو ضرورت سے زیادہ ہے مذموم طمع ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش

آنچه مادر کار داریم اکثری در کار نیست

یہ شعر اس بیت کی تشریح ہے کہ:

”در معیشت مایہ عیش تو بس

آنقدر جہد یکہ نتواں زد نفس“

اتنی دوڑ دھوپ کہ سانس پھول جائے اور آخر ٹوٹ کر رہ جائے۔ اصل مقصد فوت ہو جانا ہے۔ اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، یہ اخلاقاً مذموم ہے۔

بیتدل لکھتا ہے کہ جب یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

”کو غنا کو فقر اسی غافل توئی

مفت بیکتا ئی ست اظہار دوئی“

تو مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے ہوس سے کنارہ کیا۔

در مخموری و مستی نزد م بیرون عدم ساغر ہستی نزد م

تا چوں گرہ شش جہت مساوی نمود خورشید صفت بہ پستی نزد م

میں نے مخموری اور مستی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، عدم سے باہر میں ساغر

ہستی سے سرشار نہیں ہوا۔ یعنی اتنا بدست نہیں ہوا کہ اپنی اصل حقیقت کو بھول

جاتا۔ جب تک گرہ کی طرح شش جہت میں توازن مساوی نہ ہوا سورج کی طرح پستی

کی طرف توجہ نہ کی۔ یہ توفیقی ترجمہ ہے، مفہوم یہ ہے کہ ”تعدیل بہر امر کمال عرفاست“۔

سورج شش جہت مساوی روشن کرتا ہے، سورج تو بلند مقام پر ہے اور اپنی

بلندی مرتبہ سے نیچے نہیں آتا اس لئے کہ شش جہت کو مساوی درجہ پر دکھتا ہے، اگر

یہ میزان عدل کائنات میں دہوتی تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ اسی طرح ہمارے

نظام معاشرت میں اگر تقسیم معیشت مساوی نہ ہو تو توازن قائم نہ رہے گا اور فتنہ و

فساد و شش جہت میں رونما ہوگا اور ہوتا ہے۔

ایک دن میں گھوڑے پر سوار دہلی کے بازار سے گزر رہا تھا، دور سے دیکھا کہ کچھ

آدمی جمع ہیں اور سب میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ گھوڑے کو ایڑی دمی کہ نزدیک

ہو کر دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیوں میں ہی ان کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہوں۔

جب نزدیک آیا۔ ایک شخص کو کہتے سنا کہ یارو دیکھو دیوانہ اس سوار کے پیچھے دوڑتا رقص کرتا آرہا ہے۔ میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو شاہ کا بیٹے، ایک عالم بخودی میں میں گھوڑے سے نیچے اتر آ، اور شاہ صاحب کی طرف سایہ کی طرح جھکا، کمال شفقت سے مجھے گلے لگایا۔

تادو چارنا ز گردان ز گس مستانہ ام شوق جو شے زد کم می پنداشت مینانہ ام
یار شاہ بے پردہ دیگر تاب خود داری کرست ای فیکان نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام
قریب ہی ایک دوکان خالی تھی اس کے گوشہ میں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ جو کچھ گفتگو اس وقت دونوں میں ہوئی اس کا آغاز تو بیدل نے اپنی موجودہ حالت خانہ داری سے کیا کہ تخم تجرد بریشہ تامل تیندہ است و بہار آزادی بشاخ و برگ تعلق گردیدہ، امانسیم گلشن بایں رواج مخبر است، کہ نہال یکتا ئیم، با بیاری نیرنگ علائق شری کہ عبارت از نتائج باشد، نحو اہد بست تا آن قدر بار خاطر تواند گردید، حدیقہ بے تقسیم باغبانی او ہام، اسباب شگونہ دورنگی نحو اہد آرد، تا ایں ہمہ تشویش و بستگی توان کشید، یعنی بظاہر اب تو میں امور خانہ داری کے حوصلے میں اُلجھا ہوا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنا نہیں کہ مجھے اتنا بھی شعور نہ رہے کہ یہ برگ و بار علائق دنیوی میرے نہال یکتائی کو مجھ سے پوشیدہ کر دیں، فرمایا کہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے سمجھا ہے، ہم ”لم یکن لہ کفو احد“ کے افراد ہیں،

تانشہ مختصم در بزم تفرید فارغ ز خیال صاف و در وقتید
بوی ز بہار رنگ رویم بر است زیں پیش غیتوان با عیاں جو شید
اسی موضوع گفتگو سے شاہ صاحب نے تصوف کے اہم نکات بیان فرمائے۔
ماروح مجسم و غیب مشہود یعنی عدمیم سحر پرداز نمود
چوں آب و ہوا علے زندہ با چوں طرح و بخار خلقے از ماموژ
یہ تو ایک طویل اور دقیق بحث ہے، سردست ہم بیدل کے سوانح حیات

لکھ رہے ہیں آخر گفتگو میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ”جیسے ہم عالم کہتے ہیں وہ صفحہ دل کا مطالعہ ہی ہے اور حُصص ہم اشیاء سمجھتے ہیں وہ سطر نگاہ ہے جو تحریر ہو رہی ہے، دل اجتماع کیفیتِ علوم ہے، اور علوم ادراکاتِ معانی نامفہوم، اپنی طرف سے دسوسہ پیدا کرنا بھی ایک صفت ہے اور اہام کو نشوونما دینا بھی قدرت ہے، وادھی ظہور میں تلاش کسبِ غیریت ہے نہ اظہارِ غیبت، جہاں تک ہو سکے ”در لباسِ کوش و ناممکن است در خود پوش“
 باشوخی لباس ہماں سرچھپا باش در عالم شہود ز مردان غیب باش
 نازِ حقیقہ ست نیازِ مجاز ما یک چند شوقِ موسیٰ و دردِ شعیب باش
 ہنگامہ خیالِ دوئی گرم کردہ ایم ما ئیم و عرضِ آئینہ گو جلوہ غیب باش
 صفت بے ذات خود نما ہو تو معدوم ہے۔ اور ذات بے صفت موبہوم،
 کسی شے کی نمود متصور نہیں ہو سکتی، جہاں کہیں ہم صفات سے موسوم نہیں
 ذات ہیں، اور جہاں اسمائے مشخص ہیں صفات ہیں۔

شاہ صاحب کی باتیں میں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا، مجھ پر ایک
 بیخودی سی طاری تھی، جب ہوش میں آیا شاہ صاحب کو موجود نہ پایا۔
 دلدار رفت و بیخودیم در کنار ماند تمثالِ جست و آئینہ حیرتِ شکار ماند
 مرگاں نبرد صوفیہ آغوشِ ساز وصال آخر نصیب دیدہ ہماں انتظار ماند
 اس واقعہ کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے میں ابھی تک اسی سانغر کے
 خیال میں مست ہوں۔

چہار عنصر میں بیدل نے جو بھی واقعات لکھے ہیں ان کو خرقِ عادت“
 ہی کہنا چاہئے، لیکن بیدل ہر ایک واقعہ پر حکیمانہ بحث بھی کرتا ہے، برسرِ دست
 ہم واقعاتِ محرابیان کہتے ہیں اور مختصر بحث بھی بیدل کے ہی لفظوں میں لکھتے
 ہیں۔

بیدل پر ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ نانِ شبینہ تک محتاج تھا۔ یہ

واقعہ اکبر آباد میں رونما ہوا۔ خود لکھتا ہے کہ اس مقام میں جو کچھ اسباب معاش تھا ختم ہو گیا۔ اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ جب بھوک نے سخت تنگ کیا نہ معلوم کیا جی میں آیا کہ بازار میں نکل آیا۔ "شرم افلاس از ہر جنس چشم می پوشید" و خجالت بیدری از ہر متاع داغ می خرید" بازار میں ہر ایک قسم کی چیزیں اکل و شرب کی موجود ہوتی ہیں۔ لیکن افلاس کا بڑا ہوا مارے شرم کے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھ سکا جیب میں پیسہ ہو تو کسی شے کی خریداری کا حوصلہ ہو۔ خجالت بیدری کی وجہ سے ہر ایک چیز سے داغ حسرت ہی خرید کر سکتا تھا۔ میری وضع ایسی نہ تھی کہ کوئی محتاج تصور کر کے کچھ دیتا۔ اور نہ میری غیرت گوارا کرتی تھی کہ آشنا و بیگانہ میری موجودہ حالت سے واقف ہو۔ منعم حقیقی نے استغنا میرے مزاج میں اس حد تک پیدا کر رکھا تھا کہ میں کسی حالت میں اپنے آپ کو اس کے غیر کا محتاج نہیں سمجھتا تھا۔

جو حق سوئی ہر کہ حاجت بست احرام پیش آیدت اس چار غم یا س انجام
تنگ کم ہمتی، و تشویش سوال رسوائی احتیاج، و نو میدی کام
میں بازار گزر کر دیہاتی کی طرف گیا۔ دو گھونٹ پانی پیا کہ شاید حرارت سے معدہ کو کچھ تسکین ہو۔ مگر اس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ غرض اسی حالت میں پھر لوٹا۔ جب میں "مدار دروازہ" کے قریب آیا، سرچکا آیا، گرنے کو تھا، کہ پیشاب کے بہانہ ایک دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ استنجا کے قصد سے دیوار کو ناخنوں سے کریدنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک سنگ ریزہ آیا۔ دیکھا تو دور اکبری کا ایک سنگ تھا جو وزن میں عہد عالمگیری کے پانچ سکوں کے برابر تھے۔ سبحان اللہ! کس وقت سے بیدل کے احتیاج کا انتظار کر رہا تھا۔ عالم غیب سے جو کچھ عطا ہوا اس نے میری دست میرا فطر و تشویش رفع کر دیا۔ اور ایک مدت تک میری قناعت کا دستگاہ سرمایہ رہا۔

صد شکر کہ احتیاج کو تشویش تعلیم گاہم کرد آخر از فضل کریم

ہر چند بدیوار رجوع آوردم دسٹم نرسید جز بداماں کریم
اللہ تعالیٰ کے احسان و انعام و کرم و عنایت کا شمار و بیان کرنا ایسا
ہی ہے جیسے شعاع آفتاب کی تر جانی ایک ڈڑہ کہے۔

جس سال شاہ جہان کی بیماری کی خبر سلطنت کے طول و عرض میں پھرتی ہوئی بیتل مرزا عبداللطیف کے ہمراہ تھا جو مرزا قلندر عم بیتل کے
رشتہ داروں میں سے تھا۔ مرزا عبداللطیف شاہ شجاع کی فوج کا سر
شکر سی تھا۔ شاہ شجاع نے ”بیماری پدرسکتہ مضمون سلطنت اندیشید“
اور وہ جنوں سر پر سوار ہوا کہ پایہ تخت دہلی کی طرف فوج کشی کی، بنگالہ سے
سرحد مالک بہار تک سپاہ پھیلا دی، تمام راجے اور جاگیردار فرمانبردار
ہی نظر آئے۔ اور سپاہ کا دل بھی بڑھا ہوا تھا۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ اورنگ
زیب عالمگیر نے دہلی کی فرمانروائی کے لئے پیش قدمی کرتے ہوئے پیش قدمی
کی۔ ”حقوق خدمت پدرش پیش از دیگران بجا آورده“ سواد الہ آباد میں
اس کے موکب اقبال نے ”ادبار بر شوکت شجاع ریخت“ ہزاروں میدان
جنگ میں کھیت رہے۔ شاہ شجاع تو ورطہ ہلاکت سے نکل کر جان بچا کر
بھاگا۔ مگر عالمگیری لشکر تعاقب میں تھا۔ ہر چند مرزا عبداللطیف نے کوشش کی
کہ کہیں پرچم کو مقابلہ کیا جائے مگر بے سرفوج کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اس لئے
خیریت اسی میں دیکھی کہ کسی طرف کنارہ کر جائے۔ ایک جماعت کے ساتھ دس
روز مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر امن آباد پٹنہ میں پہنچے۔ ایک روز
بمقام ”چاند چور“ ضلعی استادہ تھے اور ہمراہی ادھر ادھر نظر دوڑا رہے تھے،
ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا۔ دور سے ایک تل سفید نظر پڑا۔ لیکن سمجھ میں
نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ ہماری جماعت میں سے سرمست خاں اور مبارز خاں
اور میں تینوں سوار ہو کر تفتیش حالات کے لئے ادھر گئے۔ ایک احاطہ باغ
دیکھا۔ اس کے چاروں طرف طواف کیا، دروازہ میں داخل ہوئے، اس میں

دو جگہ تھے اور درمیان ایک تالاب تھا۔ ہم نے اور گھوڑوں نے پانی پیا، اب خیال آیا کہ واپس لوٹیں، ادھر ادھر جا سوسا نہ نظر کی تو دیکھا کہ تالاب کے دوسرے کنارہ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں تو کسی متنفس کا نشان نہیں یہ دھواں کس آتش کدہ سے اُٹھ رہا ہے۔ چونکہ ایسے مقام میں خوف بھی تھا اس لئے تلواریں نیام سے نکال لیں آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک حجرہ زمین دوز ہے، اتنے میں ایک پری زاد پر نظر پڑی، کہ فرش پر بیٹھی ہوئی ہے، اپنے چہرہ آتشیں کے سامنے آگ جلا رکھی ہے، اور حقہ پی رہی ہے، چہرہ سے کچھ وحشت ٹپک رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خرم حسن پر کسی کے عشق کی بجلی گری تھی، لباس سے عطر کی خوشبو نے فضا معطر کر رکھی تھی۔ القہہ حسن تھا جو لباس عشق میں محبوب تھا۔ میں نے ذرا جرات پر سمش احوال کی، بے دماغانہ دیکھا، گویا بجلی کو نہ گئی، اس کی گردن چشم سے لٹکھڑا کر گرا۔ آخر ایک اضطراب کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہا، ناگاہ اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور دل سے ایک آہ کھینچی اور یہ بیت پڑھی:

ساہبا در طلب روئی نکو در بدر ایم

روئی بنما و غلام کن ازیں در بدری

تھوڑی دیر کے بعد حقہ ہاتھ میں لئے حجرہ سے باہر آئی اور جگہ کی طرف خراماں خراماں گئی، میں بھی پیچھے ہو گیا۔ صدر جگہ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی مثال آئینہ مقابل بیٹھ گیا۔ اس کی زبان پر اگر کوئی حرف آتا تھا تو وہی بیت تکرار ہو رہی تھی، ناگاہ پھر گردن چشم میری طرف ہوئی۔ نگاہیں بنجر تھیں کہ میں تاب نہ لاسکا۔ جب ذرا ہوش درست ہوئے تو ان دونوں جوان مرد ہمارے ہیوں کو قریب بیٹھا دیکھا مگر وہ مجسمہ حسن غائب تھا۔ مجھ پر پھر بے ہوشی طاری ہوئی۔ جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ مرزا عبداللطیف بہت پریشان ہو رہا تھا کہ اتنی دیر ہوئی تینوں میں سے کوئی واپس نہ لوٹا۔ آدمی تلاش میں بھیجے۔ حالانکہ

فاصلہ ایک کوس کا تھا مگر وہ ادھر اُدھر خاک چھانتے رہے۔ آخر اس مقام پر پہنچے جہاں میں پڑا ہوا تھا مجھے اٹھا کر لائے۔ میری زبان سے وہی شعر بار بار جاری تھا۔ مرزا نے علاج کیا، آخر خدا خدا کر کے حواس بجا ہوئے۔ میرے ہمارے یوں کا خیال تھا کہ یہ مقام آسیب زدہ تھا۔ مگر انھوں نے کچھ نہ دیکھا۔ ایسے مشاہدات کا انکار تو نہیں ہو سکتا، کئی ثقہ لوگ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بعض مقامات پر جہاں کبھی جنگ ہوئی شور و غل کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ”گرموفون“ میں آواز کا نقش ثبت ہو جاتا ہے اسی طرح بعض واقعات کے نقوش بھی قائم رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سائنس اور بالخصوص علم النفس کی ترقی کے بعد ان واقعات کی علمی توجیہ بھی تسلی بخش کسی وقت ہو جائے۔ سر دست ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔

چو بشنوی سخن اہل دل ملو کہ خطاست

سخن شناس نہ ڈیرا خطا میں جاست

لیکن وہ واقعات جو بیدل بیان کرتا ہے ان کے مشاہدہ کرنے والا

ہر ایک دیوہو دل نہیں ہوتا، عارف رومی کہتا ہے:

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل

بیدل کا ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ ”ہر نقشہ کہ می بینی حرفیت کہ می

شنوی“ اشیاء کے خواص ہمیں کیسے معلوم ہوتے اگر وہ خود ہی نہ بتائیں، اس تماشا گاہ عالم میں یہی چلتی پھرتی منہ بولتی تصویریں نقوش حیرت ہیں جو آئینہ دل پر چھوڑ جاتی ہیں۔

۱۰۷۰ھ کا واقعہ ہے کہ مرزا قلندر بنگالہ میں سفر کر رہا تھا، اسباب علائق

قصبہ ”مہسی“ میں چھوڑ آیا تھا، یہ قصبہ آن روئے دریا گنگ ”پٹنہ“ سے بیس

کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وہ ایام ہیں جب شاہ شجاع آوارہ دشت ادبار ہو رہا تھا اور بادشاہ عالمگیر کا اقتدار ممالک ہند پر چھا رہا تھا، بد نظمی اور بد امنی کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں جبکہ یہ حالات تھے سفر کرنا جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا بالخصوص دیہات سے گزرنا سخت مشکل کا سامنا تھا۔ مرزا قلندر نے مجھے قصہ ”ہسی“ سے اسباب لانے کے لئے بھیجا، ایک خادم ساتھ کر دیا۔ میں پیدل سفر کرنے کا عادی نہ تھا۔ پہلے ہی دن دریا کے اس طرف تین کوس چلا تھا کہ پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور مکان اس شدت سے محسوس کی کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ہر چند نوکرنے راستہ کے خطرہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حوصلہ افزا باتیں کیں، پاؤں دابے، آخر اٹھنا ہی پڑا۔ دوپہر کے بعد رات کا کچھ حصہ سر میں کٹا اور صرف دو کوس کا فاصلہ طے ہوا۔ ”ہم جتنا پورے پہنچے، دن بھر کی کوفت کی وجہ سے آتے ہی سو گیا۔ صبح اٹھا تو کوئی اثر کوفت کا باقی نہ تھا، مگر مناسب یہی خیال کیا کہ کوئی کرایہ کا ٹول جائے تو سفر بسہولت طے ہو جس سے دریافت کیا اس نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ موجود حالات میں کون خطرہ مول لے۔ ناچار پھر یا پیادہ چل پڑا۔ تین کوس چلا تھا کہ گرمی کی شدت نے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ آفتاب سر پر غضب آلود شعاعیں برسا رہا تھا، دور سے ایک درخت نظر پڑا یہاں پہنچ کر اس کے سایہ میں دم لیا۔ آفتاب حد زوال سے گزر گیا۔ اور ہوا میں گرمی بھی اعتدال پر آرہی تھی ہمت کر کے پھر اٹھا تو سہی مگر وہی پہلے دن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہیں بیٹھ گیا۔ خادم بیچارہ بھی حکم تسلیم خاموش رہا۔ اب ہم دونوں شام کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی ایک پہر دن باقی تھا کہ میں نے دیکھا، کہ ایک نحیف منحنی بوڑھا ایک گھوڑی بچہ دار پر سوار ہماری طرف آرہا ہے۔ ایک لڑکا لکڑی ہاتھ میں لئے ہم رکاب ہے۔ نزدیک آیا تو نہایت تپاک سے ملا۔ اور کہا کہ ان وقتوں میں پیادہ پاسفر کرنا آپ جیسوں کا کام نہیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اس بے تکلفی اور گرم جوشی سے ملنا کسی ناواقف سے بعید ہے۔ حلقہ پر بہت زور دیا مگر دیدہ تصویر میں کوئی ایسی شناں صورت سامنے نہ آئی۔ مسکراتے ہوئے کہا کہ شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں جان محمد ہوں۔ قصبہ مہسی میں خواجہ شاہ محمد کا ملازم ہوں جس کا مکان مرزا قلندر کی ہمسائیگی میں دیوار بدلیوار ہے۔ خواجہ صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ دریائے گنگ سے آپ کو قصبہ میں لاؤں، مگر آپ نہ ملے، میں لوٹ آیا، اچھا ہوا کہ آپ یہاں مل گئے۔ یہ گھوڑی حاضر ہے۔ آپ سوار ہوں میں ہمرکاب چلوں۔ میں نے انصاف سے بعید خیال کیا کہ میں باوجود جوانی سوار اور یہ ضعیف بوڑھا پیدل چلے۔ اور تو کچھ عذر نہ تھا، میں نے کہا کہ اس درخت کے سایہ میں کچھ دیر آرام بھی غنیمت ہے۔ آپ سوار ہو کر آگے چلیں، میں بھی آپ کے نقش قدم پر آپ سے آملوں گا۔ اور استنجا کے بہانہ سے اٹھ کر ایک طرف چلا گیا جب واپس آیا تو لڑکا گھوڑی کی لگام تھامے اسی جگہ کھڑا تھا مگر وہ پیر باد یا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ناچار میں سوار ہوا۔ نماز شام کا وقت تھا کہ تین کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سرا میں جو راستہ میں پڑتی تھی پہنچے۔ وہ بوڑھا پہلے ہی یہاں موجود تھا۔ میں نے بہت معذرت کی اور اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگا کہ نوکروں کا کیا احسان اگر میں آپ کو مذہب نہ پاتا، تو ہمرکاب ہی چلتا۔ بہر حال رات یہاں ہی ٹھہریے۔ آرام و آسائش کا ہر ممکن سامان موجود ہے۔ اتنا کہہ کر وہ تو چلا گیا بدسترخوان پر کھانا چننا گیا تو میں نے کہا کہ بھئی ہمارے پیر طریقت کو بھی تو بلواؤ، تلاش کے بعد بھی نہ ملا۔ رات آرام سے میٹھی نیند سو یا۔ صبح اٹھا تو وہی لڑکا گھوڑی لئے سرا پر حاضر تھا۔ کہنے لگا کہ نزدیک ہی قصبہ ہے۔ اور یہ سرا اسی کے مضافات میں واقع ہے، میں اور بوڑھے میاں رات وہاں رہے۔ مجھے یہاں آپ کی خدمت میں بھیجا اور آپ علی الصباح ہی قصبہ مہسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ آپ جس وقت

چاہیں سوار ہوں میں حاضر ہوں، لیکن وہ آپ کو راستہ میں نہ ملے گا۔ میں سوار ہو کر چل پڑا۔ نو کوس کا سفر تھا، عصر کے وقت ہمسی میں خواجہ شاہ محمد کے مکان پر پہنچا تو پیر مرد وہاں دروازہ پر منتظر پایا۔ گھوڑی تو رٹکے کے حوالہ کی اور بار بار شکریہ ادا کرتا رہا وہ اکسارا اور ندامت سے جواب دیتا رہا۔ آخر رخصت چاہی، میں اپنے گھر پر آیا۔ دوسرے روز خواجہ صاحب کے بیٹوں کو اطلاع ہوئی تو برسم قدیم ملاقات کے لئے آئے میں نے بوڑھے کا ذکر چھیڑ دیا کہ بہت بااخلاق آدمی ہے۔ وہ حیران ہوئے اور کہا کہ اس نام اور علیہ کا آدمی تو آج تک ہم نے دیکھا تک نہیں، اب میری حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔

”تصور جو ہر آگاہی قدرت کجا دارد

بہار فضل آنسوی تعقل رنگ با دارد“

قدرت کے کمرشموں کی نیزنگیاں ایسی نہیں کہ ہم عقلاً ان کی کنہ تک پہنچیں، ماننا پڑتا ہے کہ عقل سے پرے بہار فضل خدا کی رنگینیاں بھی ہیں۔

”نہال آید بروں تخمے کہ بنشاند در خاکش

درین لوی زبا افتادن، ایجاد عصا دارد“

ایک بیج سے درخت نشوونما پاتا ہے جسے قضا و قدر مٹی میں گاڑ دیتی ہے، اس وادی امکان میں جو پاؤں سے نہیں چل سکتے ان کو بھی سہارے کے لئے عصا مل جاتا ہے۔

”ندید از آبلہ ریگ رواں منع جنوں تازے

بہ نومیدی ز پیا نشیں کہ ہر وماندہ پا دارد“

پاؤں میں خواہ چھالے پڑ گئے ہوں۔ ریگ رواں کسی جنوں تاز کی مانع رفتار نہیں، تو مایوس ہو کر پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ رہ، ہر ماندہ و در ماندہ کو بھی چلنے کے لئے پاؤں خدا کے فضل و کرم سے مل ہی جاتے ہیں۔

”بگردوں میرد نظارہ را و اماندن مراں
 مشوغا فل ز پروازے کہ بال نار ساداد“
 آنکھیں کھلی ہوں تو ایک نگاہ بے دست و پا نظارہ کو آسمان
 تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ سمک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا
 جسے تو سمجھتا ہے دور تر ہے قریب راہ دراز میں (مؤلف)
 اگرچہ نگاہ میں بال و پر نہیں لیکن اس کی پرواز دیکھ کہ باوجود بے سرو
 سامانی کتنی رسا ہے۔

”اثر ہای غنا روشن نشدنی احتیاج این جا
 ز اسرار کرم گر آگہی دارد گدا دارد“
 طلب ہو تو مطلوب ملتا ہے۔ درد ہو تو دوا بھی ہے اور اس کا اثر
 بھی ہے۔ ”ای خواجہ درد نیست و گرنہ طیب هست“ اسی طرح جہاں احتیاج
 ہو وہاں غنا کا بھی ظہور ہوتا ہے، بخشش کے راز سے اگر کوئی واقف ہے تو
 گدا ہی ہے۔

”بجناب کرم افسوں درع پیش میر
 بے گناہی گنہ نیست کہ آنجا بخشند“ (بیدل)
 صاحب مغفرت کے حضور تقویٰ کا جادو نہیں چلتا۔ بے گناہی
 گناہ تو نہیں کہ وہاں بخشا جائے، پہلے گناہ کو بنو پھر مغفرت طلب کرو۔
 مری غرض گناہ سے نہیں لذت گناہ
 بندہ تیرے فضل سے رحمت پرست ہے (مؤلف)

”سراپا محو شو تا جملہ آگاہی شوی بیدل
 بقدر گم شد نہا ہر کس این جا رہنا دارد“

اے بیدل جتنا اپنے آپ سے غافل ہوگا اتنا ہی آگاہ ہوگا۔ جتنا کوئی
مگراہ ہوتا تھا ہی رہبرِ کامل کا طالب ہوتا ہے۔

شاہ عالمگیر تو دکن کی تسخیر میں مصروف تھا۔ ادھر دہلی اور اکبر آباد
کے گرد و نواح میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی، حکام نے خود سری اختیار کر رکھی
تھی۔ ہر ایک کے سر میں ہوائے حکومت و تسلط سمائی ہوئی تھی۔ حوالی مٹھرا
کے اکثر پرگنوں میں لوٹ کھسوٹ اور تعدی کا دور دورہ تھا۔ شرفاء کا
ننگ و ناموس ٹٹ رہا تھا، داد گری بغیر بیداد متصور نہ تھی، ہر روز دکن
سے ایک نیا عالم آتا یہاں تک پہنچتے پہنچتے پڑنا ہو جاتا۔ تجارت پیشہ کا
کوئی قافلہ ان راستوں پر آتا تو ٹٹ جاتا، بیدل دو سال سے مٹھرا میں
تھا۔ متمول آدمی تو اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے اور تیر و
تفنگ سے اپنی جان و مال کی حفاظت بھی کر رہے تھے، بیدل کے دل
میں خیال آیا کہ یہاں سے چلنا چاہئے، جس طرح ہو دہلی پہنچو، اس منحصر
آفات سے تو نجات ہو۔

فرصتے داری، زگرد اضطراب دل بر آ
بچو خوں پیش از فشردن از رگ بسمل بر آ
خلقے آفت خرمین است ای جا بقدر احتیاط
عافیت می خواہی از خود اندک ای غافل بر آ
از تکلف در فشار قبر نتوان زیستن
بچوں نفس دل ہم اگر تنگی کند از دل بر آ
اگر فرصت ہے تو دل سے اضطراب کی گرد جھاڑ کر نکل آ، پیشتر اس کے
کہ لہو کی طرح بے رگ بسمل سے آپ ہی باہر آجایہ سمجھ لے کہ خلق کا خرمین
آفت ہے۔ اس لئے اگر خیر چاہتا ہے تو احتیاط برتتے ہوئے لے بے خبر
تھوڑا سا اپنے آپ سے باہر آ، فشارِ قبر میں بھی تکلف کے ساتھ زندگی

دوبھر ہے جس سے دم گھٹتا ہے اگر دل بھی تنگی کرے تو دل کو بھی چھوڑ کر
باہر آ۔

دوستوں سے جب میں نے ارادہ کا ذکر کیا تو ہنسنے لگے کہ آپ کو یہ کیا
سوچھی، اگر آپ عزم مصمم اعتماد و خوارق پر کئے ہوئے ہیں تو جب اس کی
آزمائش ہوگی اور آپ صبح و سلامت گھر پہنچ جائیں گے تو ہم بھی آپ کی
کرامات پر ایمان لے آئیں گے۔ اور اگر اپنے زور بازو اور شجاعت پر بھروسہ
ہے تو فتح کے وقوع کے بعد حق مبارک بآداد اکریں گے، ورنہ ظاہر
حالات جو کچھ ہیں آپ بھی دیکھ رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسے
دہلی کہ ہنوز دور است پہنچ سکتے ہیں، کسی کی نہ سنی ایک ”بہلی“ کرایہ کی۔
محمل کشی آثار خیال ست گذشتن رنج و غم اس مرحلہ پوستہ نمائد
مفت است ز صاحب ثریب جو ہر قدرت چنداں کہ دل خوں شدہ خستہ نمائد
بر ناخن امداد شکستن بگمارید امی بے خبراں کار کسی بستہ نمائد
پہلے دن کا پڑاؤ ”اعظم آباد“ تھا، اس مقام پر قریب پچاس ”بہلیاں“
ایک ماہ سے بدرقہ کے انتظار میں پڑاؤ ڈالے کھڑی تھیں۔ یہاں نہ کوئی
فوجی سوار نہ پیادہ نظر آیا کہ اس کی حفاظت میں آگے بڑھتے، دوسرے
روز میں سفر پر آمادہ ہو گیا تو دوسروں کے دل میں بھی گدگد می ہوئی
مگر وہاں کے لوگوں نے روکا اور کہا کہ آج کل بے بدرقہ سفر کرنا اپنے
آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے مگر قافلہ چلنے کے لئے تیار ہو چکا تھا، اتنے میں
ایک فقیر ہاتھ میں طوٹے کا پنجرہ لئے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔
اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر صدا کی آفتاب عالم اقبال ہم سفر ہے،
کسی قسم کا وہم خطرہ دل میں نہ لاؤ۔ عرض قافلہ روانہ ہوا۔ میرے ہمراہ
دو خادم تھے۔ ایک بیمار اور دو مراضعی کی وجہ سے خدمت سے آزاد۔
راستہ میں افتادیہ پڑی کہ بہلی کے دونوں پہیے دھرے سے نکل گئے۔ بیل

بھی زخمی ہوا۔ قافلہ والوں نے یہ بد فال سمجھی، غرض ہزار خرابی کے بعد شیر گڑھ پہنچے۔ رات توجوں توں کر کے یہاں بسر کی، ابھی پہر رات باقی تھی پہلی بانوں نے کہا کہ قافلے والے اسباب باندھ رہے ہیں اگر وہ آگے نکل گئے تو ہم بچھڑ جائیں گے۔ میں نے کہا کہ تمہیں کس نے روکا ہے چلو، شیر گڑھ کی آبادی کے قریب ہی ایک قلعہ تھا۔ قصبہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی۔ اور اس قلعہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر اور گاؤں تھا۔ جہاں کے قزاق اکثر چھاپہ مارتے۔ اہل قلعہ قلعہ میں بیٹھے تیر و تفنگ اثر کی ہائے ہو سے انھیں پر آگندہ کرنے کی بے فائدہ کوشش بھی کرتے۔ ہمارے پہلی بان مقراض واران قزاقوں سے جو طویل رکھتے تھے، ابھی رات باقی تھی کہ ہم پہلی کے ساتھ ایک اور راستہ پر ہو گئے۔ عرصہ گزر گیا اور میں حیران تھا کہ چاروں طرف قافلہ کی گرد تک دکھائی نہیں دیتی، ممکن ہے کہ ہم کارواں سے پہلے ہی آگے دور نکل آئے، یہاں تک کہ ہم گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھا کہ سواروں کی ایک جماعت چپ و راست گھوڑوں کو دوڑا رہی ہے۔ لیکن غبار میں انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ میں نے پہلی بانوں کی منت کی واپس لوٹو، مگر وہ توارا دتا اس جگہ لائے تھے سنتا کون، اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک نیلے گھوڑے پر مسلح سوار اسی جماعت سے باہر نکلا۔ تازیانہ ہاتھ میں تھا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا ہماری پہلی کے قریب آیا۔ شکل و صورت سے مسلمان نظر آیا۔ آتے ہی پہلی بانوں پر برس پڑا، او بد بختو تم اندھے ہو گئے تھے کہ محبوبانِ الہی سے ایسی ناشائستہ حرکت کی، پہلی بان کانپ رہے تھے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور خطا ہوئی معاف فرمائیں۔ بات یہ ہے کہ راستہ بھول گئے۔ خیال یہ تھا کہ یہاں کے رہنے والوں سے راستہ دریافت کرینگے ادھر آجکلے، اب جس طرف ارشاد ہوا دھر چلیں۔ سوار نے تازیانہ سے

ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ خبردار ابھی ادھر ادھر نہ ہونا ورنہ تمہاری خیر نہیں پہلی باتوں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے اپنے آپ کو قافلہ کے درمیان دیکھا۔ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

جن دنوں بیدل کا قیام مٹھرا میں تھا، قلعہ دار دوست تھا ایک دن اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ قلعہ کیا ہے جنات کا گڑھ ہے، تین سال سے میں یہاں ہوں مختلف مقامات سے پتھر برستے ہیں یا کسی گوشہ سے آگ بھڑکتی ہے۔ کئی افسوں طراز آئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ فوراً ایک شعر بیدل کے خیال میں آیا۔ ”باعفاریت جہانے دیگر جائے کم نیست مکائے دیگر“ ایک کاغذ پر لکھ کر قلعہ دار کو دیا کہ قلعہ میں ایک نیزہ پر آویزاں کرو۔ جب تک بیدل وہاں رہا یعنی تین سال کے عرصہ میں پھر یہ شکایت نہ ہوئی۔ بیدل اسے ”اثر سخن“ سے منسوب کرتا ہے۔

اے دماغ فطرت سرگرم سوزائے سخن	زریں دریا بے سرا را اثر ہائے سخن
نقطہ و خطے کا زپر کار امکاں دیدہ	فہم کن قدرت نگار یہاں اجڑائے سخن
دستگاہ رنگ بوی عالم غیب و شہود	نیست غیر از صورت پنہاں پیدائے سخن
جہ انس آئینہ تاثیر اس حکم اندوس	آہ از آن طبعیکہ غافل شد ز ایائے سخن
کیست زیں تمثال زیر تنی بنا درنگ ہوش	میزد از خود سخن ہم در تماشا ئے سخن
از زمین تا آسمان یک حلقہ آغوش آوت	تنگ نتوان کرد از بیدانشی جائے سخن
تہمت مضمون دیگر بر طلم خود مبند	جز سخن دیگر چہ داری اسی محائے سخن
بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات تحریر سخن ہے۔ انسان خود ایک	

پہیلی ہے اور یہ سخن ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن یہ نقطہ و خط اور حروف اور عبارت جو کتاب کائنات میں تصویری نقوش ہیں محض اتنی ہی بات نہیں، اصل شے تو معانی ہیں اور یہ حقیقت ہے، اور اسی کا اثر ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس موضوع پر ہم پہلے بھی بیدل کے فغلوں میں بحث

کر چکے ہیں، وہ بھی اسی حقیقت کے اثر پر زور دیتا ہے۔

نہیں صوت و صدا پردہ ساز سخن است

خامشی نیز اثر پرور راز سخن است

گوش گو تا بے تامل نظرے باز کند،

کہ حقیقت ز اسیراں مجاز سخن است

تصویر | چہار عنصر میں بیدل نے چند اہم واقعات بھی نقل کئے ہیں۔

اور نظم و نثر میں دادِ سخن دی ہے، ان میں سے ایک واقعہ بیدل کی اپنی

تصویر کے متعلق ہے۔ عقیدت مندوں میں ایک شخص ”انوپ چتر“ نامی

نقاش تھا کہ ”روح مانی بکسوت جہاں رنگ گردِ قلش می گردید، و فطرت

بہزاد در پردہ خاموس خاک انفعال ترددِ سنش کشید“

خامہ ادھر کجا تصویرِ شمع می کشید تا قیامت داشت از رنگش چراغِ افروختن

ہمیت پرانہ گردِ نظر می بست نقش نقش دودِ انگشت تا محشر ز بانس سوختن

ریشہ نخلے کہ از کلکش نم پروا زیافت در بہارش شاخِ خم می شد ز بارانِ دھن

زین ادھر جانِ قابِ رنگِ صنعت می شکافت محو بود اندیشہ چشم از تحیر و دھن

اس مصوّر کے ورقِ دل پر نقش عقیدت اتنا گہرا تھا کہ اکثر التجا کرتا کہ

اجازت دیں کہ آپ کی تصویر کھینچوں تاکہ صفحہ روزگار پر یادگار رہے۔

”چوں فضولیہائی ایں جنس اشغال غیر از آئینہ لبونمی زدود، طبیعتِ نیرنگی

مسترت ساغر التفات کم می پیود“ میں اس قسم کے شغل کو محض تفریح ہی

خیال کرتا تھا اس لئے طبیعت ادھر نہ آئی۔ ایک روز بہت منت و سماجت

سے کام لیا اور کہا کہ میں کسی اور خدمت کے لائق تو نہیں اگر اجازت ہو تو

میری سعادت ہے۔

آئینہ چہ دارِ دُسر و برگِ قبول

جز آنکہ ترا جلوہ دہد در نظرت

میں نے بھی اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو اجازت دے دی،
اس نے اس »عجز سرشت« کا نقش »صفء اثر« پر باندھا، دیکھا تو میں
خود حیران رہ گیا کہ یہ میں ہوں یا میری مثال۔

سیر اور امتیاز فرع و اصل آشنا داشت مستغنی ز وصل
ما شود بیگانہ ہم محرم نشان بیدلم می گفت بے کام و زبان
اگرچہ تصویر نقل اور میں اصل تھا، مگر دونوں میں فرق نہ تھا، اگر کسی
دوست کے پاس ہوتی تو وہ یہ سمجھتا کہ بیتل میرا ہم نشین ہے، اور بیگانہ کو
بھی پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ تصویر خود بول رہی ہے کہ میں بیتل
ہوں۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ منہ اور زبان کے بغیر ہی بولتی ہے،
اس تصویر کو کتاب میں تہ کر رکھا، دس سال تک اس نگارستان کا
تماشا دیکھتا رہا، ۱۱۰۰ھ میں »بہ مقتضائی عجز بشری« مجھ بے دست و پا
کے قوی پر عارضہ زور پکڑ گیا۔ یہاں تک کہ اجاب زندگی سے مایوس
ہو گئے۔

بودم گردے فسرده یاس مال پرواز بباد رفتہ درختہ بال
چون کس نمود داشتیم لیک بوہم چوں صبح نفس میزدم اما بخیاں
ایک رفیق اسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، ناگاہ اس تصویر پر
نظر پڑی، کف افسوس ملتے ہوئے کہا کہ »آہ« اس تصویر کو نظربد کھا
گئی۔ غالباً کسی لڑکے نے نم آلود ہاتھ اس پر پھیرا ہے، اس لئے اس کا رنگ
آڑ گیا، حاضرین نے بھی یکے بعد دیگرے تصویر دیکھی اور افسوس کرتے
رہے۔ ایک نے کہا کہ نمی کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا، نم کا اثر صفحہ کتاب
کے حروف پر بھی ہونا چاہئے تھا۔ میں نے حاضرین کی گفتگو سن کر کہا کہ
میں بھی دیکھوں کہ کیا بات ہے۔ تصویر دیکھی تو واقعہ میں ایک مدہم سانچہ
رہ گیا تھا۔ میری یہ حالت نہ تھی کہ افسوس میں رفقاء کا شریک ہوتا۔

تصویر ہاتھ سے گر پڑی، جب میں رُو بصحت ہوا اور رفتہ رفتہ جسم ناتواں میں پھر سے قوت و توانائی محسوس کی اور اپنے آپ کو تندرست پایا تو ایک دن اسی تصویر کا خیال آیا کہ بیچارہ نے کس ذوق و شوق سے کھینچی۔ تصویر اسی کتاب میں نقش معنی فراموشی اور اسی محفل حروف میں دو دوشعل خاموشی تھی۔ کتاب کھول کر دیکھی تو حیران رہ گیا۔ وہی شوخی رنگ نمایاں تھا گویا ابھی کھینچی ہے۔ گویا بے بدلے زبان گرم گفتگو شعلہ توانائی مستحکم ہو رہا ہے، اور بہار گذشتہ پھر سے اسی رنگینی کے ساتھ جلوہ نما ہے، رفقاء نے بھی دیکھی اور سب تصویر حیرت بن کر رہ گئے۔ سب کا رنگ ہوش اڑ گیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مجھے اب سوچنے کی فرصت نہ تھی، جنون بے اختیاری اجزای صفہ را بچاک گریباں رسانید، واضطراب بے حوصلگی بچپناں بخاک مدفون گردانید، یعنی پھاڑ ڈالی۔

بیدل تا سیر رنگ و بو با کریم صد عقدہ ز نیرنگ جہاں واکریم
اما توجہ عالمی کہ حشر تصویر در پردہ نقش تو تماشا کریم

اس واقعہ کے ضمن میں بیدل لکھتا ہے کہ اس قسم کے واقعات جہاں بچپنی کی قدرت کے عجائبات سے ہیں کہ ہم انسانی خواہ کتنی ذہنی کاوش سے کام لے یہ گتھی سلجھنے میں نہیں آتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسرار عالم غیب ہیں۔ اگر فطرت بشری میں یہ جو ہر ہوتا کہ اس قسم کے اسرار کی حقیقت اس پر منکشف ہوتی تو عاجز نہ ہوتی، اس طرح ہر ایک صاحب عقل اس کی کنہ کو پہنچ جاتا۔ اگر زمین کو پر لگ جاتے، تو آسمان کو نقل میں و بالیتی، اور اس طرح ننگ پستی و پامالی سے ذیل و عاجز نہ ہوتی اور اگر ذرہ کے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو آفتاب بن جاتا اور اسے حرارت اخذ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ پس آدمی جمیع امور میں مجبور ہے اور تمام افعال و اعمال میں معذور۔

ای آنکہ ہیچ عالمے بار تو نیست جز تہمت و ہم گرد آثار تو نیست
برخیز بکار خویش مژگاں و اکن ہر چند کشاد مژہ ہم کار تو نیست

موت | بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ میں ہوئی، تاریخ خود ہی انتخاب سے نکالی، پیداغظیم آباد پٹنہ میں ہوئے اور فوت دہلی میں جہاں مستقل رہائش رکھی تھی، وفات ۱۱۳۳ھ میں واقع ہوئی۔ بیدل محض شاعر نہ تھا، سنائی اور عطار اور رومی اور سعدی وغیرہم کی طرح صاحب حال بھی تھا۔ معاصرین اولیاء اللہ میں شمار کرتے، چنانچہ ایک رباعی میں اشارہ کرتا ہے کہ:

بیدل بدوروزہ عمر مغرور مشو بنیاد تو نیستی ست معمور مشو
ہر چند ابدال و قطب و غوث خوانند اسی خاک یاس غبار مسرور مشو

یہ عمر درویش ہے اس پر انرا نا نہ چاہئے۔ جس ہستی کی بنیاد ہی نیستی ہو وہ آباد ہوتے سے رہی، کوئی ابدال یا قطب یا غوث بھی ہو اور لوگ یہ سمجھ کر احترام بھی کریں تو فوق البشر تو نہیں ہو سکتا۔ اس آدم خاکی سے یہ غبار شہرت کشف کرامت اڑ کر پھیلے تو اس پر خوش نہ ہونا چاہئے۔

سودا کے ایک شخص سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے زمانے میں بھی شعر بیدل کے مزار پر تقریب عرس پر جمع ہوتے اور ایسا چیدہ کلام سناتے۔ اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ تمام شعرا بطور پیرومشا اور استاد فن بیدل کا اتباع کرتے رہے۔ ۱۱۹۰ھ میں مجھے دہلی میں چند ماہ قیام کا اتفاق ہوا۔ جو حقیقت مجھے تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں اولیں فرصت میں فاتحہ خوانی کے لئے مزار پر حاضر ہوتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کہاں واقع ہے۔ میرے تصور میں ردضہ کا آیا، ایسا ہی نقشہ تھا جیسا کہ مشاہیر کا عموماً دیکھ چکا تھا۔ دریافت پر مجھے اتنا معلوم ہوا کہ قبر ریس کوئٹہ کے قرب میں ہے۔ میں اس سڑک پر تو لیا جو دہلی سے نظام الدین اولیاء کو جاتی ہے۔ مگر مجھے راستہ میں کہیں نشان نہ ملا۔ یہاں تک کہ میں پیدل ہی مقبرہ نظام الدین اولیاء پر پہنچ گیا۔ یہاں میں نے مجاورین سے دریافت کیا تو ایک نے کہا کہ آپ بیدل کی نسبت دریافت کرتے ہیں جو شاعر تھا۔ مجھے یہ نثرہ سن کر دھکا سا لگا۔ کہا کہ ہاں شاعر تو تھا، اس نے کہا کہ آپ اسی سڑک پر

واپس لوٹیں، داہنے ہاتھ بلندی پر ٹکے شاہ کا مزار ہے، وہاں آپ کو لکڑیوں پر
ٹکے آویزاں دکھائی دیں گے، عین اس کے سامنے ایک قبرستان ہے وہاں اس
شاعر کی قبر ہے۔ آتے ہوئے میں نے ٹکے لگتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس لئے اطمینان
ہو گیا کہ اب مرزا صاحب کے مزار کا پتہ مل گیا۔ میں اس مقام پر واپس آیا۔ سڑک
کے کنارے بائیں طرف ایک قبرستان تھا میں نے ان قبروں کو پہلے دیکھا جن کے
گرد چار دیواری تھی، اور کتبوں کو بھی پڑھا ان میں بیدل کا نام نہ ملا۔ یہ مزار بھی
بہت پڑائے تھے، دیواروں کا کچھ حصہ گر چکا تھا اور کچھ گر رہا تھا، اسی طرح اور
قبریں بھی دیکھیں جن کے سر ہائے کتبے انصب تھے۔ اس فہرست رنگاں میں بھی
مرزا صاحب کا نام نہ تھا۔ کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان میں بعض اللہ والے
بھی تھے، جب مجھے یقین ہو گیا کہ ان قبروں میں آپ کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تو سخت
افسردہ خاطر ہوا۔ اور حسرت بھری نظر سے اس عبرت گاہ کو دیکھتا ہوا پھر سڑک پر
اُتر آیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ آپ کی قبر انرا نہیں میں ایک ہے، چلو میں کھڑے
کھڑے فاتحہ پڑھ لیں۔ سڑک کے کنارے ایک قبر کے سر جانے میں نے فاتحہ خوانی
کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے بعد شہر کی طرف لوٹا۔ راستہ میں مجھے رہ رہ کر ایک اقمہ
کا خیال آتا، جب میں پہلی دفعہ دہلی میں چند روز کے لئے آیا تھا۔ میری طالب علمی کا
زمانہ تھا۔ میں امراد و زراء کے مقبرے دیکھتا ہوا صفہ جنگ کے مقبرے پر کتبہ پڑھا
رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بنگالی بندہ و میری طرح ہی سیر کرتا ہوا آکر کھڑا ہو گیا۔
مجھ سے دریافت کیا کہ کیا پڑھتے ہو، اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کتبہ
ہے اور متوفی کا سنہ وفات شعر کے آخری مصرع کے حروف سے نکلتا ہے۔ صنعت
جمل بھی سمجھائی تو کہا کہ یہ نہایت اچھی صنعت ہے۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تم
طالب علم معلوم ہوتے ہو، بتاؤ تم نے یہاں عجیب چیز کیا دیکھی، میں نے کہا کہ ہر ایک
چیز ہی عجیب ہے۔ کیسی عالی شان عمارتیں ہیں۔ مسکرایا اور کہا کہ عالی شان عمارتیں تو
ہر جگہ ہیں، میں نے کہا کہ آپ ہی فرمائیں آپ نے کیا عجیب چیز دیکھی، میرے خیال میں

تو کوئی خاص بات نہیں آئی۔ کہا اور کیا اچھا کہا کہ میں نے ایک بات دیکھی ہے، ان امرا و وزرا کے مقبرے اُجاڑ پڑے ہیں۔ اور مسجدیں اور اولیاء و فقرا کے مقبرے اُجاڑ ہو گئے ہیں، تم سمجھے کیوں، میں نے پھر تصور فہم کا اعتراف کیا، کہا کہ یہ دنیا دار لوگ تھے، جب تک دنیا میں رہے دنیا نے ان کا ساتھ دیا، جب دنیا چھوڑی، دنیا انہیں بھول گئی۔ مقبروں میں اللہ والے ہیں اور مسجدوں میں اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اللہ جی قیوم ہے اس لئے جو بھی اس سے وابستہ ہو وہ بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا داروں کے ہاں اُلو بولتا ہے اور مقبروں اور مسجدوں میں زندگی کی رونق ہے، اس واقعہ کا خیال مجھے بار بار آتا اور یہ وسوسہ بھی کہ کیا بیدل بھی دنیا دار تھا کہ آج مجھے اس کی قبر کا نشان تک نہ ملا۔

میں مکان پر آیا تو میرا لڑکا میرا انتظار کر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی پوچھا کہ آپ کے چہرہ پر پڑمردگی سی چھائی ہوئی ہے، کیا کہیں دوزخ ل گئے تھے۔ زیادہ کوفت تو نہیں میں نے کہا کہ بنو دار نہیں وجہ کچھ اور ہی ہے۔ میں نے اس کو تمام واقعہ من و عن سنایا اور یہ بھی کہا کہ دیکھو نظام الدین اولیاء کے مقبرہ پر کتنی رونق ہے۔ اور کیسی عالی شان عمارت روضہ پر ہے۔ لڑکے نے ایک اور ہی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ بات یہ ہے کہ ان حضرات کی زندگی ہی میں لوگ ان کو پوجتے تھے، تب سے پوجاریوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ بیدل ایک قلندر تھا۔ وہ ان باتوں کی یہودگی سے خوب واقف تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو بھی جب تک زندہ رہا خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور نہ اس نے پیری مریدی کا ڈھونگ رچایا۔ عقیدت مند سینکڑوں تھے اور اب بھی ہیں۔ وہ اپنے سخن میں زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ اس کا احترام کرنے والے اہل علم و فضل ہیں وہ جہلا کی تحسین ناشناس کا دلدادہ نہ تھا جو قبروں کو پوجتے ہیں۔ اب میری بھی آنکھیں کھلیں اور کہا کہ سچ کہتے ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ ”پیر شویا موز“۔

جو کچھ میرے لڑکے نے کہا خود بیدل نے بھی ایک قطعہ میں اس کو واضح

کیا ہے :-

گو گذشتہ رقیقاں زدل فراموش اند کلام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوش اند
 تو سخت بے خبری ورنہ رفتگاں یک سر زجملت مژہ واکردن تو رو پوش اند
 چراغ انجمن حیرت نظر بودند کنوں بہ پردہ دل داغ باغی خاموش اند
 ہنوز زحمت سعی تومی کشند بخاک تو تازہ بار تعلق زستہ دوش اند
 بچشم بستہ نگاہی کہ ایں پری صفقاں نزاہت انجمن شیشہ خانہ ہوش اند
 زرفۂ اندازیں بزم تاسخن باقیست زدیدہ رفتہ حریفان ہنوز درگوش اند
 اب میں نے سمجھ لیا کہ بیدل تو مجھ سے کلام کر رہا ہے۔ قبر والے تو کسی سے
 بولتے نہیں۔ مردے نہیں بولتے زندے بولتے ہیں۔

ایک ماہ بعد مجھے پھر اسی سڑک پر جانے کا اتفاق ہوا۔ دل میں تھا کہ وہیں
 سڑک کے کنارہ پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لوں گا۔ جب یہاں پہنچا تو میری حیرت کا
 اندازہ کون کر سکتا ہے کہ یہی قبر جس کے بالیں پر میں نے گذشتہ ماہ فاتحہ خوانی کی
 تھی ”سیمنٹ“ کے ”پلستر“ سے سچتہ بنی ہوئی تھی اور سامنے اس پر جلی حروف میں
 لکھا ہوا تھا کہ :-

”مرقد مرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ“

قبر کے ایک پہلو پر یہ الفاظ تھے ”بہ توجہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن“ آج
 اتنے عرصہ بعد مجھے الفاظ یاد نہیں رہے مگر یقیناً یہی کچھ تھے، اگرچہ میری حیرت
 آمیز مسرت کی انتہا نہ رہی مگر افسوس بھی ہوا کہ خیر بیدل کو تو اس کی پرواہ نہ
 تھی کہ اس کے قول کے مطابق بعد وفات اس کا کیا فائدہ ہے کہ ”گل کند مقبرہ ام
 بہزاد“ مگر اعلیٰ حضرت کی شان کے شایاں تو کسی طرح نہ تھی۔ اتنا تو مجھے بھی
 معلوم تھا کہ موجودہ والٹی دکن کا مورث اعلیٰ آصف جاہ اول بیدل کا شاگرد
 اور عقیدت مند تھا، مگر یہ راز نہ کھلا کہ اتنی پشتیں گزرنے کے بعد حضور نظام
 کو تعمیر مرقد کا خیال کیسے آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا، کہ یہ سب اہتمام ایک عقیدت مند
 کی خاطر ہی ہوا کہ افسردہ نہ ہو، ورنہ
 اسی مردہ دل آرائش مرقد چہیناست نام تو ہماں بہ کہ لب گور نگیرد

تذکرہ

مرزا عبد القادر بیدل کی نسبت تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر بلفظ اس کا حوالہ دیا جائے تو ایک دفتر بن جائے گا۔ ہم صرف دو تذکرہ نویسوں کی رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک موافق ہے اور دوسری مخالف، موافق میر غلام علی آزاد بلگرامی "خزانہ عامرہ" میں لکھتا ہے کہ

ترجمانی

"بیدل مرزا عبد القادر عظیم آبادی بیدل مرزا عبد القادر عظیم آبادی می کدہ پیرمی کدہ سخندان و افلاطون خم سخندان کا پیر مغاں ہے (بلحاظ شاعرانہ نشیں یونان معانی است)" تخیل، اور بلحاظ حکیمانہ تفکر اس کو شعراء میں دہری رتبہ حاصل ہے۔ جو افلاطون کو حکماء یونان میں۔

مشہور روایت ہے کہ افلاطون "خم" میں ساہا سال گوشہ نشین رہا، می کدہ کے ملازمت میں "خم" نے عبارت میں لطف پیدا کر دیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ معانی کو اگر ملک یونان تصور کیا جائے تو بیدل کو افلاطون کہنا چاہئے۔

"کہ قدرت کہ بطر تراشی او تواند کس میں یہ طاقت ہے کہ اس طرز کو جو اسکی رسید و کرا طاقت کہ کمان بازوئی اپنی ہے پہنچ سکے اور کس میں یہ قوت ہے او تواند کشید چنانچہ خود جس دعویٰ کہ وہ کمان جو بیدل ہی کا زور بازو کھینچ سکتا می جنباند مدعی درگذارد دعویٰ ہے کوئی اور کھینچ سکے۔ چنانچہ اس دعویٰ کا

طرز بیدل، سحر مشکل کہ یہ کیفیت اعلان بانگ دہل وہ خود کرتا ہے۔ اسے
 اعجاز رسد“ مدعی طرز بیدل کا دعویٰ نہ کر، جادو بھی
 بھلا معجزہ کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ اگرچہ بیدل نے اس تعلیٰ سے کام نہیں لیا جو شعراء کا
 عموماً خاصہ ہے مگر کبھی کبھی اسے خود بھی اپنی بلند خیالی کا احساس ضرور ہوتا تھا
 چنانچہ ایک غزل کا ایک شعر ہے :

”سرے نیازی فکر را، یہ بلندی نہ ساندہ ام

کہ تجزیتع نظم من احدے خیال زمیں گستد“

مؤلف خزانہ عامرہ بیدل کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

”رساند پایہ معنی بہ آسماں نہم بلند طبع شناسد کلام بیدل را“

”نشہ فقر جزو دماغش و فسورغ بیدل کے دماغ میں فقر کا نشہ اس حد

روشن دلی نور چراغش“ تک تھا، کہ اس کے دماغ کا جزو بن

گیا تھا۔ اور اس کی روشن دلی اس کے چراغ جان کے نور سے جلوہ فروز تھی۔

میر آزاد نے جو کچھ بیدل کی نسبت لکھا ہے اس کی تصدیق واقعات سے

ہوتی ہے۔ چنانچہ آغاز شباب میں شہزاد محمد اعظم کے ہاں ملازمت اختیار کی۔

شہزادہ کی مجلس میں شعرائے عصر کا ذکر آیا تو کسی نے کہا کہ آج بیدل کا بھی

جواب نہیں۔ شہزادہ نے کہا کہ اچھا اسے کہو کہ ایک قصیدہ لکھے، تاکہ اس کے

مرتبہ کا بھی اندازہ ہو سکے۔ دوستوں نے بیدل کو کہا کہ اس میں کیا قباحت

ہے اگر ایک قصیدہ ولی نعمت کی مدح میں لکھو۔ بیدل نے مناسب یہی سمجھا کہ

مستعفی ہو گیا۔ میر آزاد لکھتا ہے کہ میرا مشرب بھی یہی ہے یعنی ترک مدح اور رد

صلہ، امر کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور یہ امر کی ہمت کا تقاضا ہے لیکن رد صلہ

فقر کی ہمت کے مناسب ہے۔ چونکہ مرزا بیدل اہل دولت و ثروت سے ہمیشہ

کنارہ کش رہا، حق تعالیٰ امراء عصر کو اس کے آستانہ پر لایا، چنانچہ غازی

اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد اور محمد شاہ رنگیلا کے جلوس کے اوائل
 ملک ارکان ہر سلطنت اس کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ہدیہ نیاز
 پیش کرتے رہے، جب نواب آصف جاہ ۱۱۳۲ھ میں کشورِ دکن پر مسلط
 ہو گیا تو مرزا بیدل کی خدمت میں لکھا کہ یہاں تشریف لائیں۔ یاد رہے کہ اول نواب
 آصف جاہ بیدل کا شاگرد بھی تھا۔ مرزا نے بیت لکھ کر بھیج دیا:

دنیا اگر دہندہ خیرم ز جائے خویش

من بستہ ام حنائی قناعت پائے خویش

اگر مجھے دنیا جہان کا مال اس غرض سے دیا جائے کہ میں اپنا گوشہ فقر و قناعت
 ترک کر کے کسی صاحب جاہ کے درِ دولت پر حاضر ہو کر جیبہ سائی کروں تو یہ مجھ سے بعید
 ہے اس لئے کہ میں نے خنائے قناعت پاؤں پر باندھ رکھی ہے۔

یہ صبح ہے کہ مرزا بیدل نے فقر و فاقہ قبول کیا اور قناعت پیشہ تھا لیکن جو
 دولت علم و فن اس کے پاس تھی اس کی احتیاج امراء کو تھی۔ اور یہی حاجت ان کو
 خود مرزا بیدل کی خدمت میں بصد نیاز پہنچ کر لائی۔

میر آزاد لکھتا ہے کہ میر عبد الولی عزلتِ سورمی سے منقول ہے کہ بعد
 وفات مرزا بیدل شعراء شاہجہان آباد دہلی ہر سال مرزا کی قبر پر بتقریب عرس جمع
 ہوتے، اور کلیات مرزا حسب معمول نکال کر مجلس میں لاتے۔ میں اس
 نیت سے کہ آیا مرزا کو میری یہاں آمد کی بھی کچھ خبر ہے، کلیات کھولی تو پہلا شعر
 یہ تھا:-

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم

کہ بر خالم آئی و من مردہ باشم

تو میرے مزار پر آئے اور میں مردہ تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عدم میں کتنا بیچ و
 تاب کھا رہا ہوں، حاضرین نے بھی یہ شعر پڑھا اور میر عبد الولی کی نیت سے
 واقف ہوئے تو بیدل کی کرامت کے قائل ہو گئے۔

بیدل کی کلیات میں ایک لاکھ سے زیادہ ابیات ہیں، غزلیات میں ردیف "ت" میں پانچ سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ اکثر شعرا کی کلیات میں اتنے ابیات نہیں ملیں گے۔

بیدل کے بارہ میں صرف اعتراض یہ ہے کہ خارج آہنگ ہے، یعنی زبان فارسی میں ایسی ترکیبیں اختراع کیں جس سے اہل زبان مانوس نہ تھے اور اسے غیر محاورہ کہتے، مثلاً بیدل نے اپنے بیٹے کی وفات پر ایک مرثیہ مخمس میں لکھا، ایک شعر یہ ہے کہ

ہر گ دو قدم خرام می کاشت
از انگشتم عصا بگفت داشت

جو کبھی دو قدم چلتا تو میری انگلی اُس کے ہاتھ میں عصا کا کام دیتی، شعر

کی لطافت کے علاوہ امر واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ عصا کی ضرورت بوطھوں کو ہوتی ہے جس کے سہارے چلتے ہیں۔ بوڑھا یا بھی دوسرا بچپن ہوتا ہے کہ دونوں کو چلنے میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ اپنے والد کی انگلی پکڑ کر قدم بدم چلتا ہے گویا یہ عصا، پیرے۔ انگلی اور عصا میں مشابہت معنوی اور صوری شعر کی خوبی کو اور بڑھا رہی ہے۔ لیکن "خرام می کاشت" ایک نیا محاورہ ہے، اور اسی پر اعتراض ہوا کہ غیر محاورہ ہے۔ بات یہ ہے بیدل نے اس میں وہ بات پیدا کی ہے جو کسی کے ذہن میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ "خرام می کاشت" کا مفہوم یہ ہے کہ چلنا سیکھتا تھا۔ انگریزی زبان میں محاورہ ہے (اور دوسری زبانوں میں بھی ہے۔ گویا "خرام"

بمنزلہ ایک بیج کے تھا جس کو وہ طفولیت میں بوڑھا تھا۔ آگے چل کر اسی بیج کا نشوونما ہونا تھا۔ لیکن نہ ہو سکا ورنہ میری پیری کا عصا ہوتا۔

خان آزاد "مجمع النفائس" میں لکھتا ہے کہ بیدل نے صرف پرانی لکیر کو پٹینا پسند نہ کیا بلکہ از راہ قدرت نمایاں تصرف بھی کیا۔ ولایتی اور ان کے کا سہ

لیس ہندی اس بزرگوار کے کلام پر حرف رکھتے ہیں لیکن میں تو اس تصرف میں خوبی ہی خوبی دیکھتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حمد بڑی بلا ہے جب اہل سخن جن کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ اہل زبان ہیں بیدل کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر کی بلندی تک نہ پہنچ سکے تو اتنی بات کہنا کیا مشکل ہے کہ خارج از آہنگ ہے شبلی نعمانی مرحوم ہندی ”شعر اعجم“ میں جہاں کہیں بیدل کا ذکر کرتا ہے تو ایسے لفظوں میں کہ قابل ذکر ہی نہیں سمجھتا، چنانچہ صائب کے خاص بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہم عصروں تک کو ادب سے یاد کرتا تھا لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معتد تھا، یہ اس کے صحیح مذاق کی بہت بڑی دلیل ہے، نظیری کو عرقی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے کہ:

صائب چہ خیالی ست شوی ہچو نظیری
عرقی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہاں تک تو مضائقہ نہیں لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقاد ہی یا شہرت عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتے بد مذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کردی اور توبت یہ پہنچی کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری کے کلام پر سر دھنتے ہیں

”بنیاد ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد براں مزید کرد“
(دردود)

اسی طرح مرزا غالب کی تعریف کرتے ہوئے مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ ”مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا، اس لئے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔ عجیب بات ہے، ایران کے انقلاب کی اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی، لیکن خود بخود یہاں بھی

انقلاب ہوا یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سینکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا، مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا، ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستہ پر پڑ گئے تھے، لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، حکیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا، چنانچہ دیوان فارسی کے خاتمہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ اشارہ خاتمہ دیوان فارسی پر ایک تقریظ میں پایا جاتا ہے۔ اس میں وہ عرفی و طالب و نظیری اور علی حزیں کے اتباع کا تذکرہ کرتا ہے مگر بیدل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ یہ اجتہاد اور جدت، جس کی تعریف میں مولانا شبلی رطب اللسان ہیں اشارتاً اسی تقریظ میں ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

”در سلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن و اشتم

کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

سلوک میں جو کچھ بھی میرے سامنے آیا اس سے میں گزر گیا۔ کعبہ کو دیکھا تو

اسے راستہ چلنے والوں کے نقش قدم سے تعبیر کیا۔ بیدل کہتا ہے کہ

”کعبہ و بت خانہ نقش مرکز تحقیق نیست

ہر کجا گم گشت رہ سرمنزے آراستد“

بیدل نے اس موضوع پر مختلف پیاراہ میں کئی اشعار لکھے ہیں، یہ تخیل

جو غالب کے اس شعر میں ہے بیدل ہی سے لیا گیا ہے، بیدل کہتا ہے کہ

در طلب باید گذشت از ہرچہ می آید بہ پیش

گر ہمہ سرمنزہ مقصود باشد جادہ است

چہ دنیا و چہ عقبی سدر اہ تست اے غافل

بیا بگذر کہ از ہر گذشتن ہاست باطل ہا

گر ز دنیا بگذری تشویش عقیٰ ہا مل است
 تاز خود نگذشتہ میبایدت صد جا گذشت
 نیست در دشت طلب با کعبہ مارا احتیاج
 سجدہ گاہ ناست ہر جا نقش پا افتادہ است

چ

اگر از دیر وارستم شوق کعبہ پیش آمد
 تنگ و پوی نفس یارب کجا ہا میبرد مارا
 تخیل بیدل کا ہے غالب نے جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے اس سے وہ
 بات پیدا نہیں ہوتی جو بیدل کے اشعار میں ہے، غالب سے بہتر تو ہمارے علامہ
 اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد

دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقیٰ بھی چھوڑ دے

غالب نے صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ سلوک میں جو بھی پیش آئے اس
 سے گزر جانا چاہئے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں گزرنا چاہئے اور یہ کہ منزل بھی کوئی
 ہے کہ نہیں۔ یہ بات بیدل نے بتائی ہے۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔
 سر دست ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کا نظریہ دربارہ بیدل اور غالب
 کس حد تک صحیح ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شبلی کا مدوح غالب بیدل کی تعریف میں تو رطب اللسان
 ہے اور آپ بیدل کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فارسی شاعری بیدل جیسے
 شعرا نے بگاڑ رکھی تھی غالب نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ شاعری کا انداز بالکل
 بدل دیا۔ ابتدا میں بیدل کی پیروی کی وجہ سے وہ بھی غلط راستہ پر پڑ گیا تھا۔
 مولانا بالفضل اولناتے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ابتدا سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اور
 یہ کہ کس وقت اس کو اس کا احساس ہوگا کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔ غالب کا

فارسی اور اردو کلام غالب نے خود اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔ فارسی کلام جس پر خود غالب کو ناز ہے اسے تو کوئی پوچھنے والا ایران میں بھی نہیں، البتہ اردو کلام کو خاص شہرت خاص وجوہ سے ہوئی۔ غالب فارسی اور اردو کلام دونوں میں بیدل کا مداح ہے۔ اردو میں اس کا ایک شعر ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسدا لڈ خاں قیامت ہے
میری ایک غزل کا یہ شعر ہے :-

کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں

انداز وہ طرز بیدل کا اشعار میں پیدا ہو نہ سکا

یہ کہنا زیادہ حقیقت کے اقرب ہے جو میں نے اس شعر میں واضح کیا ہے کہ غالب نے کوشش تو بہت کی کہ بیدل کا انداز پیدا کر سکے لیکن نہ کر سکا۔ اس لئے اسے چھوڑنا پڑا، فارسی میں بھی بیدل کا مداح ہے۔

مرزا غالب نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اہل علم تو تھوڑے ہوتے ہیں اور ان میں اہل تعلیم محققین سے زیادہ ہوتے ہیں۔ شہرت عوام میں ہوتی ہے۔ جس کو عوام قبول کریں اسی کا کلام زبان زد ہو جاتا ہے۔ دوسرے بات یہ ہے کہ معاصرین کو خیال میں بھی نہ لانا چاہئے اور جوان میں سے مشہور ہوا سے کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا چاہئے اور خود اس کی جگہ ممکن ہونا چاہئے۔ بد قسمتی سے اس وقت مرزا قاتل کی شہرت عام تھی اور اس کے شاگرد بھی بہت تھے، قاتل فوت ہو چکا تھا۔ غالب نے حسب عادت کہہ دیا کہ قاتل ایک ہندو تھا اسے فارسی سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے، قاتل کے شاگرد بھڑک اٹھے تو غالب کی یہ بھی عادت تھی، کہ پھر عذر خواہی پر اتر آتا۔ چنانچہ معذرت کرتا ہوا لکھتا ہے کہ عموماً بزم سخن میں اجاب کہتے ہیں کہ غالب قاتل سے بہتر نہیں کہہ سکتا۔ جواب میں لکھتا ہے کہ :

فیض از صحبت قلیلم نیست رشک بر شہرت قلیلم نیست

یہ صبح ہے کہ میں قاتل کی صحبت کا فیض یافتہ نہیں ہوں اور نہ مجھے قاتل کی شہرت پر رشک آتا ہے۔

مگر آٹاں کہ پارسی دانشمند ہم بریں عہد ورائے و پیمانند
مگر جو پارسی داں ہیں ان کا اس پر اتفاق ہے۔

کہ زابل زباں نبود قاتل ہرگز از اصفہاں نبود قاتل
کہ قاتل اہل زبان نہ تھا اور ہرگز اصفہان کا رہنے والا نہ تھا۔

لاجرم اعتماد را نسزد گفتہ اش استاد را نسزد

اس نے ماننا پڑے گا کہ اس کی زبان چونکہ نکسالی نہیں قابل اعتبار بھی
نہیں اور اس کا کلام سند میں پیش کیا جاسکتا۔

اس کے بعد غالب اپنی نسبت لکھتا ہے کہ میں علی حزیں اور جلال اسیر
کو چھوڑ کر قاتل کا اتباع کیوں کروں۔

دامن از کف کتم چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح رواں معنی را آن ظہوری جہان معنی را

میں طالب آملی اور عرفی اور نظیری کا دامن کیسے چھوڑ دوں، بالخصوص

ظہوری جو روح رواں اور جہان معنی ہے اس کے بعد ظہوری کی تعریف میں

چند آیات ہیں جس کی نسبت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ صائب جیسا شاعر

ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف عام خوش اعتقاد ہی یا شہرت عام پر کرتا

ہے۔ جب مولانا کا مدوح غالب ان حضرات کا مدح ہے تو سمجھیں نہیں آتا کہ

مولانا ان شعرا کو ان کے اصلی مرتبہ سے گرائے کیوں کو ششش کرتے ہیں،

صائب نے سچ کہا ہے :

صائب دو چیز می شکست قدر شعر را

تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

غالب بیدل، ظہوری اور جلال اسیر کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سخن شناس

ہی نہیں سخن گو بھی ہے اور مولانا ان کی مذمت کرتے ہیں۔

اسی مثنوی میں غالب قلیل کے شاگردوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ تم نے جو میرے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ میں نے ”زودہ“ کو غیر محاورہ باندھا ہے۔ می زودہ، غم زودہ، شراب زودہ کونسی ترکیب ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ”قلیب“ ہے :

ہمچناں آں محیط بے ساحل قلم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایت وارد کہ بدیساں بدایت وارد
”عاشقے بیدے جنوں زودہ“ قدح آرزو بخوں زودہ“
کردہ ام عرض ہمچناں ”زودہ“ طعنہ بر بجزد بیکراں زودہ
گرچہ بیدل ز اہل ایرانیست یک ہچوں قلیل نادان نیست
صاحب بیاد دوستگا ہے بود مردہ زیں نمدا کلا ہے بود
اسی طرح محیط بے ساحل اور قلم فیض میرزا بیدل نے ”زودہ“ اپنی مثنوی میں باندھا ہے، یہ بیت داستان محبت کے شروع میں کھلے کہ :

عاشقے بیدے جنوں زودہ قدح آرزو بخوں زودہ
میں نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ تم نے مجھ پر نہیں بلکہ اس بحر بیکراں پر
اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ بیدل ایرانی نہیں ہے لیکن قلیل کی طرح نادان بھی
نہیں یعنی فارسی سے خوب واقف ہے، زبان پر اس کو پوری قدرت حاصل
ہے، جسے غالب ”محیط بے ساحل“ اور ”قلم فیض“ اور بحر بیکراں کہے، ایسے
شخص کا کیا حق ہے کہ بیدل کے کلام پر حرف لائے جبکہ وہ خود غالب کی تعریف
میں زمین و آسمان کے قلم بے ملارہا ہے۔

جس ”اجتہاد“ اور ”حجت“ کی تعریف غالب سے منسوب کی جاتی ہے،
وہ اس کا خود مدعی نہیں۔ لیکن یہ عقیدت کا کرشمہ ہے کہ یہ دعویٰ اس سے منسوب کیا
جاتا ہے، جن کا وہ اتباع کرتا ہے ان کو نام بنام شاعر کرتا ہے، اس نے قلیل کی نسبت

لکھنے کو تو لکھ دیا کہ وہ اہل ایران نہیں۔ لیکن وہ خود بھی ایرانی نہیں ترکمانی ہے، اور اہل زبان شعرا کا اتباع اس نے کیا تو کیا قاتل نے نہیں کیا۔ غالب کو معلوم تھا کہ فارسی شروع سے مسلمانوں کی حکومت کی زبان رہی ہے اور یہ کہ اہل زبان ظہوری و نظیری و عرفی و غیر ہم نے ہندوستان ہی میں فروغ پایا۔

اجتہاد اور جدت بیدل کے کلام میں پائی جاتی ہے اور غالب نے سخت کوشش کی کہ بیدل کی طرز اس کے کلام میں پیدا ہو جائے، وہ خود کہتا ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوا۔ غالب کا اُردو کلام اس کا اپنا انتخاب کر رہے ہے، اگر زبان اور اہل زبان ہی ایک معیار پر رکھنے کا ہو جس پر غالب قاتل کے مقابلہ میں زور دیتا ہے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا اُردو کلام اس پایہ سے گرا ہوا ہے۔ بلکہ اسے اُردو کہندی صحیح نہیں ایک ولایتی اُردو میں کہتا ہے۔

برہمن کی بیٹی آج میری آنکھ میں پری

غصہ ہوا، وگالی دیا، و دگر لری

اسی قسم کی زبان اُردو غالب کی بھی ہے۔

شمار سبجہ مرغوب بیت شکل پسند آیا

تماشا بیک کف بردن مدد دل پسند آیا

یہ تمام غزل ایک لفظ آمد سے فارسی بن سکتی ہے۔ وہ فارسی مصادر کا عام استعمال کرتا ہے، آخر اس نے مومن کا اتباع کیا اور جو چند غزلیں اس نے حکیم مومن خاں کی طرز میں لکھی ہیں وہی اس کا شاہکار ہے، مومن کی زبان اتنی شستہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کی زبان ہمارے زمانہ کی زبان ہے، بلاشبہ ذوق اہل زبان ہے اور اس کے کلام میں بھی روزمرہ ہے لیکن حشو و زواید اور حروف جار کی بھرمار جو اس کے اشعار میں ہے مومن کا کلام اس سے پاک ہے۔ لیکن ذوق و غالب کو ایسے شاگرد ملے جنہوں نے حق شاگردی ادا کیا۔ اور مومن کو کوئی ایسا آدمی نہ ملا۔ غالب ان سب کا جانشین تھا جو غزل

سے پہلے گزر چکے تھے، اب وہ میدان میں اکیلے رہ گیا۔
 یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ غالب کے بہترین اشعار
 فارسی اور اردو میں وہ ہیں جن کا تخیل بیدل کے کلام سے لیا گیا ہے۔ چند
 اشعار کا ہم حوالہ دے چکے ہیں۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے

لہ بیدل کہتا ہے:

آہم ز نار سائی شد اشک و با عرق ساخت
 پستیست گر خجالت شبنم کند ہوا را

غالب کہتا ہے:

ضعف سے گریہ بیدل بدم سرد ہوا
 باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بیدل نے تو ایک بات پیدا کی ہے کہ آہ نار سا ہوئی تو اس نار سائی پر آنسو
 نکل پڑے۔ یعنی آہ اشک میں بیدل ہو گئی۔ آہ تو بلندی کی طالب ہے اور جیتنگ
 رسا ہے ہوا کی طرح بلند ہے۔ لیکن نار سائی کی خجالت نے اس ہوا کو شبنم میں
 تبدیل کر کے زمین کی طرف پستی میں گرایا۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی
 ہو گیا۔ خجالت نار سائی کی اور نار سائی پستی کی دلیل ہے۔ غالب کے شعر میں آنسو
 دم سرد بن گئے، اس لئے پانی کا ہوا ہو جانا اور آیا۔ ایک بدیہی امر جو روز مرہ
 مشاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے ”باور“ استعمال کرنا کوئی عجیب بات نہیں، پانی میں
 حرارت ہوا سے کمتر ہے پانی ہوا حرارت سے ہوتا ہے، سردی سے منجمد ہو گا۔ اس لئے
 شعر غلط ہے، بیدل کا مشاہدہ صحیح ہے۔

”مطلبم ازے پرستی تردماغیہا نبود

یک دوساغر آب دادم گریہ مستانہ را“ (بیدل)

غالب کہتا ہے کہ

بیدل نے کبھی کسی شاعر، ہم عصر یا متقدم کی ہجو نہیں لکھی، اگرچہ اس کے اپنے زمانہ میں حاسد موجود تھے اور اس کے کلام کو "خارج آہنگ" کہتے جو حقیقت

مے سے غرض نشا دہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

غالب نے "مطلب" کی جگہ "مغرض" اور "ترداغی" کی جگہ نشاط استعمال

کئے ہیں، بیدل اور غالب کے تصوف میں یہی فرق ہے کہ بیدل گریہ مستانہ کو آبدار بناتا ہے اور غالب بیخودی چاہتا ہے۔

بیدل کہتا ہے:

سینہ داغ، ویدل نالہ و بدیدہ سرشکم

محبتم ہمہ جا شعلہ کار سوختہ گئی

سینہ پر داغ ہے اور دل سے نالہ نکلتا ہے، آنکھوں میں آنسو ہیں، ہر ایک

مقام پر بوجہ محبت شعلہ کی طرح میرا کام جلنا ہی ہے:

شمع محفل برنجوشی بخت و میلنا شکست

ہر کسے زیں انجن طرزہ دگر نالید و رفت

شمع محفل تو چپکے روتی رہی اور آخر خاموش ہو گئی یعنی بجھ گئی شراب کی صراحی

ٹوٹی تو شراب کے آنسو اٹھیل دئے اس انجن سے ہر ایک اپنی اپنی طرز پر روتا ہوا

بھلے برشعلہ اشکے توشہ، آہی راہب مسد

شمع در شکیہ فرصت طرفہ ساماں کرد و رفت

شمع بزم میں تین باتیں ہیں ایک تو شعلہ اور دوسرے اشک تیسرے دھواں، شمع

کو ایک رات کی فرصت ملی تو اس نے سامان سفر باندھا، صبح کو کوچ تھا۔ محفل تو

شعلہ پر باندھا، زاد سفر یہی گریہ آہوں کا دھواں راہب تھا۔ بزم ہستی سے اس سرد

سامان کے ساتھ نکلی، یہ قافلہ صبح ہوتے ہوئے ٹٹ گیا۔

بیدل کا اجتہاد اور جدت ہے۔ مگر اس نے کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ ”چہار عنصر“ میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ ایک صحبت میں ہمعصر شعرا اور بیدل کو ایک ہی

سحر آہ دگلستان نگہت و بیل فغاں دارد
 جہانے سوئے بیزنگی ز حسرت کارواں دارد
 جہان محسوسات عالم صورت ہے۔ اور اس کی اصل بے صورتی بیبے رنگی ہے۔
 صورتے از بے صورتی آمد بروں
 باز شد انا الیسہ راجعوں (روحی)
 گلستان میں پھولوں کی بو، بیل کا نالہ، صبح کی آہ سب ایک عالم پریشان
 ہے اور یہ کارواں بعد حسرت بیزنگی کی طرف جا رہا ہے۔
 کس ازیر حرمیں سرا یا ساز جمعیت نرفت
 چوں سخن تارفتہ انداز لب پریشاں رفتہ اند
 اس حرمیں سرا دنیا سے کوئی بھی جمعیت کے ساز و سامان کو لے کر نہیں گیا۔
 بات کی طرح جو منہ سے نکلتی ہے پریشاں حال و خاطر ہی گیا۔ بات جب تک دل
 میں ہے اسے جمعیت حاصل ہے، منہ سے نکلی تو بیرونی دنیا میں افواہ کی طرح پھیل
 گئی۔

غالب کہتا ہے کہ

دوئی نکل، نالہ دل، دود چرخ بھفل
 جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
 غالب نے نگہت کی جگہ ”بو“ اور فغاں کی جگہ ”نالہ“ اور ”آہ“ کی جگہ
 ”دود“ استعمال کیا ہے۔

(۳) بیدل کہتا ہے کہ

دامن دل گرفتہ ایم ہمہ خون مستان بگردن مینا

زمین میں طبع آزمائی کرنی پڑی، بیدل تو اس عرصہ زمین کو جلدی ہی طے کر کے فارغ ہو گیا اور دوسرے سرگرداں خاک چھانتے رہے۔ یہ واقعہ اس نے

دل از ہمدوشی مکس تو بر آئینہ می لرزد

کہ اوست منے ناز است این دیوار خم دارد

آئینہ میں بھی آب ہے۔ گویا یہ ایک دیوار ہے جس میں خم سرایت کر چکا ہے۔ آئینہ میں اس مست ناز کا عکس پڑ رہا ہے اور مست کے پاؤں بھی لڑکھڑاتے ہیں اور دیوار آئینہ بھی نمدار، دل کانپ رہا ہے کہ دونوں گرنے پڑیں، مطلب یہ ہے کہ آئینہ اور مثال کی بنیاد ہی کیا، ایک ہستی عدم نما اور دوسرا عدم ہستی نما، یہ خیال بیدل نے اکثر شعرا میں باندھا ہے، دامن گرفتہ ایم ہمہ الخ کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب نے دل کو مجرم قتل ٹھہرا کر اس کا دامن پکڑا ہوا ہے، اصل مجرم تو کوئی اور ہے وہ مینا ہے۔ دل تو دلدار کے قبضہ میں ہے اور دلدار مست اور نشہ مستی میں لے دیا ہے۔ دل خون ہی تو ہے اس کے دامن پر دھبہ ہے تو اس کو مجرم نہ سمجھنا چاہئے۔ یہ ہو مست ناز کے ہاتھوں سے ہوا جس کے ہاتھ میں مینا کی گردن ہے اس نے اصل مجرم کو بجانب لیا اور گردن دیائی، بات یہ ہے کہ دلدار کو قتل کا مجرم قرار دینا آداب و ادب کے خلاف ہے، ”تو گو گناہ من است“

غالب کہتا ہے کہ

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق

لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

مطلب یہ ہے کہ وہ شراب پی کر لڑکھڑا رہا ہے اس کی لغزش مستانہ پر خلق مر رہی ہے۔ اس نے مجرم قتل مینا کی گردن پر ہے کہ نہ وہ شراب پیتا اور نہ مست ہوتا اور نہ لوگوں کا خون ہوتا، موجِ مے کانپ رہی ہے کہ مجھے اصل مجرم نہ ٹھہرایا جائے۔

بیان کیا ہے لیکن کسی شاعر کا نام نہیں لیا۔ کہ کون کون موجود تھے۔
اجتہاد اور جدت پسند یہ امور ہیں، لیکن ترکیب الفاظ غیر مانوس

(۴) خلقے بعد دم دود دل و داغ جگر برد

خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد

مطلب یہ ہے کہ ایک دنیا حسرت زدہ آہیں بھرتی اور داغ جگر لے کر
زیر خاک چلی گئی۔ ان کی مٹی سے گل لالہ اور سنبل کی تعمیر ہوئی ہوگی کہ گل کے جگر پر
داغ اور سنبل کے پیچ و خم میں وہی دہواں ہے جو دل سے آہ کی صورت میں پیچ و خم
کھاتا ہوا نکلتا ہے۔

غالب کہتا ہے کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہو گئی جو کہ پنہاں ہو گئیں

مطلب یہ ہے کہ کیسی کیسی حسین صورتیں تھیں جو مر کر خاک میں مل گئیں

سب تو نہیں ان میں سے کچھ لالہ و گل کی صورت میں پھر سے خاک سے پیدا ہو گئیں۔

(۵) بیدل کہتا ہے کہ

اے خوش آں جو دک از نخلت وضع سائل

لب با لہار نیازند و بایما بخشند،

غالب کہتا ہے کہ

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوالتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوشے سوال اچھا ہے

بیدل کا یہ شعر بھی فرد ہے :

برآستان رحمت مطلق برید نیست

دستیکہ مطلب از لب سائل برآورد

اس حد تک نہ ہونی چاہئے کہ ناگوار گزرے اس لئے جدت پسند طبیعت کو لامحالہ متقدمین کا اتباع بھی کرنا پڑتا ہے، اور اسی سے نئی بات پیدا بھی کی

سب کچھ دیا ہوا تو اللہ کا ہے اور اسی کی رحمت مطلق کی بخشش ہے کہ اغنیاء اور اہل کرم کو داد و دہش کی توفیق عطا ہوئی اللہ تعالیٰ تو بن مانگے دے رہا ہے۔ اس لئے اخلاق الہیہ کا تقاضہ ہے کہ اہل کرم بھی سائل کو بن مانگے دیں۔ ایسا ہاتھ قطع کرنے کے لائق ہے جو سائل کا مطلب اس کے منہ سے کہلوائے۔ سوال میں احساس ذلت ہے۔ اس لئے مزاج سب ہے کہ سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔

(۶) بیدل کہتا ہے کہ

عالم فریب دیدہ عاشق غمی شود

آئینہ خیال تو صورت پرست قیمت

کائنات عالم صورت ہے۔ جو عاشق حقیقت پرست ہیں وہ اس عالم صورت اور اس کی رنگینی حسن پر فریفتہ نہیں ہوتے عالم صورت عاشق کو فریب نظر میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ تیرے خیال حقیقت کا یہ آئینہ دل صورت پرست نہیں ہے۔

چوں نگہ در دیدہ مید آفت خویشی و بس

در نہ ایں بزم خیر حلقہ دایمیش نیست

تیری نگاہ تیری آنکھ کے حلقہ میں ہی رہتی ہے، لیکن تجھے اس سے خارج میں ایک کائنات نظر آرہی ہے، حقیقت میں تو اپنی آفت کا آپ شکار رہے۔ "آفت" کے معنی جوڑنا، پیوستگی، تیری نگاہوں نے جو تاروں کا حال بچھا رکھا ہے اس میں کائنات اسیر ہے لیکن حقیقت میں جسے تو کائنات غیر سمجھ رہا ہے وہ ایک حلقہء دام ہے جو تجھے پھانس رہا ہے۔ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں کائنات کا شکاری ہوں اور کائنات کا شکار تو ہو رہا ہے کہ اس کے حسن صورت پر فریفتہ ہے۔

جاتی ہے، زبان کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔ خود بیدل کا نظریہ اس بارہ میں جو کچھ ہے وہ اس کی ایک غزل سے واضح ہو سکتا ہے۔

اصل میں یہ دونوں باتیں فریبِ نظر ہی ہیں، اگر تو نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ تیری نگاہ تیری آنکھ سے جدا نہیں اور جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے تیرے دیدہ دل کے تصورات ہی ہیں، باہر کچھ موجود نہیں، تو حقیقت میں اپنے آپ پر فریفتہ ہے۔ غلط نہیں ہے تو اسے غیر سمجھ رہا ہے، یہ بزمِ تحمیر تیرا ہی دل ہے،

ہرچہ گذشت از نظر نیست بڑوں ان خیال

بیدل ازیں دام گاہ رفتہ کجی میرود

جو کچھ تیری نظر سے گزر رہا ہے تیرے خیال سے باہر نہیں تیرے ہی دل کے تصورات ہیں۔ اور دامِ خیال سے باہر نکل بھی نہیں سکتے۔ اگر تجھے گزرتے ہوئے یا جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو جا کر کہاں جائیں گے تیرے دل سے باہر نہیں جاسکتے۔

غالب کہتا ہے کہ

ہستی کے مت فریب نہ آجائیوا سد

عالم تمام حلقہ دامِ یہاں ہے

بیدل اور غالب کے اشعار میں تخیل ایک ہی ہے:

(۷) در سایہ ابرو نگہت مست و خرابست

بچوں تیغ ز سرور گذرد عالم آبست (بیدل)

تیرے ابرو کے سایہ کے نیچے تیری نگاہ مست و خراب ہے، ابرو تلوار کی مانند ہے جس میں آب ہے، یہ سمجھ چاہئے کہ ابرو عالمِ آب (میعانہ) ہے اور یہ پانی سر سے گزر چکا ہے اس لئے آنکھ مست و خراب ہے۔

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے (غالب)

بیدل

امروز ناقصاں بکھالے رسیدہ اند
کز خود سری بحرف سلف خط کشیدہ اند

”بہوں“ نہایت غیر مانوس ثقیل لفظ واقع ہوا ہے۔ غالب نے ابرو کو محراب
مسجد سے تشبیہ دی ہے اس کے زیر سایہ یعنی سر پرستی میں خرابات یعنی چشم مست
ہے، بیدل نے ابرو کو تلوار سے تشبیہ دی ہے اور اس کی آب کو شراب کے معنی میں
یا ہے مسجد کے زیر سایہ خرابات تو نہیں ہوتی مگر عالم آب میں جب کوئی غرق ہو تو
خراب حال ہی ہو گا۔

(۸) یاد آزاد است گلزار اسیرانِ قفس

زندگی گر عیشِ دارِ دُعا میدردن است (بیدل)

ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا (غالب)

یہ عالم افساد ہے۔ غم کی تصدیق خوشی کے تصور کے بغیر نہیں ہو سکتی۔
زندگی اور لطفِ زندگی کا احساس موت اور الم موت کے ساتھ ہی ہے۔

(۹) اہی غنچہ دو دم تنگی دل مغنم انگار

زین غم کدہ ہر گاہ الم رفت طرب رفت

غنچہ خود طرب گاہ ہے۔ مگر کھلنے سے پیشتر تنگی دل محسوس کرتا ہے۔ اس

غم کدہ دنیا میں خواہ تنگی دل ہی کیوں نہ ہو غنیمت سمجھنی چاہئے کہ یہی دو دم ہے
چندر و نہ ہے۔

(۱۰) بیدل ایں انجمن وہم دگر نتواں یافت

در وہم مفت تماشا ست طرب باید کرد

نغمہ ہائے غم کو بھی لے دل غنیمت جانئے

بے صدا ہو جائے گایہ ساز ہستی ایک دن (غالب)

آج ناقص طبع خام خیال اپنے زعم ناقص میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس کمال کو پہنچ گئے۔ اور خود سری کی وجہ سے سلف کے کلام پر خط نسخ کھینچ رہے ہیں۔

(۱۱) سازِ ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت

ہر نوائی را کہ دادیدم خموشی می سرود (بیدل)

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروغ کو

خاموشی ہی سے کھلے ہے جو بات چاہے (غالب)

سازِ ہستی سے نعمہ عدم کے سوا اور کچھ آواز کاتوں میں نہیں آئی،

جس کسی سریلی آواز کا میں نے تجزیہ کیا وہ خموشی کا راگ ہی الاپ رہی تھی، ہر ایک شخص جب تک زندہ ہے سرگرم سخن رہتا ہے۔ مگر موت کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وجود و عدم کے درمیان ہے۔ آغاز و انجام ہر ایک شے کا جو ہست ہے "نیستی" ہے۔

(۱۲) رنج دنیا، فکر عقبی، دلغ حیاں، درد دل

یک نفس ہستی بدوشم علمے را بار کرد

ہستی یا زندگی تو ایک تار نفس سے وابستہ ہے، یہ رشتہ ٹوٹا تو انسان

تمام دنیا جہاں کے بوجھ سے سبکدوش ہو گیا، جب تک زندہ ہے دنیا کا رنج اور عاقبت کی فکر اور دلغ حسرت و حراماں اور درد دل برداشت ہی کرنا پڑے گا۔

بندگی، شاہی، گدائی، مفلسی، گردن کشی

خاک عبرت خیز ما صد رنگ تہمت می کشد

انسان خاکی امیر ہو یا فقیر، شاہ ہو یا گدا، غلام ہو یا آقا، مغرور ہو یا خاکسار

غرض ہر ایک رنگ ایک تہمت ہی ہے جو آدمی اپنے سر پر دھر رہا ہے، زندگی چند روزہ ہے جب ہر ایک شے گزشتنی اور گذشتنی ہے تو ان کو ان سے منسوب

بیدل

انکار کا ملاں ہمہ را نقل مجلس است

تا کس گماں برد کہ بہ معنی رسید اند

یہ بر خود غلط ترقی پسند جب کبھی مجلس آرائی کرتے ہیں تو ان کی بحث کا موضوع متقدمین پر حرف گیری ہی ہوتی ہے اور دانستہ یا نادانستہ وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ بس وہی حقیقت آشنا ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوں تو متقدمین کی توہین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مشک آہستہ کہ خود

کرنا تہمت ہی ہے۔ وہ کیا لایا تھا کہ اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بندگی اور شاہی وغیرہ ہیں کی چیز تھی یہیں رہ گئی۔

فرد معاش عشق بتاں یاد رفتگان

تھوڑی سی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے (غالب)

(۱۳) بیدل من واک دولت بیدار سرفقر

کرد نسبت او پینی خاموش سفاں است (بیدل)

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا

کا سہ جم سے میرا جام سفاں اچھا ہے (غالب)

(۱۴) من و سازد کان خود زوشیا چہ حرف است این

جنوں میں فضولی در سر منصور می باشد (بیدل)

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم تو تقلید تنک نفس فی منصور نہیں (غالب)

(۱۵) گر تو نکشانی ز خواب نازمژگان چارہ نیست

از ہمیں چشمیکہ داری نور این دیدہ اند (بیدل)

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگان اٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے (غالب)

ہوید نہ کہ عطار گوید: علم و ہنر ایسی شے نہیں کہ کسی کے کہنے سے علم و ہنر ہو جائے وہ ثابت شدہ حقیقت ہونی چاہئے۔ یہ مرض عام ہے جس سے خواص بھی نہ بچ سکے، غالب میں یہ تعلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور عوام ضرور اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں، یہ کسی بات کو بڑا در منواتا ہے اور جب ایک دفعہ لوگوں نے مان لیا تو تنقید آہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور پھر شہرت اور خوش اعتقاد کی بھی پیدا ہو جاتی ہے مولانا شبلی کے علم و فضل سے کون منکر ہے مگر آپ نے بیدل کی طرف مناسب توجہ نہیں فرمائی۔ غور کرنا چاہئے کہ آپ کا مدوح غالب ہے اور غالب کے مدوح جلال اسیر اور ظہوری اور بیدل، اور بیدل کا سب سے بڑھ کر مداح ہے۔ اب اگر مولانا ان حضرات کی مذمت بمقابلہ غالب کریں اور یہاں تک لکھ دیں کہ انہوں نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا اور غالب نے ان کی پیدا کردہ خرابی رفع کی تو اس صغریٰ و کبریٰ کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے بیدل نے واضح کیا ہے کہ ”تاکس گماں برد کہ بہ معنی رسیدہ است“ اور اس حد تک معنی سے واقف ہے کہ غالب بھی نہیں، یہ ممکن ہے کہ مولانا ہی کی رائے صائب ہو اور مولانا بیدل کی شاعری ہی پر تنقید فرما رہے ہیں مگر بیدل صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکماء اسلام میں اس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ہمارے علامہ اقبال کی یہ رائے ہے کہ برگسان سے فلسفی کے افکار بھی بیدل کے کلام میں ہیں۔

نکات

نکات بیدل میں زیادہ تر بعض فقرات کی شرح ہے جو ”چہار عنصر“ میں واقعات کے ضمن میں بیدل نے لکھے ہیں۔ یہ شرح بھی مثنوی ”عرفان“ اور ”طلسم حیرت“ اور ”طوبہ معرفت“ کے ابیات اور کچھ غزلیات، قطعات اور رباعیات سے کی گئی ہے۔ اس طرح نکات نظم و نثر میں بیان کئے گئے ہیں۔ فارسی علم ادب میں شروع عموماً مقفی عبارت ہی ہوتی ہے جا بجا نظم سے مزین کی جاتی ہے گلستان سعدیؒ اس کی واضح مثال ہے۔

نکات کے شروع میں بیدل لکھتا ہے کہ:

”اگر منکر نبوت نہ باخبرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلی

ایمان داری بھیج جانب چشم بے ادب مکشا“

اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو جو بھی تیرے دل پر وارد ہوتا ہے اس کا احترام واجب ہے اور اگر تیرا ایمان ہے کہ ”اللہ، نور السموات والارض“ اور اسی نور کی تجلیات مشاہدہ ہو رہی ہیں تو کسی طرف بے ادب نگاہ نہ کر۔ اس نکتہ میں بیدل ”وحی“ کی حقیقت بیان کرتا ہے، ”نبوت“ مشق ہے لفظ ”نبا“ سے، معنی خبر دینا، خبر ہر ایک زمانہ کے متعلق ہو سکتی ہے۔ اس لئے نبی مخبر صادق ہوتا ہے اور اخبار صحیحہ نبوت ہے، قلب انسانی پر

جو کچھ وارد ہوتا ہے یا اس سے واردات کے بعد خیالات پیدا ہوتے ہیں اگر اس میں نفسانی تمناؤں اور آرزوؤں کی آمیزش نہ ہو تو اس کو اصطلاح میں الہام یا القا کہتے ہیں۔

علماء اسلام اور دیگر حکماء طبعین والہین نے وحی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ”چوں ندیدند حقیقت روحا نہ زدند“ بات اصل میں یہی ہے جیسے بیدل تحقیق اور تقلید کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ :

انکار می غیر باش تصدیق این است واکر بدل دلیل توفیق این است
تبعیت خلق از حق غافل کرد ترک تقلید گیر تحقیق این است
عموماً لوگ سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرتے ہیں اور وحی بطور حقیقت بیان کرتے ہیں، لیکن اپنی تحقیق سے تصدیق نہیں کرتے۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ ”وحی“ صرف انبیاء کو ہوتی ہے اور انبیاء کو فوق البشر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ قرآن میں ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کی وحی کا بھی تذکرہ ہے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کیا جائے تو ہر ایک شہد کی مکھی نبی ہے، آیات قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ ”وحی“ تحریکات فطریہ ہے۔ اور اس میں غلطی اور غلط فہمی کا امکان نہیں، تمام کائنات میں ہر ایک شے ”وحی“ کے تحت ہی کام کرتی ہے اور کبھی غلطی نہیں کرتی۔ لیکن انسان کی حالت کچھ مختلف ہے۔ وہ غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے، دیگر اشیاء نہ غلطی کرتی ہیں نہ ترقی، اس لئے غلطی اور ارتقاء لازم و ملزوم ہیں۔ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے۔ ورنہ وہ دیگر حیوانات کی طرح ہوگا۔ انسان کو بھی وحی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح دیگر اشیاء کو لیکن انسانیت کی مناسبت کے لحاظ سے انسان کو وحی بلقطہ ہوتی ہے اور کوئی خیال انسانی قلب میں بلا حروف پیدا ہی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

”وحی“ کا سرچشمہ حقیقہ کائنات ہے جس کی تعریف ہے ”لاریب فیہ“

بیدل

جس میں کوئی الجھن نہیں اور اسی الجھن کا نتیجہ تذنب اور شک و شبہ ہوتا ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہوتی ہے کہ ”اتل ما اوحی الیک من الکتب“ (تلاوت کرو وہ جو تجھے کتاب (کائنات) سے وحی ہوتا ہے) یہ وہ حقیقت ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے، اس لئے کہ ہر ایک شخص کے مشاہدہ اور تجربہ میں یہ بات آتی ہے۔ بلاشبہ ہم کسی شے کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتے، لیکن جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے اور ہر ایک شخص مشاہدہ کر رہا ہے اور ایک ہی طرح مشاہدہ کرتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ علامہ محمود شبستری ”گلشن راز“ میں کہتا ہے کہ :

ہر آن کو را کہ جانش در تجلی است

ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است

جس کسی کا باطن نورانی ہے وہ جانتا ہے کہ تمام کائنات کتاب الہی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کا باطن خواہ اس معنی میں نورانی نہ ہو جو علامہ مدوح کے ذہن میں ہے وحی کی حقیقت سے فطرتاً واقف ہے خواہ اس کا اسے علمی شعور نہ ہو جیسے کہ دیگر حیوانات کو نہیں ہوتا۔ چونکہ ہم نے اس موضوع پر علاحدہ بحث کی ہے اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے سیر دست ہم بیدل کا نظریہ بیدل کے الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔ لیکن اتنا سمجھ لینا مقدم ہے کہ ہمارے پاس تحقیق کا ذریعہ صرف بصورتِ بصیرت ہے، ایسی بات جو ان سے باہر ہو یا جس کی تصدیق بصورتِ بصیرت نہ کرے محض ”وہم محال اندیش“ بیدل کے لفظوں میں ہے۔

بیدل نکات میں لکھتا ہے کہ :-

”در عالم آثار کثرت بسازانہ و پیرداختن، سرمایہ فرصت در

باختن است، اگر چراغ بنیش قابلیت نوری دارد جز در انجمن

مفروز، تا با فسون خیال از تہلی کماہی چشم نہ پوشد، در حضور آبلو

کرشمہ جمال یکسب حرمیں نکوشی“

فرصت داری جزا گہی کار بند
برائینہ ات تہمت زنگار بند
ہر چند بود یک مژہ و اگر دن چشم
باز است در حضور نہا بند

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں جو محسوس ہو رہی ہے حقیقت جلوہ گر ہے اور یہ حقیقت اس سے باہر متصور نہیں ہو سکتی۔ یعنی معرفت انہی صورتوں کے صحیح تصور پر موقوف ہے۔ اس لئے اسے مشاہدہ کرتے ہوئے دور از کار تو قعات اور ادہام سے ذہن خالی ہونا چاہئے۔ اگر ہم اس عالم کو دیکھتے ہوئے کسی اور عالم ادہام میں سرگرداں ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تحقیق سے ہم بہت دور ہیں۔ اگر تیری آنکھ میں نور بصیرت ہے تو اس چراغ بنیش کو اسی انجمن عالم کثرت میں روشن اور اس کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ کرنا چاہئے اور قیاس و گمان و وہم سے قلب کو پاک و صاف رکھنا چاہئے۔ قلب انسانی مثال آئینہ ہے اس لئے اگر آئینہ کدورت اور ادہام سے صاف ہو گا تو کائنات خارجی کا عکس بھی اسی نسبت سے قلب میں صاف ہو گا۔ اور اگر تو نے ایسے قیاسات وغیرہ سے زنگار آلود کر دیا تو عکس بھی اسی رنگ میں دیکھے گا، اور یہ تیرے اپنے قیاسات اور ادہام ہی ہونگے جو خیالات خام اور باطل ہیں اس کے بعد جو کچھ تیرے قلب پر صبح تذکرہ و تفکر سے وارد ہو گا وہ حق ہے۔ جب اللہ ہی نور السموات والارض ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر تو آنکھیں کھول کر مشاہدہ کرے گا تو اسی نور کی تجلیات کے حضور اپنے آپ کو پائے گا اور اگر قیاسات وغیرہ میں الجھ گیا تو حضوری سے دور بھٹک کر گمراہ ہو گیا۔ اس ”نکتہ“ کی تشریح اس کے بعد دوسرے ”نکتہ“ میں اس طرح کی گئی ہے :-

”از فرط گر سگی کہ حرارت غریزی بہ وداع قوامی دامن می

چنید صاحب ریاضت اشکال غریبہ می بیند یعنی بخارات کہ

مادہ تخلیق است ہر گاہ بدماغ صعودی نماید تمثال ہائے عالم
 خواب در میں بیداری نقاب می کشاید، چمنایں ہنگام نزع نیز صور
 مثالی بر طالع منکشف می گردد و آں از باقیات عالم خیال ست
 و گرنہ در نفس الامر تحقیق آں دشوار و محال مثل شعلہ چراغیکہ چوں
 روغنش کم شود سراپا در میگرد و روشن تر میگردد و تا باندک فرصتے
 بمیرد، چوں غلبہ جمیع موجد صفر است و غلبہ صفر مادہ ایجاد سودا و
 جمعی را کہ با مبداء توجہ است از سطور این بخار ہا بطور حقائق و
 معانی می خوانند، و فرقہ را از حقیقت بے خبر نسبت اشکال دیو و
 جن میدانند، چہ دود ہا ازین آتش نامشعل متصاعد نگردید، و
 چہ سواد ہا کہ ازین صفرائی سوختہ بطوفان نرسید، اگر ہوشیست باید
 فہمید کہ غیر اشیائی محسوسہ معین ہر چہ در خیال پر تواند از دواہمہ
 سوئی است و خلاف قاعدہ اتفاق آنچہ در نظر ہا مشکل یا بند
 غبار بینائی

خلقتست دریں جنوں سرائی نیز نگ زندانی اختراع چندیں فرہنگ
 من بندہ آنکہ در ادب گاہ ثبات جویش بمنوں نسا زد و سیر ی رنگ
 بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ صبح حواس اور صبح دل و دماغ، صحت
 جسم کے ساتھ ہی ممکن ہے چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ
 گر عین و گراقتباس دریافتہ در انجن حواس دریافتہ
 بردامن جسم پاک تحقیر مدفہ حق را بہیں لباس دریافتہ
 تمام علوم اور حکمت اسی خاکی جسم کے ساتھ ہی ہم پر منکشف ہوئے
 اور ہوا ہے، ہیں یہی حواس ہیں اور یہی قلب اگر یہ نہ ہوں تو ہمیں نہ کسی بات
 کا شعور ہونہ علم اس لئے جسم کو حقیر شے نہ سمجھنا چاہئے، ہمیں ”حق“ کی
 معرفت اسی لباس جسم میں ہو رہی ہے جو ہم نے اور تمام مادی کائنات

نے پہن رکھا ہے۔ اور یہ لباس صورت کتنا حسین اور کتنا رنگین ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نکات ہی میں لکھتا ہے کہ:-

ریاضت صفائی باطن می آورد بشرط اعتدال، وضعف بر قواس می
گمارد با فراط کمال، مدعا ازین کسب مواد فاسدہ را با صلاح آورد
است، نہ اجزائے مصالح را نیز فاسد کردن، این جائز نگار از
طبیعت زدودن است، نہ آئینہ را بمشق صیقل فرسودن، بحکم قدرانی
وجود از انبیاء پیچ کس ریاضات شاقہ ساخت الا بقدر اصلاح مزاج
و بخوردن خود نیز نہ پرداخت مگر بمقدار ضرورت احتیاج،

بنیاد جسد کہ کارگاہ اسماست روزی دوز حکمت طبعی برپاست
بر صوم و صلوة بر میفزایند کاینجا تعدیل بہر امر کمال عرفاست
ریاضت کی غرض اتنی ہے کہ باطن میں صفائی پیدا ہو اور اس کے لئے
بھی اعتدال شرط ہے، اگر اعتدال سے بڑھے تو افراط میں الجھ کر رہ جاؤ گے،
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قولے میں ضعف پیدا ہو جائے گا، ریاضت
کی غرض وغایت یہی ہے کہ فاسد مادہ رفع ہو اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب
ہو، یعنی جو خرابی باطن میں ہے اس کی اصلاح ہو جائے، نہ یہ کہ جو اجزاء و مصالح
ہیں ان کو فاسد بنایا جائے۔ طبیعت سے زنگ کدورت رفع کرنا مقصود ہے،
نہ کہ مشق صیقل سے آئینہ کے وجود کو نابود کرنا اس سے تو احکار نہیں ہو سکتا کہ
انبیاء سے بڑھ کر ریاضت شاقہ اور مجاہدہ حادہ کسی نے نہیں کیا۔ لیکن ان نفوس
قدسیہ کو بھی اس وجود کی فطری ضرورت کا احساس تھا۔ جس حد تک اصلاح
مزاج کا تقاضا تھا انھوں نے خورد و نوش و خواب کی احتیاج میں کمی کی۔
اس جسد انسانی کی بنیاد ہی اسی سے قائم ہے۔ چند روزہ زندگی بھی اسی خورد
و نوش اور ضروریات سے بسر ہو رہی ہے اس لئے تیرے لئے یہی مجاہدہ
کافی ہے کہ ارکان اسلام صوم و صلوة پر کچھ اور زیادہ نہ کر، کیونکہ تعدیل

ہر ایک امر میں اہل معرفت کا کمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رہبانیت میں حظِ نفس ہے اس لئے نفس انسانی رغبت سے کرتا ہے، اعتدال قائم رکھنا نہایت سخت مجاہدہ ہے۔ اور اسے قائم رکھنا سخت مشکل ہے۔ اس تشریح کے بعد اس ”نکتہ“ زیر بحث پر غور کرنا چاہئے۔ بیدل کہتا ہے کہ ”بھوک کی شدت سے حرارت غریزی قوی کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ جب تو لے کمزور ہوتے ہیں تو صاحب ریاضت عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بخارات مادہ تخمیل ہیں جب یہ بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تو عین بیداری میں عالمِ خواب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اسی طرح نزاع کی حالت میں بھی مرنے والا دو تصورات جو اس کے ذہن میں ہی محفوظ ہوتے ہیں مشاہدہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ اس کے اپنے خیالات ہی کا عکس ہوتا ہے، نفس الامر میں اس کی تحقیق محال ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چراغ جب اس میں تیل ختم ہونے کو ہوتا ہے تو سنبھا لالیتا ہے۔ اور ایک تخت پوری روشنی دیتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد گل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی سنبھا لالیتا ہے، اور اس میں زندگی کے آثار پوری مثال کے ساتھ محسوس ہوتے ہیں مگر جلد ختم ہو جاتا ہے، بھوک کی شدت سے صفرا پیدا ہوتا ہے اور غلبہ صفرا سے سودا کا زور ہوتا ہے، وہ لوگ جن کی توجہ خدا کی طرف لگی ہوتی ہے جب بخارات دماغ کی طرف چڑھتے تو خیال کرتے ہیں کہ ہم پر معانی و حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے اور ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور جو حقیقت سے بے خبر ہیں وہ دیوانہ جن اور پری دیکھتے ہیں، اس اہتش نامشعل سے کتنا دھواں اُٹھتا رہتا ہے جو دماغ کو تاریک کرتا ہے اور اس صفرائی سوخت سے کتنا سودا پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے سروں پر کھلتا ہے، اگر ہوش و حواس درست ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ بھی غیر اشیاء محسوسہ و معینہ خیال میں منعکس ہوتا ہے سب سودائی و ہم ہے اور خلاف

قاعدہ جو کچھ نظر آئے وہ غبارِ بینائی ہے۔

اس عالمِ نیرنگ میں جس کو ”بیدل جنوں سرا“ سے تعبیر کرتا ہے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں جو شرب جنوں کے نشہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بے پرکی اڑاتے ہیں جس کی تصدیق مشاہدہ اور تجربہ سے نہیں ہوتی، بیدل کہتا ہے کہ میں تو اس اہل نظر محقق کا غلام ہوں جو اس ”ادب گاہ ثبات“ میں اپنے ہوش و حواس درست رکھتا ہے، اگر بھوکا ہے تو مجھوں نہیں بنتا اور اگر پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو رنگ ریاں نہیں مناتا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

ما کذب الفواد ما راعی، در رسول، نے جو کچھ مشاہدہ کیا اس میں اس کے
ما زاع البصر وما طغی لقد، دل نے کچھ جھوٹ نہیں ملایا، اس کی نظر نہ
راى من آیت ربہ الکبریٰ، کسی اور طرف بہکی اور نہ اپنے اصلی مقام سے اٹھا
و ما لهم به من علم ان، کچھ شک نہیں کہ اس نے اپنے پروردگار کی
یتبعون الا الظن وان، قدرت کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے، (مشرکین
الظن لا یغنی عن الحق، جو کچھ کہتے ہیں) ان کو اس کی تحقیق تو نہیں وہ تو
شیاء۔ نری شکل پر چلتے ہیں اور شکل کو حق سے دور کر

(۲۶) نسبت بھی نہیں۔

یہ نکتہ ازبر کرنا چاہئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

”ما کذب الفواد ما راعی“ کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئے۔

یہ ”کذب“ کیا ہے جو وہ نفسانی آرزو و نفس یعنی مشاہدہ میں ملا دیتا ہے،

خواہشات نفس، تمنا، دور از کار توقعات، قیاسات ہیں۔

آں حضرت کے ”مقام محمود“ کی بلندی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے

کہ اس جادہ ارتقاء کے ہر ایک مرحلہ اور ہر ایک منزل پر ”انا عبد اللہ“ ہی کہتے ہیں، اور بار بار فرماتے ہیں کہ ”ہمارا خدا کا حق معرفتک“ اسی سے معلوم ہوا کہ آپ کے ظرف میں کتنی وسعت تھی، بیدل نے شنوی محیط اعظم میں کل انبیاء کی کیفیت بیان کی ہے کہ سخاوت و وحدت سے ہر ایک نے بقدر استعداد پیمانہ لیا اور اپنے متبعین کو بھی اسی پیمانہ سے پلایا۔ اُمت نوح تو اتنی بدمست ہوئی اور عالم آب میں اس حد تک غرق ہوئی کہ پھر نہ ابھری۔ حضرت موسیٰ نے ساغر ”تشبیہ“ کو دور دیا۔ اُمت موسیٰ اسی مادی دنیا کی نیزنگی میں مدہوش رہی۔ حضرت عیسیٰ نے قدر تنزیہہ حواریوں کو پیش کیا۔ یہ منصور کی طرح ”انا الحق“ کہتے ہیں۔ اُن حضرت نے تشبیہ اور تنزیہ یعنی کثرت اور وحدت دونوں کی رعایت کی۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھایا اور اچھی طرح ذہن نشین کر دیا کہ ممکنات کبھی واجب کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ”لیس کمثالہ شی“ میں تنزیہ ہے اور ”ہو السميع بصیر“ میں تشبیہ اس لئے اسلام جس کے ساتھ اُن حضرت مبعوث ہوئے کامل دین ہے۔

بیدل نے ان نکات میں نفسیات کا ایک اہم مسئلہ حل کیا ہے، وہ یہ کہ جو کچھ خارج میں محسوس ہوتا ہے وہ معلین و شخص ہے ہر ایک شخص اشیاء کو ایک ہی طرح اور ایک ہی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے بشرطیکہ اس کے حواس درست ہوں۔ اس لئے اس کتاب کائنات میں کوئی ”ذیب“ کوئی ”الجھن“ کوئی شک و شبہ نہیں، انہیں کا عکس یا ”ظل“ حواس کے ذریعہ قلب انسانی پر پڑتا ہے خواہ بالا ارادہ ہو یا بالا ارادہ ہے۔ ناممکن ہے کہ ہم آنکھیں رکھتے ہوئے سورج کو تو دیکھیں اور اس کی روشنی اور اس کے ماحول سے چشم پوشی کریں۔ تمام ارض و سما ایک ہی نظر میں ہمارے آئینہ دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ثبت ہوتے ہیں کہ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ ان کو محو کر سکے۔ یہ عکس ہمیشہ کے لئے قلب میں محفوظ ہو جاتا ہے، اگر یہ عکس من و عن ایسا ہی

ہے جیسا کہ خارج میں ہے، یعنی ہمارے ذہنی تصورات اور خارجی اشیاء جن کے یہ تصورات ہیں ایک ہی جیسے ہیں جسے اصطلاح میں "میں" کہتے ہیں تو یہ "حق" ہے اور اہل ذکر و فکر جانتے ہیں کہ یہ "باطل" نہیں۔ اگر کوئی باطل پرست یہ کہے کہ یہ "مایا" اور "فریب نظر" اور "ہیچ" ہے تو بیدل ایک رباعی میں کہتا ہے کہ "از باطل سخن حق کہ باور دارد" جو شخص کائنات کو باطل کہتا ہے وہ خود بھی تو باطل ہے اس لئے کہ کائنات کا ایک جزو وہ بھی ہے۔ اور بقول بیدل "باطل از باطل پر وید حق ز حق"۔ باطل سے باطل ہی پیدا ہوگا، اس باطل کا جو دعوائے ہے باطل ہی ہوگا۔ بیدل ثنوی "عرفان" میں کہتا ہے کہ ان باطل پرست لوگوں کو اتنا شعور نہیں کہ "یقین خستہ در ہر پردہ ظن" وہ کچھ بھی کہتے ہیں یقین کے ساتھ ہی کہتے ہیں۔ اگر کہتے ہیں کہ یہ عالم باطل ہے تو ان کو اتنا شعور ہونا چاہئے کہ وہ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ، اور اگر کہیں کہ سچ کہتے ہیں تو یہ حق اس بینہ جہاں باطل میں کہاں سے آگیا۔ غرض انسان جو کچھ بھی کہے یا تصور کرے اس کی تہ میں "حق" کی موجودگی واجب ہے اور اگر نہ ہو تو یہ محض وہم و محال اندیش ہے۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کی تحقیق اس کی اپنی حد تھ ہے۔ ایک رباعی میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ سایہ خاک پر تو سیاہ نظر آتا ہے لیکن پانی میں مثال ہے جس نے سایہ خاک پر دیکھا اس نے اسے سیاہ کہا۔ وہ بھی سچا ہے اور جس نے پانی میں دیکھا اس نے مثال سے تعبیر کیا، یہ بھی سچ کہتا ہے دونوں حالتوں میں سایہ ایک مشترک شے ہے، تنازعہ اگر کچھ ہے تو اس کی صورتوں میں ہے تو یہ شاہد کی حد نظر پر موقوف ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ باطل دیکھتے ہیں۔ اس حد تک مشاہدہ میں خارجی اشیاء اور ذہنی کے مطابق ہے اسی کا شعور "علم" سے موسوم ہوتا

ہے چنانچہ بیدل لکھتا ہے کہ

چلیست علم، اصل قدرت بیچوں	نظم جمعیت ظہود و بطون
حسن مرآت عالم و معلوم	نور تمیز حاکم و محکوم
نزد اہل حقیقت ایجاد	بیچ چیزے بغیر علم نژاد
ہرچہ بینی ز مفرد و ترکیب	دارد از علم جو ہر ترتیب

علم کیا ہے؟ قدرت بیچوں کی اصل، جو ظاہر یعنی آفاق یا خارج میں ہے اور جو کچھ ذہن یا قلب انسانی میں اس کا عکس ہے ان میں عین مطابقت کا شعور علم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں عالم اور معلوم دونوں جلوہ نما ہوتے ہیں یعنی جاننے والا عالم اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسے کسی شے کا علم ہو اور وہ شے معلوم اسی حالت میں کہلا سکتی ہے جب اسے جاننے والا بھی کوئی ہو۔ اس لئے عالم و معلوم میں ربط علم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہمیں کسی شے کا علم نہ ہو وہ بمنزلہ عدم ہے۔ اس لئے ہر ایک شے معلوم کا ظہور یا انکشاف یا احساس یا ادراک علم کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، نتیجہ واضح ہے ہر ایک شے خواہ مفرد ہو یا مرکب علم ہی سے اس کی حقیقت ہے جس سے وہ مرتب ہوئی ہے۔

اس نظم کا اول اور آخری بیت غور طلب ہے۔ یہ کہ اس کائنات کا نظم و نظام ایسا پختہ ہے کہ اسے کوئی طاقت غیر اللہ توڑ نہیں سکتی۔ اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا پیدا کردہ نہیں۔ اسی کائنات سے ہمارے تمھارے علوم ماخوذ ہیں اگر یہ باطل ہو تو ہمارے علوم بھی باطل ہیں بقول بیدل "باطل از باطل بروید حق ز حق" اس لئے اس کائنات کی پیدائش میں بھی علم ہی کا رفا ہے، جسے لسان مذہب میں علم الہی کہتے ہیں۔ اسی آئینہ کائنات میں اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادت کی قدرت اور خود کائنات معلومہ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ تصوف کی جان اور اصل اصول ہے۔

اس لئے اشیاء محسوسہ، معینہ و مشخصہ کے سوا اگر کچھ نظر آئے تو بقول بیدل محض سودا ہے۔ ہم نے ”چار عنصر“ میں سے بعض واقعات کا حوالہ دیا ہے جو بیدل نے اپنی سرگزشت کے ضمن میں قلم بند کئے ہیں۔ اگر جنات بھی ایک مخلوق ہیں اور موجود ہیں خواہ وہ غیر مرئی ہوں تو بحث تفصیل حاصل ہے۔ اور اگر نہیں تو محض قوت یا ہمہ کار شمع ہے، اور بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ ایسی مخلوق ضرور موجود ہے۔ لیکن اکثر اوقات لوگ عالم اوہام میں وہ کچھ تصور کرتے ہیں جس کی تحقیق نفس الامر میں نہیں ہو سکتی۔ یہ محض جنون اور واہمہ کا غلبہ ہے بہر حال بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ خارج یا آفاق میں موجود ہے خواہ اس کا وجود مرئی یا غیر مرئی ہو اگر اور کچھ نظر آئے تو باطل ہے، یا زہے کہ ”باطل“ کا مفہوم محض عدم ہے، نہیں جس کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ باطل وہ ہے جو بے نتیجہ اور عبث ہو جس سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو ترک کر سکتا ہے۔

بیدل نکات میں کہتا ہے کہ :-

”گفتگوئے ارواح و مثال بیروں اعتبارات جسمانی مہمل است،
و گیر و دار عالم اجسام ہے بادہ مثال و ارواح معطن، جسم را
قبل از آثار پیدائی در حقیقت روح مخفی فی بدن است چون
کیفیت کوزہ در گِل، و روح را بعد از نشانی ظہور، اجزائی جسم
منزوی دیدن، چوں صورت خیال در دل، تا حضور صورت معرض
جلوہ نیاید معنی ہیولا در جہاں صور باطن اشکال بودن است و
صورت مرتبہ ہیولا معنائی ہماں کیفیت کشودان، اگر ہیولایہ صورتے
متصور است صورت زکجائی جو شدہ اگر صورت از لباس قدرت
عاریست ہیولا را کہ می پوشد“

ہر چند خاکسار ہیولائی گل است گل نادیدہ ساز ہیولائے خاک شد
رمز صفائے آئینہ ہا و اشگا فتم اسم کدورت است کہ از سنگ پاک شد

چوں باز عرض نوبت نگار وارسید آئینہ رابنگ ہماں اشتراک شد
خوشید اگر چہ شب بسک بال می زند روزانہ دیدہ کہ با وج سماک شد
یک رشتہ بود پا و سرے اعتبار و ہر خلق بہ بیج و تاب تو ہم ہلاک شد

اس نکتہ کا مفہوم یہ ہے کہ ارواح اور مثال کے بارہ میں بحث اس مادی کائنات سے باہر بالکل بے معنی بات ہے اور مادہ یعنی عالم اجسام میں جو یہ گیر و دار کا شور برپا ہے روح کے بغیر متصور نہیں ہو سکتا۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک شے یا حقیقت جسم اور روح ہے جسم کے ظہور سے پہلے یہ جسم روح محقق یعنی غیر مرئی یا پوشیدہ تھی، جیسے کیفیت یا صورت کوزہ مٹی میں ہو۔ مٹی میں یہ قابلیت ہے کہ اس سے کوزہ بنتا ہے۔ اور اگر یہ قابلیت نہ ہوتی تو کوزہ ظہور میں نہ آ سکتا، اسی طرح روح میں اجزاء جسم یا مادہ پوشیدہ ہیں جو ظہور کے بعد مشہود ہوئے، جیسے صورت خیال دل میں، مطلب یہ ہے ایک قابلیت ”بالقوہ“ موجود تو ہوتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور یا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ ظہور میں آئے جیسے ایک دانہ میں درخت، جب یہ دانہ زمین میں بویا جاتا ہے اور پھوٹتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ قابلیت شجر کی صورت میں رونما ہوتی ہے یعنی یہ قابلیت اب ”فعل“ میں آئی اور ہمیں معلوم ہوا کہ پہلے پوشیدہ یا ”بالقوہ“ دانہ میں موجود تھی، اس لئے ہر ایک شے جو بالقوہ ہو یا بالفعل ضرور ہے کہ اس کا ہیولا پہلے موجود ہو۔ عدم موجود گرد و ایں محال است، عدم موجود نہیں ہو سکتا، یہ ناممکن ہے لیکن ہیولا بھی ایک قابلیت صورت ہے۔ یعنی صورتیں اس میں بالقوہ موجود ہیں اور خود بھی بے صورت نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو یہ تمام صورتیں کہاں سے آئیں ظاہر ہے کہ ہیولا ہی کی پیداوار ہیں۔

اگرچہ آدم کی پیدائش طین سے ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ ”طین“ میں قابلیت یا بالقوہ آدم موجود تھا جب یہ قابلیت فعل میں آئی تو آدم کا

ظہور ہوا۔ قرآن میں بھی ہے کہ انسان کی تخلیق کی ”ابتدا“ طین سے ہوئی، آدم ظہور میں نہ آیا تھا لیکن ”طین“ پہلے موجود تھی، لفظ ”ابتدا“ قرآن میں ”خفی“ کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو شے ”خفی“ تھی اس کا ظہور ہوا، قانون فطرت یہ ہے کہ ہر ایک شے جو ظہور میں آتی ہے اس کا مادہ یا ”ہیولا“ پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ

بیچ شکلے بے ہیولے قابل صورت نشد

آدمی ہم پیش ازاں کا دم شود بوزینہ بود

اہل علم و حکمت کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کوئی شکل بلا ہیولا قابل صورت نہیں ہوتی، اس لئے آدمی بھی پیشتر اس کے کہ آدم سے موسوم ہو بند تھا۔ بیدل نے اس شعر میں ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ہیولا بھی ایسا ہونا چاہئے جس کی صورت اس شکل سے ملتی جلتی ہو جو اس سے قانون ارتقاء کے تحت پیدا ہو۔ آدمی طبقہ حیوانات میں ممتاز درجہ پر نظر آتا ہے اس لئے اس کا ہیولا اس طبقہ میں ایسا ہونا چاہئے جو اس سے بہ نسبت دیگر حیوانات زیادہ تر مشابہ ہو اور یہ بند ہے۔

مسئلہ ارتقاء پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ مردست ہم صرف بعض نکات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ درحقیقت جسے روح اور مثال اور جسم کہتے ہیں ایک ہی حقیقت کے مختلف نام اور اس کے ارتقائی درجات ہیں۔ عالم اجسام یا مادی دنیا صرف عالم صورت ہے ”باصرہ“ میں رنگ اور روپ، ”لامسہ“ میں سختی و نرمی، سردی و گرمی اور علیٰ ہذا القیاس لیکن ان صورتوں میں متعلق ”روما ہوتے ہیں، اور یہ اصل شے ہیں، حقائق مجردہ“ کا احساس تو انسان کو ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان کو جو اس اسی لئے دئے گئے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں ان کا احساس ہو۔ ناممکن ہے کہ انسان کو بلا صورت حقائق شیاء کا علم ہو۔ اس لئے مجرد معانی دل میں بلا حروف

محسوس نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی خیال بلا صورت مثالی ذہن میں متصور نہیں ہو سکتا۔
بیدل نکات میں روح و مثال و جسم پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔ روح اصل
حقیقت ہے لیکن یہ غیب ہے اور غیب ہی رہے گی، بیدل کے الفاظ حسبِ یل
ہیں:-

”غیب مطلق مرتبہ ایست کہ باعتبار مفہوم مجاز حقیقۃ الحقائق
نامیدہ اند، و غیب اضافی نشاء کہ بحسب لطافت تمام عالم
ارواحش معین گردانید، و غیب متمثل لطافتی موسوم مثال بحکم
میلان کثافت آرائی، و غیب مصور کیفیت منقوش اجسام بقتضای
کمال کثافت یعنی ختم مرتبہ پیدائی، پس غیب مطلق یعنی حقیقت
الحقائق خفائی مض است منقطع الاشارات متعبر حقیقت ذات و
غیب اضافی خفائی معین نفی اشارات مطلق اسماء و صفات و غیب
مصور شہود و لیتینی حسن و شعور“

ہمہ غیب است شہود ایں جان نیست جملہ اخفاست نمود ایں جان نیست
اصل ہر سوسن و گل نیز نگ نیست خبر ہمیں سرخ و کبود ایں جان نیست
شعلہ خاکستر محض است آخر جز دمی گرمی دود ایں جان نیست
تو اں جلوہ مطلق دیدن آنکہ ایں پردہ کشود ایں جان نیست
اعتبارات ہمہ اوہام اند تو عدم باش وجود ایں جان نیست
مفہوم اس نشر و نظم کا یہ ہے کہ جسے ہم ”شہود“ سے موسوم کرتے ہیں وہ
بھی غیب ہے۔ اس غیب کی حقیقت کا ہمیں احساس تک نہیں ہو سکتا
کیونکہ وہ مطلق مجرہ ہے۔ اس کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اصلاح تصوف
میں اسے غیب مطلق یا حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ اس مرتبہ غیب الغیب یا
”لا تعین“ میں تمام اشارات منقطع ہیں، اس مرتبہ میں چونکہ وہ کسی اسم و
صفت سے موسوم و موصوف نہیں اور ہم بلا اسم و صفت کچھ سمجھ ہی نہیں

سکتے اس لئے اس کو الہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کلمہ توحید کے شروع میں اسی اشارت کی نفی کی گئی ہے "لا الہ" لیکن فہم و تفہیم کے لئے اسے غیب الغیب یا حقیقۃ الحقائق اور احدیت اور ایسی ہی عبارت سے موسوم کرتے ہیں، یہی غیب بحسب لطافت "روح" سے موسوم ہے۔ اس کو اصطلاح میں غیر اضافی کہتے ہیں۔ یہ خفائی معین ہے۔ تیسرا مرتبہ غیب متمثل ہے، اگرچہ یہ بھی خفی ہی ہے مگر اس کا شہود ذہنی انسانی میں ہوتا ہے چوتھا مرتبہ غیب مجسم، اس میں بوجہ کمال کثافت ظہور اپنے منتہائی عروج پر ہوتا ہے۔ عام فہم لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کسی شے کی "کنہ" معلوم نہیں ہو سکتی ہمیں جو کچھ معلوم ہے یا معلوم ہو سکتا ہے وہ اس شے کی صفات ہی ہیں جنہیں ہم کسی اسم سے موسوم کرتے ہیں، اس کی مثال یہ کائنات ہے جو محسوس و مشہود و معین و مشخص ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ صرف صورتوں کا مجموعہ ہے، جو محسوس ہو رہی ہیں۔ قانون معرفت یہ ہے کہ مثل ہی مثل کو پہچانتی ہے، نور کا ظلمت پر اور ظلمت کا نور پر قیاس نہیں ہو سکتا ایک رباعی میں بیدل نے یہی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ افساد ایک دوسرے سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس لئے روح روح کو مثال مثال کو جسم جسم کو ہی پہچان سکتا ہے، چونکہ انسان ان تینوں کا جامع ہے اس لئے تینوں کی معرفت اس کے لئے ممکن ہے۔ جب کوئی مادہ پرست دہریہ یا مشکک یہ کہتا ہے کہ ہمیں اس عالم اجسام کے علاوہ کسی اور شے کا علم نہیں یہ "دہر" ہی ہے جس میں ہمارا امر ناجینا ہے۔ مرکز بڑیاں مٹی میں مل کر مٹی ہو گئیں تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی زندگی ہمارے لئے نہیں۔ تو وہ جہاں تک اس کا مشاہدہ حسی ہے سچ کہتا ہے، اس کی تحقیق یا نظر اسی حد تک ہے۔ وہ مادی کثافت یا صورتوں میں اتنا مجبور ہے کہ اس لطیف حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا جو "من وراء حجاب" صورت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس حقیقت کو مادی ابصار درک نہیں کر سکتی، لیکن مثل کو مثل پہچان سکتی ہے۔ روح کو روح کی معرفت

ہی حاصل ہو سکتی ہے، اس لئے اہل مذاہب روحانیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

راقم الحروف کے مطالعہ سے وہ مباحثہ بھی گزرنا جو مسٹر مل (

اور سر ولیم ہملٹن) میں دربارہ معرفت رہا، اس پر تبصرہ

ہر برٹ سپنسر) نے لکھا۔ مسٹر مل کی یہ رائے تھی کہ معرفت

اصدا سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً نور و ظلمت جب دونوں کا تصور ہمارے

ذہن میں ہوگا تو ان میں امتیاز سے ہم ان سے روشناس ہوں گے۔ سر ولیم ہملٹن

نے یہ اعتراض کیا کہ بلاشبہ اصدا سے امتیاز کا احساس تو پیدا ہوتا ہے لیکن

ان کی معرفت نہیں ہو سکتی۔ پانی کے ایک قطرہ پر ہم بحر کو قیاس تو کر سکتے

ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ لیکن پانی کو آگ پر قیاس نہیں کر سکتے

معرفت تو یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہو کہ پانی اور آگ خود کیا شے ہیں۔ ہر برٹ

سپنسر نے سر ولیم ہملٹن کی تائید کی، اہل تصوف کا یہ پامال شدہ مسئلہ ہے کہ

مثل ہی کو مثل کی معرفت ہوگی۔ اسی کو اصطلاح تصوف میں ”عینیت“ سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن ”عینیت“ کا صحیح مفہوم شیخ اکبر نے یہ واضح کیا ہے کہ جب تک

ہم کسی شے کا ہیولہ خود نہ بن جائیں ہمیں اس شے کی معرفت تامہ حاصل نہیں

ہو سکتی، یہ تو ظاہر ہے کہ جیسی زید کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے ویسی

عمر و کو زید کی نہیں، عمر و اگر زید بن جائے تو عمر و زید کا ”عین“ ہوگا۔ اسی طرح

ہر ایک طبقہ میں ہر ایک شے کی معرفت کلی اس شے کے عین بننے ہی سے ممکن ہے

”ہر کہ درکارن نمک رفت نمک شد“ اس لئے دوئی یعنی غیر کی نفی اور

وحدت کا اثبات ہی حق شناسی ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس عالم اجسام میں ہر ایک صورت اپنی

مثل کو پہچانتی ہے، ”کنذہم جنس باہم جنس پرواز“ سوال یہ ہے کہ روح کو

روح کس طرح پہچانتی ہے۔ ان نکات کو اگر ملا کر پڑھا جائے جن کا حوالہ

ہم بلفظہ دے چکے ہیں تو بیدل کا نظریہ معرفت بھی واضح ہو جائے گا۔ بیدل ایک اور مکملہ میں لکھا ہے کہ :-

”گواہ قوت جسم آدمی ست سعی در ادائی شرائط عبادت، و شاہد قوت عقل توجہ بر اکتساب علوم و حکمت، و دلیل قوت روح پرواز ہمت بعروج نسبت وحدت، مادہ این ہر سہ قوت مقدار اعتدال غذا ست کہ بہ تقویت آن جسم توانا شود بر قدرت اعمال، و عقل اعانت یابد در سعی تحصیل کمال، و روح بال کشاید فضائے محبت ذوالجلال، اگر اسباب غذا مفقود باشد، تردد جسم در طلب وجہ معیشت مانع ذوق عبادات است، و تصرف عقل در تدبیر حصول آن محروم کسب علم و حکمت، و توجہ روح از تشویش اینہا بر جمع سر منزل جمعیت“

با خشک و تر مادہ لیل و نہار قانع شو، جمعیت دل مفت انگار
آں دولت جاوید کہ خلدش نامند رزقیست کہ بے تردد آید بکنار
یہ حقیقت عام مشاہدہ ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی قوت کا اندازہ
مکالیف شرعیہ کی برداشت سے ہوتا ہے، اور قوت عقل کی شہادت بقدر
اکتساب علم و حکمت سے ملتی ہے، اور روح کی قوت کی دلیل اس کی ہمت
پرواز میں فضائے وحدت کی طرف عروج میں ہے۔ ان تینوں قوتوں کی اصل
اعتدال غذا ہے، غذا جسم کو تقویت دیتی ہے جس سے وہ اعمال پر قادر ہوتا
ہے، اور عقل کو مدد ملتی ہے کہ وہ کمال حاصل کرنے کی کاوش میں مصروف
ہے جو اس کی ہمت کا غشاء ہے۔ اور روح میں قوت پرواز فضائے محبت
ذوالجلال میں پیدا ہوتی ہے، اگر اسباب غذا مفقود ہوں تو ظاہر ہے کہ
جہاں تک عبادات کا تعلق ہے۔

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد با داد فرزندم

نہ تو ذوق عبادت پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جو عبادت کا ہے، اور جب بھوک پیاس سے حواسِ خمسہ ہی میں خلل واقع ہو تو عقل کو علم و حکمت کی کب سوچہ سکتی ہے۔ اس لئے عقل ان کے کسبِ محروم ہو جائے گی، اور جب تشویشِ دل میں پریشانی پیدا کرے گی تو روح کو بھی جمعیتِ خاطر حاصل نہ ہوگی۔

تذکروں میں بیدل کی تنومندی کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ تیس سیر کا عصا اس کے ہاتھ میں پرکاش معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دل و دماغ کی صحت کا اندازہ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر سے ہو سکتا ہے جس کا شاہد اس کا کلام ہے۔ اس کی تحقیق کی داد دینی چاہئے جو وہ نکات میں بیان کرتا ہے کہ ”ریاضت“ سعیِ جسد و عقل و روح ہے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال شرط ہے۔

”ریاستِ صفائی باطن می آرد بشرط اعتدال
و ضعف بر قوی می گمارد با فراط کمال“

ریاضت سے صفائی باطن ہوتی ہے اگر اعتدال ملحوظ رکھا جائے اور اگر اسے رہبانیت کی حد تک پہنچا یا جائے تو قولے کمزور ہوتے جائیں گے۔ غرض ریاضت تو یہ ہے کہ موادِ فاسدہ کی اصلاح کی جائے نہ کہ اجزاءِ صالح کو فاسد کرنا۔ آئینہ سے زنگِ کدورت دور کرنا ہے نہ کہ مشقِ عقل سے آئینہ کے وجود کو دور کرنا۔ مشہور روایت ساکھی منی گو تم بدھ کی ہے کہ اس نے اس حد تک مجاہدہ حاکم اور ریاضت شاقہ کی کہ ایک مشقِ اتھواں رہ گیا۔ آخر اس پر وہی کچھ منکشف ہوا جو بیدل بیان کرتا ہے، اس لئے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ ریاضت جو اعتدال سے تجاوز کرے بے فائدہ ہی نہیں نقصان دہ بھی ہے۔ شاگرد تو منی کے مجاہدہ پر گرویدہ ہو رہے تھے جب دیکھا کہ منی نے کھانا پینا ترک کیا ہوا ہے تو عقیدت مند رہے جب منی

نے پھر کھانا پینا شروع کر دیا اور جسم پر گوشت پوست میں تروتازگی پیدا ہونے لگی تو بدظن ہو کر کنارہ کیا۔

ان نکات میں بیدل بھی اپنی وارداتِ قلب بیان کرتا ہے چہار عنصر میں اس نے واقعات بھی لکھے ہیں۔ اور یہ نکتہ تو آپ زر سے لکھنا چاہئے کہ بھوک کی شدت سے صفر اڑھ جاتا ہے اور صفر اسے سودا، صاحبِ ریاضت اوہام میں عجیب و غریب شکلیں دیکھتا ہے، سودائی بھی اسی عالم میں یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ معیارِ صداقت صرف کتابِ کائنات ہے، لاریب فیہ، اس لئے اشیاءِ محسوسہ معینہ کی صورتوں کے سوا اور کچھ نظر آئے تو سمجھو کہ ”ہمہ سودا است“۔

کائنات اور کائنات کی اشیاء کو جیسی کہ وہ ہوں ان کی اصل صورت سے مشاہدہ کرنا اور اسی نظم و نظام میں مشاہدہ کرنا جیسا کہ کائنات میں کار فرما ہے، صحیح تصور ذہن میں کائنات کا پیدا کرنا ہے، یہ جادہ معرفت پر پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد ان تصورات میں حقائق کی تلاش تذکرہ فکر سے شروع ہو جاتی ہے، یہی جستجوئے حق اصل عبادت ہے اور عبادت کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

انبیاءِ عمرے نفس ہادر تردد سوختند

کیس حقیقت غافلان شاید بخود محرم شوند

انبیاءِ علیہم السلام تمام عمر اسی تردد میں گھلتے رہے کہ عوام جو حقیقت سے غافل کا انجام ہیں شاید اپنے آپ سے محرم ہوں ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“

در عبادت ہاست یکسر عرض ترکیب سجود

تا دریں صورت دے سوئے گریبان خرم شوند

عبادت میں بھی قیام و رکوع و سجود ہے۔ اور سجود غایت عبادت ہے۔ اس کی غرض بھی یہی ہے کہ اسی صورت میں جھک کر اپنے گریبان میں منڈالیں

اور فکر کریں کہ ہم کیا ہیں۔

سعی ناموس کرم معروف میں شغل ست بس

کایں خراں بیروں جہنما ز غولی و آدم شوتند

ایہ کریمہ ”لقد کو منابنی آدم“ شاہد ہے کہ بنی آدم کو تمام مخلوقات میں سے خلعت تکریم پہنایا گیا۔ اور اس لئے آدمی اشرف المخلوقات ہوا۔ اور خلیفہ فی الارض اور مسجود ملائک ہے ایک حیوان اگرچہ ناطق ہے۔ اس لئے اگر یہ خود ہی اپنے شرف اور شرافت سے بے خبر رہے تو کالانعام بلکلس سے بھی گیا گزرا۔ انبیاء اسی کوشش میں ہمیشہ رہے کہ لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں یعنی خود شناس ہوں، جب خود شناس ہوں گے تو انسانیت کے صحیح مقام سے واقف ہو کر ”سنحروکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ، ان فی ذلک الاٰیٰت لقوم یتفکرون“ کے مصداق بھی ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ اتفاق میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ مادیات ہیں، انہی کو ہم اپنے ذہن میں تصورات کی صورت میں لاتے ہیں۔ گویا یہی عالم خارجی ہمارے قلب میں عالم مثال ہے جس میں مادی کثافت لطافت سے بدل چکی ہے۔ اب ہم خارج کو نہیں دیکھتے، بلکہ تذکر و تفکر اسی عالم مثال میں کرتے ہیں۔ جادہ تحقیق پر یہ دوسرا قدم ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ خارج میں ہے وہ کچھ ہمارے قلب میں ہے۔ اس لئے بقول بیدل

”ظاہر ایں جا باطن است و باطن ایں جا ظاہر است“

ہمیں تلاش حق میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ”سخن“ کے تحت بیدل نے جو کچھ لکھا ہے جس کا حوالہ ہم ”چہار عنصر“ کے تحت دے چکے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک شے ہم سے ہم کلام

بیدل

ہو رہی ہے اور انہی تصویری حروف میں اپنے خالق ہم پر واضح کر رہی ہے۔ عارف
رومی بھی کہتے ہیں کہ

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل
اتنا تو سوچنا چاہئے کہ آج تک جو حقائق دریافت یا منکشف ہوئے
ہیں وہ کیسے ہوتے اگر اشیاء خود ہی ہم سے ہم کلام نہ ہوتیں جب بالارادہ بیداری
میں ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تو بحالت خواب ہمارے حواس ظاہری معطل
اور ارادہ سلب ہو جاتا ہے یہی تصویری حروف یا مثالی صورتیں ہمارے
رو برو ہماری توجہ کو جذب کرتی ہیں۔ غرض یہی ہے۔
”کایں خراں بیروں جہند از غولی و آدم شوند“

ہم لکھ چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی کی معرفت ہوتی ہے، اس کی حقیقت خواہ
خارج میں کہو یا باطن میں ایک ہی ہے، جب عارف سالک پر یہ حقیقت ملے
و عملاً منکشف ہوتی ہے تو خواہ زبان سے ”انا الحق“ نہ کہے وہ خود حقیقت
مجسم ہوتا ہے یہ مسئلہ وحدت وجود دقیق ہے، مزید تشریح جہاں تک ممکن ہے
غزلیات کے تحت کی جائے گی۔

چشم خود میں زحمت اندیشہ باطل نبرد
محرم یلی بر آب شوق بر محمل نبرد

جو اہل نظر خود شناس ہے وہ حق شناس ہے۔ اس لئے باطل کا خیال
اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا جو مجنوں یلی کا محرم ہے وہ محل کو نہیں دیکھتا۔
جو حقیقت پرست ہے وہ صورت یا بت پرست نہیں ہوتا۔

سیر معنی از خم و پیچ عبارت فارغ ست
قاصد ملک تقدس رنج آب و گل نبرد

جو اہل علم و حکمت معانی سے واقف ہے وہ حرف و صوت سے بے نیاز
ہو جاتا ہے، ”قاصد ملک تقدس“ یعنی روح آب و گل سے علوہ ہو جاتی ہے۔

بیدل

مصری اور ایرانی اور ہندی اور یونانی نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور روح دو علاحدہ علاحدہ اشیاء ہیں۔ اور یہ کہ روح مادی صورتوں میں چکر کاٹتی رہتی ہے جسے "تناسخ" کہتے ہیں۔ بیدل اور تمام حکماء اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حقیقت ایک ہی ہے البتہ صورتیں مختلف ہیں۔ اور مادہ محض صورت ہے۔ اور صورتیں محض عوارض ہیں جو ہر آن بدلتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں لیکن حقیقت تغیرات سے پاک ہے۔ اس کی تائید میں بیدل محکات میں کہتا ہے کہ:-

آئینہ از لسنہ دل فہم کنی اگر ہم نقطہ ایست چوں مردک طوفان
از جانبی برد، و ہر چہ از خارج جمع نمائی ہر چند دفتر است در ششم
کشدون چوں مرثہ برہم می خورد؛

جو کچھ لسنہ دل کے مطالعہ سے تیرے فہم میں آئے اگرچہ وہ بقدر ایک نقطہ ہی کیوں نہ ہو وہ آنکھ کی پتلی کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے گا طوفان گر یہ اسے متزلزل نہیں کر سکتا۔ اور یہ جو کچھ تو خارج سے جمع کرے گا خواہ وہ دفتر ہی کیوں نہ ہو آنکھ کی جھپک میں محو ہو جائے گا۔ اس موضوع پر بیدل نے لطیف شعر لکھے ہیں۔ غزلیات کے تحت ان کا حوالہ دیا جائے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھو تو ایک دنیا اور اس کی رنگینی مشاہدہ ہوگی لیکن آنکھ بند کرو تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔ البتہ جو لوح دل پر ثبت ہے وہ ہمیشہ پیش نظر رہے گا خواہ بیداری ہو یا خواب۔

محیط اعظم

مولانا ظہوری کا شاہکار ”ساقی نامہ“ ہے، بیدل کی مثنوی کا موضوع بھی یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے یہ مثنوی مولانا ظہوری کے جواب میں ہی لکھی، مثنوی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ :-

”اما بعد ایں میخانہ حقائق است نہ ساقی نامہ اشعار ظہوری، آئینہ پرداز دقائق است نہ زنگار فروش خار بے شعوری“

مقبوم تو یہ ہے کہ اس مثنوی کو مولانا ظہوری کے ساقی نامہ پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔ یہ میخانہ حقائق ہے، اور جو کچھ نکتہ آفرینی اس میں کی گئی ہے، وہ بات ظہوری کے ساقی نامہ میں نہیں۔

اصطلاح تصوف میں ”ساقی“ سے مراد ذات حق تعالیٰ ہے۔ یہ اصطلاح آیت کریم ”وَسَقِّمُ بِهِمُ شَرِبًا طَهُورًا“ سے اخذ کی گئی ہے۔

بیدل نے میخانہ عشق الہی کو آٹھ دوروں میں تقسیم کیا ہے، ”دورا ولی“ میں ”جوش انہار بزم وجود“ کے تحت بزم قدم کا بیان کیا ہے۔ یہ مقام ”لا تعین“ جیسا پہلے تھا اب بھی ہے۔ ”الان کما کان“ اس بزم قدم میں ”مئے بود بے نشہ“ کیف و کم، یعنی ظہور اسماء و صفات نہ ہوا تھا۔

منزہ زانندیشہ حادثات میرا زرد و غبار و صفات
 ”دورثانی“ میں ”جام تقسیم گلستان شہود“ کے تحت بقول خواجہ حافظ
 ”گل آدم بسرشتند ذبہ پیمانہ زدنند“ آدم کی مٹی کو اسی مے سے گوندھا گیا
 نیبے ازیں مے با آدم رسید زجیب نثار عدم سر کشید
 بیدل نے ایک بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ :-

اگر گندم راہ زن شد چہ باک کہ مست و فانی خطا ہا ست پاک
 کسی را کہ پیر مغال بر گزید ز عصیاں گلے جز ہدایت پنجید
 بود و صف مستان ظلوم و جہول کہ کردند سر جوش مستی قبول
 یعنی اگر شجر ممنوعہ کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ تو یہ ایک ایسی خطا تھی کہ
 جب آدم قنبہ ہوا تو قوبہ بھی کی اور وہ قبول بھی ہوئی۔ اولاد آدم بلاشبہ
 خطا کار واقع ہوئی ہے۔ لیکن اسی خطا میں اسے راہ صواب بھی نظر آتی ہے۔
 جو شخص مست ہوا سے ظلوم و جہول کہو تو بجا ہے لیکن اسی ظلم و جہل سے
 احساس عدل و علم و عدل بھی آدم کو ہوا۔ بہر حال پیر مغال یعنی حق تعالیٰ
 نے جب اسے کل مخلوقات میں سے انتخاب فرمایا۔ اور کل کائنات میں
 امتیاز بخشا یہاں تک کہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کے حضور جھکنا اور جو ذرا
 اکڑا راندہ درگاہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ملائکہ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں ہر وقت
 مشغول ہیں اور یہ کہ آدم مفسد اور خونریز بھی ہے۔ مگر ایک خاص بات آدم
 میں ہے کہ ان تمام برائیوں اور گناہوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شخصیت
 ممتاز ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ

انساں کہ فلک ہا ست سرائگند او در حیرت او گم است دائدہ او
 دارد خاصیت کہ در خالص و ذہن ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او
 اور قرآن کا ارشاد بھی ہے کہ ”منحوکم ما فی السموات وما فی
 الارض جمیعاً منہ“ ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون۔ ”تمام کائنات

آدم کے لئے مسخر کی گئی ہے۔ یہ کہنا کچھ بجا نہیں کہ تمام مخلوقات اس کے تابع فرمان ہے، یہ وہ موضوع ہے جو بیدل کا خاص ہے۔ اس پر مفصل بحث مناسب مقام پر کی جائے گی، اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ ہمارے زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم نے ”رموزِ خودی“ میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے اور ”اسرارِ بخودی“ میں یہی نقشہ ہے جس کی رنگینی کو بیدل نے نمایاں کیا ہے۔

یہ دورِ آدم سے اولادِ آدم میں گردش کرتا رہا۔ اس بزم میں جو نمایاں طور پر سرخوش مستی تھے وہ انبیاء تھے اور ان کے خدیوہ ان کے متبعین بھی اس فیض سے مالا مال ہو گئے۔ حضرت نوحؑ کی نسبت بیدل لکھتا ہے :-

ازاں بادہ چوں نوح شد کامیاب
جہاں دید نقضے ز موج شراب
جب اس شراب سے نوح کامیاب ہوا تو موج شراب میں جہاں ایک نقش نظر آیا۔

بدورش لبائے چناں گشت مست
کہ از بخودی رنگ صہبا شکست
اس کے اپنے دور میں لوگ اس حد تک بد مست اور بخود ہوئے کہ ”رنگ صہبا شکست“ شراب بھی حیران ہو کر رہ گئی۔

شکستن خمیر بجائی رساند کہ در جام وینا صدائی نماند
یہ شکستگی اس حیران کن درجہ تک پہنچ گئی کہ جام اور مینا میں آواز تک نہ چھوڑی۔

ز پیمایہ جہل خلقی در آب فرو رفت چوں در دے در شراب
قوم نوح نے جہالت کے پیانہ میں شراب اُنڈیل کر پی۔ پانی میں اس طرح غرق ہوئے جس طرح پلھٹ شراب کے پیالہ کی تہ میں میٹھ جاتی ہے۔

براں قوم شد موج طوفان ہوا کہ در آب آرام گیر و غبار
 قوم نوح کی بدستی کی یہ کیفیت تھی کہ طوفان کی موجیں اس کے سر پر
 سوار ہو گئیں، جس طرح پانی میں غبار یا خاک تہ پر بیٹھ کر قراریتی ہے
 اسی طرح جب تک عالم آب ان کے سر سے نہ گزر گیا وہ بھی حین سے نہ
 بیٹھے۔

بہر سر ز بس بادہ مستی گماشت کس از عالم آب سر برداشت
 چونکہ ہر ایک فرد قوم کے سر پر شراب کا نشہ پورے زور پر تھا کسی کو
 عالم آب سے ابھرنے کی ہوش نہ تھی، ان اشعار میں بیدل نے "عالم آب"
 میں لطف پیدا کیا ہے۔ اور طوفان نوح سے خوب مناسبت پیدا کی ہے۔
 بطوفان حیرت فزائی خطیر ہماں کشتی سے شدش دستگیر
 حضرت نوح اس طوفان سے کشتی کے ذریعہ بچے، اس شعر میں بھی
 عالم آب کو عبور کرنے کا ذریعہ کشتی ہے، بتایا ہے، اسی طرح بیدل تمام
 انبیاء کا ذکر کرتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کے خاص خاص حالات میں سی
 شراب مہور کی بادہ پیمائی کے ساتھ مناسبت واضح کرتا ہے۔ یہ دور آنحضرت
 پر ختم ہوا۔

جہاں را بر سر جوش عرفاں سلند ز بدستی خمر غفلت رہاند
 تمام دنیا جہاں کے لوگوں کو شراب معرفت پلا کر اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا،
 خمر غفلت کی بدستی سے نجات دلائی، چنانچہ صدیق اکبرؑ نے "شراب وفا
 یافت در جام صدق" اسی طرح فاروقِ اعظمؑ "عمریافت کام از مے عدل
 داد بر آفاق چوں استوا خط نہاد" عثمان ذی النورینؓ "ز سر جوشِ خشم حیا
 گشت مست" اور اسد اللہؒ "علی گشت صہبائی علم"
 تیسرے دور کے ضمن میں منصور صلاح کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں بیدل
 نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ حد اعتدال سے نہ بڑھنا چاہئے۔ عدل وہ صراطِ مستقیم

ہے جو سیدھی جنت کو جاتی ہے۔ اس کے دو کنارے افراط و تفریط ہیں اور
جوان میں الجھاوہ جہنم میں گر تا ہے۔

بہ منصور آں باوہ بے مثال چو یک قطرہ افرو دوازا معتدل
برآورد از موج مستی زباں زلفش برآمد انا الحق زناں
مئے فیض در رنگ اصلی بجاست دے ظرف تمکین مستان کجاست
یہی باوہ وحدت منصور نے بھی پایا مگر ایک گھونٹ زیادہ پی گیا نتیجہ یہ
ہوا کہ ضبط نہ رہا، اس کے ظرف استعداد میں اسی گھونٹ کی سمائی نہ تھی،
مستی میں زبان سے ”انا الحق“ نکلا، اس میں کچھ کلام نہیں کہ شراب کو اپنے
اصلی رنگ میں ہی ہے اور شراب حقیقت ہی ہے۔ لیکن وہ تمکنت جو
مستوں کے حال کے مناسب ہے وہ منصور کے ظرف میں نہ تھی۔ اس کی
مثال ایسی ہے کہ :-

گہر داشت بر جام اصلی نظر نیفتاد چشمش بجام دگر
”گہر“ کے معنی موتی بھی ہیں اور اصل اور اصالت بھی ہیں، یعنی موتی
نے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق ”زیک قطرہ می داو تسکین خویش“
ایک قطرہ پر قناعت کی اور موتی بن گیا۔ اس نے دوسرے جام کی خواہش
ہی نہ کی، لیکن :-

ہماں جام چوں شد نصیب جبا ببالید از ذوق عیش شراب
بانظہار جام دگر لب کشاد چو گل ساغر خود ہم از دست داد
یہی ایک گھونٹ شراب جباب نے بھی پایا۔ نشہ کی ترنگ میں اتنا
پھولا کہ ایک اور جام طلب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گل کی طرح جو اپنے جامہ میں
پھولانہ سما سکا اس کا ساغر بھی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گیا۔ اس شعر میں
لب کشاد سے مراد یہ ہے کہ وہ ضبط نفس جس سے جباب کی ہستی برقرار رہے نہ
رہا، پھولے ٹمٹنے سے زیادہ کی طلب کی تو خود پھوٹ کر رہ گیا، اور اپنی

ہستی فنا کر بیٹھا۔

حریص کہ باشد تنک حوصلہ نزدیک ز پیر مغانش گدہ
غالب نے بھی منصور کو تنک ظرف قرار دیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک نظر فی منصور نہیں
جہاب کی طرح منصور اور اسی قبیل کے لوگ جو بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں
اگر پیر مغاں کا گلہ کریں کہ ہم کو بقدر طلب نہیں دیتا تو یہ ان لوگوں کی کوتاہ
اندیشی ہے۔

بہ قسمت کسے گرفتار کند چو ساغر عیش خود بشکند
ساتی قسمت جو کچھ دیتا ہے وہ میں صواب ہے۔ اس لئے اگر ہر ایک شخص
اسی پر صبر و شکر کرے تو اس کا ساغر عیش زندگی بھر ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن جو
قناعت نہیں کرتے خراب حال ہوتے ہیں، اس لئے جتنی ظرف میں وسعت ہو
اسی مقدار سے بادل بھی طلب کرنا چاہئے۔ کہ ہرچہ ساتی مار نخت عین الطاف
است۔

محمد ز رفیع محیط قدم گرفتہ ہزاراں قدح دمدم
ولے بود فارغ ز کیف خمار ز شوق شہود ازل بمقرار
کہ من رنگ ایں بادہ نشنا ختم بہ تحقیق جامش نہ پردا ختم
ان اشعار میں اشارہ آنحضرتؐ کی ایک صحیح حدیث کی طرف ہے کہ آپؐ نے
فرمایا ”ما عرفناک حق معرفتک“ اس حدیث میں عبودیت اور عبدیت کا
حقیقی تقاضا بھی نمایاں ہے اور ساتھ ہی طلب علم بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی
شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کو کسی شے کا علم ”کما حقہ“ حاصل ہے۔
ہر ایک شے میں لامحدود امکانات پوشیدہ ہیں جن کو ”الغیب“ کہتے ہیں۔
آنحضرتؐ کی دعا بھی یہی تھی کہ ”رب زدنی علما“ اے میرے پروردگار میرا علم

زیادہ کر باوجود اس امر کے کہ اس بحرِ بیکراں سے گہنے ہزاراں قدح و مہدم
لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ ”انا عبد اللہ“ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ منصور کو یہ بات
کہاں نصیب تھی، ایک قطرہ سے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور بے اختیار
”انا الحق“ کا نعرہ لگایا، آنحضرتؐ کے بارہ میں بیدل نے یہ نکتہ بھی بیان
کیا ہے کہ :-

حریفے کہ شد میکش خم ذات چہ ساں مست گرد در جام صفات
غالب نے اسی خیال کو اور لطیف انداز میں ادا کیا ہے :-
سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بے خودی رد سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
یعنی بحسب گردش پیامہ صفات عارف ہمیشہ مست ٹئے ذات چاہئے
آنحضرتؐ انخما نہ ذات میں مقیم تھے، اور اصلی رنگ میں شراب حقیقت
اسی مقام و مدت میں طتی ہے۔ منصور صفات کی تجلیات میں محبوب تھا۔
آنحضرتؐ اس مقام سے گزر چکے تھے۔

گرا ز ساغر ذرہ گیر و شراب چہ اظہار مستی کند آفتاب
اگر آفتاب ساغر ذرہ سے شراب پیئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نشہ کا اثر
اس پر کچھ نہ ہوگا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ، آنحضرتؐ آفتابِ شہِ اجا
منجیلا، ہیں۔ آپ ساغر صفات سے نہیں بلکہ جام ذات سے پیتے ہیں۔ عہدِ
اکبری کا ایک محقق کہتا ہے کہ :-

”موسیٰ ز ہوش رفت ز یک پر تو صفات
تو میں ذات می نگری در تبسمے“

(قاضی جمال دہلوی)

بیدل کہتا ہے کہ :-

”چو شد طالب صاف و مد کلیم بر آورد پائے ادب از کلیم“
”ز دیر مغاں لن ترانی شنید کہ ہر کام نتواند ایں سے چشنید“

جب حضرت موسیٰ نے التجا کی ”رب ادنیٰ“ اے میرے پروردگار مجھے اپنا آپ دکھا، جواب ملا کہ ”لن نؤانی“ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت موسیٰ کا سوال بقول بیدل ادب کے خلاف تھا۔ ایک غزل نعتیہ میں میرا ایک شعر ہے۔

یقین ہے آتی نہ ہرگز سوال کی نوبت

کلیم تجھ سے اگر ہم کلام ہو جاتا

اسی بحث کے ضمن میں بیدل استعداد پر لکھتا ہے کہ:-

بباطل میں عشق و وحدت صفات بظاہر فروغ و غش تفاوت مناسبت
نماید چو خورشید در خانہ رو ز شمعے فروز نیست انوار او
ولیکن بصراست صاحب جلال بود لازم ظرف نقص و کمال
بود منسرق از ذرہ تا آفتاب کجا ساغر بحر و جام حساب
از روئے حقیقت عشق و وحدت کی شراب صاف ہے لیکن بقدر ظرف اس کا نشہ مختلف ہے، حقیقت کی مثال آفتاب جیسی ہے کہ اگر کسی خانہ کے روزن دیوار سے اس کی روشنی داخل ہو تو شمع کی روشنی سے زیادہ نہ ہوگی لیکن صحرائیں آفتاب اپنی پوری شان جلال میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس لئے نقص و کمال یا کمی بیشی کا اندازہ ظرف کی وسعت سے ہی ہو سکتا ہے ایک گھر کی چار دیواری میں اسی سورج کی روشنی شمع سے زیادہ نہیں مگر صحرائیں اس کی وسعت کے لحاظ سے اس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح ذرہ اور آفتاب میں تفاوت ہے، بحر کے پیالہ میں سمندر سما یا ہوا ہے اور ساغر حساب میں ایک قطرہ سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

بفرعون جام جہالت رسید کہ چشمش بجز رنگ غفلت نہ دید
فرعون نے ہی شراب جام جہالت میں پی۔ جہالت کا نشہ غفلت کے سوا اور کیا ہوتا۔

ہمہ در دشد بادہ ناب او می جلوه شد پر وہ خواب او
 شراب تواز روئے حقیقت صاف ہی تھی مگر یہ خالص شراب دورہ یعنی
 پلھٹ اس کے جام جہالت میں دکھائی دی اس لئے وہ ہوش کو بیٹھا اور
 خواب غفلت میں مدہوش ہو گیا۔

مگر خوابش از ہوش گیر و دلیل

شکستند بر فرق او ختم نیل

دستور ہے کہ سوئے آدمی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے چہرہ پر
 پانی کے چھینٹے دیتے ہیں، اس خیال سے کہ فرعون کے ہوش و حواس
 بجا ہوں اور وہ بیدار ہو اس کے سر پر نیل کا ٹکڑا توڑا گیا، خیل کے ساتھ
 ”ختم“ نے اس شعر میں لطف پیدا کر دیا ہے مطلب تو یہ ہے کہ وہ نیل میں
 غرق ہو گیا۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں، کہ اس کے حواس خمسہ
 ایک ہی موج دریا کے تھپیر طے نے درست کر دئے اور چلا آٹھا کہ میں
 موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ چہا ر عنصر میں بیدل نے لکھا ہے کہ
 کسی نے ایک اہل دل سے دریافت کیا کہ منصور اور فرعون دونوں ایک
 ہی خیمانہ کے پینے والے تھے، اور دونوں نے دعویٰ بھی ایک جیسا کیا۔
 منصور نے ”انا الحق“ اور فرعون نے ”انا ربکم الاعلیٰ“ کہا۔ اس کی وجہ
 کیا ہے کہ ایک مقبول اور دوسرا مردود ہوا جواب دیا کہ منصور اہل تحقیق تھا،
 کسی حالت میں بھی اپنے دعوئے سے دستبردار نہ ہوا یہاں تک کہ دار پر
 ٹکایا گیا۔ مگر فرعون کو دنیوی جاہ و حشمت نے مغرور بنا دیا، اس کے سر میں
 جو ہوا سمائی ہوئی تھی پانی کی ایک لہر نے بلبہ کی طرح توڑ پھوڑ کر کھال دی،
 اور بے اختیار چیخ اٹھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا۔ اگر اسے
 اپنے دعویٰ پر یقین ہوتا تو منصور کی طرح اسی پر قائم رہتا۔
 ز افعال و اثار چوں شد خلاف و گرنہ زیک خم بود درد و صاف

بیدل

اگرچہ شراب صاف ہو یا پھٹ ایک ہی خم میں ہوتی ہے لیکن افعال اور آثار کے لحاظ سے سایہ اور نور کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے ورنہ "بود سایہ در جلوہ ہمرنگ نور" نور بھی اسی طرح جلوہ فروز ہے جیسے سایہ ظاہر ہے۔ لیکن اہل نظر کی آنکھ میں "گم است اس یکے در ظہور دگر" جہاں ظلمت چھائی ہوئی ہو وہاں نور گم ہے اور جہاں نور کا ظہور ہو وہاں ظلمت کا نور ہے۔

بیدل نے اس شثنوی "محیط اعظم" میں حقائق کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے، سردست ہمیں اس شثنوی کے موضوع سے بحث نہیں، یہ موضوع اس کا اپنا خاص ہے اور اس کے کلام نشرو نظم میں ہی کارفرما ہے، بیدل کی تصانیف کے مذکور میں ہم ہر ایک تصنیف سے سردست روشناس کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر پر مفصل بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔

اس شثنوی میں بیدل نے موضوع کی رعایت کی وجہ سے ساقی اور خرابات اور خراباتیاں اور خم و مینا و جام وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ "سرد لہراں" "در حدیث دیگران" میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس پر بحث کریں تو ایک دفتر چاہئے۔ ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں، بیدل ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ہندوستان میں ایک تھاکہارا جہ، اس نے اپنی مملکت کے طول و عرض میں اعلان کر دیا کہ جو بھی کسی علم و ہنر میں اہل کمال ہے، دربار میں حاضر ہو کر اپنے کمال کا اظہار کرے اور منہ مانگا صلہ پائے۔ اس دعوت عام پر ملک کے بالکمال آنا شروع ہوئے۔

یہ ہمیشہ زہل ہنر ہر کہ بود ز اسرار دل نسخہ وانمود
راجہ کے دربار میں ہر ایک اہل ہنر نے جو بھی تھا "دل" کے اسرار کھول کر رکھ دئے۔ اس شعر میں الفاظ "اسرار دل"، تمام حکایت کا اصل موضوع ہے۔ یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اہل علم و ہنر کے پاس جو کچھ

بھی ہوتا ہے وہ اس کے اپنے دل میں ایک راز کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے، جب تک وہ خود ہی تحریر و تقریر میں اس کا اظہار نہ کرے یہ راز کسی پر منکشف نہیں ہو سکتا۔ اس حکایت کے نتیجہ پر بیدل نے جو بحث کی ہے وہ مناسب مقام پر بیان کی جائے گی۔

ہر طبع ہنر پرورش بے حجاب زے نشہ ظاہر شد، از گوہر آب
عیال شد بچشم طراوت نظر ز گل نگہت، از لالہ داغ جگر

اگرچہ ہر ایک اہل کمال کا ہنر اس کے دل ہی میں پوشیدہ تھا مگر جب اس نے یہ پردہ اٹھا دیا تو اس کے ہنر کا اظہار لوگوں پر اسی طرح ہوا جس طرح شراب پینے کے بعد ہی اس کا نشہ ظاہر ہوتا ہے، یا موتی قدر دریا سے نکل کر ہی اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ پھول جب کھلتا ہے تو اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے اور لالہ کا داغ جو پہلے جگر میں پوشیدہ تھا منظر عام پر آ جاتا ہے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شے ”فعل“ میں نہیں آ سکتی جب تک کہ وہ ”بالقوۃ“ موجود نہ ہو، اگر ہنر اہل کمال کے دل میں موجود نہ ہوتا تو اس کا اظہار بھی نہ ہوتا۔

ازاں جملہ بازیگری شوخ و شنگ چو گردوں طلسم دو عالم بچنگ
ز حبیب فریب نگہ سرکشید بساطی پی دام نظارہ چید
بمیدان افسوں گری پانہلو یکے اسپ چو میں بشعر عنہ داد

انہی با کمال لوگوں میں ایک بازیگر بھی تھا۔ ہر دو عالم ایک طلسمی کارخانہ ہے مگر آسمان شعبہ بازی کے دستِ تصرف سے باہر نہیں ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ خود آسمان ہی تھا جو بازیگر کی صورت میں نمودار ہوا۔ فارسی شاعری آریاذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ عام آریائی عقیدہ ہے کہ اجرام سماوی کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اس لئے ان میں جو توش یا علم نجوم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کرۂ عرض پر ہو رہا ہے وہ سیارگاں کی

گردش کا اثر ہے۔ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط سیر و دست زیر بحث نہیں۔ لیکن آٹنی شاعری میں اس نے مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس نے بیدل بھی عام روزمرہ اور محاورہ زبان استعمال کر رہا ہے۔ اس چالاک شعبدہ باز نے اپنے تخیل سے جس کو فریب نظر کہنا چاہئے دام نظارہ نکال کر بچھا دیا۔ جادو گوی کے میدان میں قدم رکھتے ہی راجہ کے حضور ایک کلڑی کا گھوڑا پیش کیا۔ اور کہا۔

ہوئی کو برائیں سپ گرد سوار کند سیر افلاک اندیشہ وار
جو بھی اس گھوڑے پر سوار ہو گا وہ اس تیزی سے تمام افلاک کی سیر کر سکتا ہے جس سرعت سے خیال دوڑتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ راستہ میں گرد و غبار کی کلفت بھی نہ ہوگی۔ ”بود سیر او بچو سیر نگاہ“ اس کی سیر نظر کی سیر کی طرح ہوگی۔ ان اشعار میں بیدل نے ”سرعت اندیشہ“ اور ”سیر نگاہ“ کو ہر ایک شے سے زیادہ تیز رفتار بتایا ہے، زمانہ حال کے حکماء کا نظریہ یہ ہے کہ ”روشنی“ سب سے زیادہ تیز رفتار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ”انسانی دل“ ہی سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ خیال اور نگاہ اسی کی رفتار اور روش ہے۔

راجہ نے جب گھوڑے کی یہ تعریف سنی تو بے اختیار گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بازی کرنے متنبہ کر دیا تھا کہ گھوڑا سخت متمنہ زور ہے۔ نباشد عنائش بفرماں کس کہ مشکل بود ضبط موج نفس یہ نہیں ہو سکتا کہ لگام کے اشارے پر چلے۔ ایسا ہی ہے جیسا انسانی سانس خود بخود چل رہا ہے، روکے سے رکتا نہیں، اور اگر رُکے تو دم ہوا ہو جاتا۔ غرض راجہ سوار ہوا اور گھوڑا فوراً

باوج فلک گشت جولان نما چو شبنم برآمد برنگ ہوا
آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اب راجہ کے اوسان بجا نہ رہے۔

بہ ہلیت چناں خسرو از خویش رفت
کہ از بے خودی یک قدم بیش رفت
راجہ ایک بخودی کے عالم میں اپنے آپ میں نہ رہا بلکہ یہ کہنا چاہئے
کہ رکتا کیا ایک قدم اپنے آپ سے اور آگے بڑھ گیا۔
زحیرت ہم آغوش و ہم ہلاک
بہفتاد چوں سایہ بر روئے خاک

اب راجہ پر یہ وہم غالب ہوا کہ میں گرا کہ گرا، اس وہم سے ہمنکار
ہونا تھا کہ سایہ کی طرح زمین پر آ رہا، تھوڑی دیر بعد جب آنکھ کھلی تو ایک
نی ووق جنگل میں اپنے آپ کو پڑا پایا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے پیاس کا
غلبہ ہوا اور دھڑ دھڑ دھوپ تین شبانہ روز رہی مگر پانی نہ ملا، آخر دور
سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا، جب حجاب غبار دور ہوا تو ایک حسینہ بے پردہ
نمودار ہوئی۔

خرامے چو سیلاب غارت فروش نگہ وحشت دامن الفت بدوش
جس طرح سیلاب برہتا ہوا ہر ایک شے کو جو راستہ میں پڑے بہالے
جاتا ہے اسی طرح اس کا خرام غارت فروش تھا۔ نگاہ اگرچہ رمیدہ تھی مگر
”دام الفت بدوش“ یہ صفت افساد ہے کہ رمیدہ نگاہ جو غزال وحشی
کی ہوتی ہے الفت کی بھی دعوت دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آنخورہ آب
اور ٹوکری میں روٹی بھی تھی، راجہ بھوکا اور پیاسا تو تھا ہی، دوڑ کر سامنے
آیا۔ اور کمزوری کی وجہ سے اس پر پیپہ کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے
راجہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو راجہ اور راجپوت نظر آتے ہو اور میں شودر ذات
میرا پیشہ کناسی ہے، یعنی جاروب کشی ہے۔

غذا ہائے ماہم باشد حلال بقوم دگر نیست غیر از وبال
ہماری خوراک تو ہمارے لئے حلال ہے۔ اگر تمہیں دوس تو تمہارا

دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔

راجہ کی توجان پر بنی ہوئی تھی۔ اگر چھتری دھرم کا پاس کرتا تو ہلاک ہو جاتا۔ اس لئے کہا کہ دھرم بھرم کی باتیں چھوڑو۔ اس لئے کہا کہ اس شرط پر دیتی ہوں کہ:

ترازیں ہلاکت رہا نہ اگر در آری بعقد خودم چوں گہر
مجھے اپنے عقد مکمل میں لے آئیے۔ راجہ بیچارہ مڑا کیا نہ کرتا، ناچار قبول کیا، روٹی کھائی، پانی پیا، ذرا آسودہ ہوا تو وہ صنم غارت گر ہوش راجہ کو اپنے گھر پر لائی۔ اپنے لوگوں کو راجہ کے حسب و نسب سے آگاہ کیا، جب ان کو معلوم ہوا کہ راجہ اپنا جنم کا دھرم چھوڑ کر ان کی برادری میں شامل ہونا چاہتا ہے تو:

بدستور سررشتہ دین خویش بہ بستند عقدش بامیں خویش
اپنے دھرم کی رسم اور رواج کے مطابق راجہ کا بیاہ اس دوشیزہ سے رچایا۔
زنج بازی چرخ نیزنگ ساز گرفتار زانغاں شد این شاہباز
یہ بھی دنوں کا پھیر ہے کہ یہ شاہباز کوؤں کے پنجہ میں پھنس گیا۔
مباد اضطرا آفت حال کس کہ آتش بضعف است محتاج خس
اضطرابی حالت کی یہی کیفیت ہے کہ آگ اس وقت تک نہیں بڑھتی جب تک خار و خس کی مدد نہ لے، اس لئے جب گھاس پھوس نہ لے آگ زور میں نہیں آتی۔ اسی ضعف کی وجہ سے آگ ”خس“ کی محتاج ہے۔ ”خس“ ہر ایک حقیر و ذلیل شے کو کہتے ہیں۔

آنکہ شیراں را کند رو بہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج
راجہ اب بالکل چو ہڑا تھا۔ اور اسی طرح دس سال کا عرصہ گزر گیا۔
شدے بے طلب بچو گل دیہار بہر سال فرزند نو آشکار

جس طرح بہار کے موسم میں گل خود رو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح راجہ کے ہاں ہر ایک سال بیٹا نیا پیدا ہوتا رہا۔

گرہ ہا فسزوں شد بدام دلش
کہ شدہ گہرزاں صدف حاصلش

اس کے دل پر ایک ایک کر کے گرہ پڑتی گئی جس سے اس کی وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اس لئے اس صدف یعنی زوہبہ سے دس موتی حاصل ہوئے۔ راجہ اب اپنی راجگی اور تخت و تاج کو بالکل بھول چکا تھا۔

قضا رانہ چرخ سراپا ستیز

برآں سرزمین قحط شد فتنہ ریز

اتفاق سے اس سرزمین پر قحط نمودار ہوا۔ بیدل نے قحط کی سختی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

قحط کی شدت نے راجہ کو مجبور کیا کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کسی اور جگہ تلاش نان میں جائے۔ ادھر ادھر بہت پھرے ایک ہفتہ کے بعد ایک جنگل میں گزر رہا تھا۔ بھوک سے سب تنگ آچکے تھے۔ آخر سب نے یہ سوچا کہ روٹی تو ملنے سے رہی اس کی سختی کیوں برداشت کی جائے، اس لئے سب نے خود کشی کی ٹھان لی۔ ادھر ادھر سے لکڑیوں کا انبار جمع کیا، راجہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جگر گوشہ اگنی کی بھینٹے ہوں، اس لئے سب سے پہلے خود آگ میں داخل ہوا۔ مٹا اس نے اپنے سامنے اپنا تخت دیکھا اور وہی دربار اور وہی اہالیان دربار کھڑے دیکھے، راجہ حیران تھا کہ

چہ بود ایں کہ یک عمر در کوہ و دشت
خرد پرده کز روئے کارش کشود

در آغوش بی طاقی ہا گزشت
دو ساعت فزول دور محنت نبود

ایک عمر میں کوہ و صحرا میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ حکومت اور اختیار جو پہلے حاصل تھا اک دم جاتا رہا، اور میں کمزور و ناتواں پنج ذات کے آدمی کی طرح بسر کرتا رہا۔ یہ تمام دس سال کا عرصہ اور اس عرصہ میں جو کچھ محنت و مشقت کی دو گھڑی سے زیادہ نہ تھی، راجہ نے اپنی سرگزشت تو کسی سے بیان نہ کی، اب وہ بازی گر بھی موجود نہ تھا کہ اس کی حقیقت اس سے دریافت کرتا۔ لیکن رہ رہ کر وہ ”تمنا“ اور وہ ”آرزو“ جو دل میں اُبھرنے کے لئے جوش مارتی تھی اور اب ایک حسرت و یاس میں مبتدل ہو رہی تھی، چین سے بیٹھنے نہ دیتی، اس لئے راجہ نے پھر صحرا نور دی کی ٹھان لی، کہ ممکن ہے کہ اس مقام کا سراغ مل جائے جہاں دس سال بسر کئے۔ اسی طرح بہت عرصہ اسی جستجو میں گزر گیا۔ قنارا ایک جنگل میں گزر رہا تو یہ ماحول کچھ شناسا معلوم ہوا۔ واقعات گزشتہ کی یاد تازہ ہو گئی اور آگے بڑھا تو یہاں شہر کناس شد جلوه گر، وہی خاکروبوں کی بستی نظر پڑی جہاں اہل و عیال کے ساتھ دس سال گزارے تھے، اب راجہ اپنے گھر پر آیا۔ امید تو یہ تھی کہ فرزند وزن سے ملاقات ہوگی مگر دیکھا وہاں صف ماتم بھی ہوئی ہے۔ فرزند وزن تو نظر نہ آئے مگر لواحقین گرہ و ناری کر رہے ہیں، راجہ نے دریافت کیا کہ تمھاری چیخ و پکار کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کئی سال کا عرصہ ہوا۔

جوانی جو خوشید عالی نژاد دریں دشت از پیشگیہ افتاد
ایک جوان جس کا چہرہ سورج کی طرح جوت مارتا تھا اس جنگل میں آ نکلا۔ اور ہم میں رہائش اختیار کی، شادی بیاہ کیا، بال بچے ہوئے اور اچھی بری زندگی جیسی ہم سب کی ہے وہ بھی بسر کرتا رہا۔ قحط پڑ گیا اور وہ اہل و عیال کے ساتھ روزگار کی تلاش میں کہیں چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ ملا کہ کہاں گیا، راجہ نے ان کی دلجوئی کی اور بہت سامان بھی

دیا، پھر اپنے لشکر کے ساتھ اپنی راجدھانی کو لوٹا۔ اب یہ تو یقین ہو گیا کہ دس سال کا عرصہ خواب میں نہیں گزرا تھا بلکہ حقیقت ثابت ہے۔ لیکن ہر چند غور کیا مگر یہ گنتی سلجھ نہ سکی کہ دس سال ایک مقام کا عرصہ اس کی اپنی راجدھانی کی دو گھڑی کے برابر کیسے ہو سکتا ہے یا خرا ایک "رشی" کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا۔ "رشی" نے کہا:

کہ اے ماندہ از مرکز اصل دور	نداری خبر از طلسم ظہور
بروئت در راز واکرودہ اند	بر مرز ظہور آشنا کردہ اند
فسوں گرنہود آں فریب آفریں	دل انگشت نقش ہدایت مبین
دل آئینہ ہستی عالم است	وگر نہ وجود و عدم مبہم است
دل آور در مات تحقیق ذات	ازیں نسخہ زہد جوش حرف صفات
بتقید دل مفت زندگی است	ز تحریک دل موج پابندگی است
طلسم جہاں گرد ویرانہ است	عمارت در و عکس ایں خانہ است
مکانہا ہمہ از دل آمد پدید	جہت ہا ازیں بے جہت سرکشید
چہ ذہن و چہ خارج خیال دست	چہ اصل و چہ فرع از تہال دست
گمانہا ہمہ نقش تکوین و ست	یقین یک گل از باغ تشکین و ست
مشو غافل از باغ نیزنگ دل	کہ علم و عیاں نیست جز رنگ دل
بظاہر تر اگر چہ دل در براست	بمعنی تو لفظی و دل دفتر است
یچہ فہم خود کن تو خود کیستی	ازاں پردہ دل بڑن نیستی
دلت ہر چہ اندیشد اند خیال	بود جملہ منقوش لوح مثال
گل و گلشن دل مثال است و بس	خیال آنچہ بین خیال است و بس
دریں دائرہ ذہن غلاب کی است	تفاوت اگر ہست جز وہم نیست
تعلق بہار فریب دل است	تو ہم گل ناشکیب دل است
وگر نہ ندارد بہار شہود	بغیر از توار خود گلے در وجود

دریں بحر طوفان غیر تو نیست دریں کوچہ جز گرد سیر تو نیست
 خیال تعلق دریں خاکدراں بود عرض اسباب ہم دگماں
 خیالت چورنگ تنزل گزید ز تخت بجاک مذلت کشید
 پے سوختن تانہ بستی کمر نشد صورت راحت جلوہ گر
 برستن ز او نام امید و بیم عیاں شد کہ ہر جانی خویشی مقیم
 رشی جی نے "گیان" کی باتیں راجہ سے کیں کہ "راجن تو اپنے اصل کے
 مرکزی مقام سے دور افتادہ ہے۔ تجھے اس سرشٹی یعنی ظہور کی حقیقت
 معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ جو تجھ پر گزرا اس کی غرض و غایت اتنی ہی تھی کہ
 تجھے ظہور کے اسرار سے آگاہی ہو۔ وہ باز یگر جس نے یہ سب شعبہ بازی
 کی دراصل تیرا اپنا ہی دل ہے جس نے یہ کرشمے دکھائے، دل ایک آئینہ کی
 مثال ہے جس میں کائنات کی ہستی منکس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو وجود و
 عدم اور ہستی اور نیستی بے معنی بات ہو جاتی، اسی آئینہ دل میں ذات مختلف
 صورتوں میں جلوہ گر ہوئی، ان صورتوں کو صفات سے موسوم کیا گیا جیسے
 معانی حروف میں منکشف ہوتے ہیں۔ ذات تو حقیقت واحدہ مجردہ ہے۔
 اس کی ہستی کا احساس ناممکن تھا اگر وہ صفات کی صورتوں میں رد نہ
 ہوتی۔ اور یہ نمائش تیرے آئینہ دل میں ہی ہو رہی ہے۔ زندگی سے وابستگی
 بھی حقیقت میں دل کے تعلق نے پیدا کر رکھی ہے۔ اور اس زندگی کی پابندگی
 بھی دل کی تحریک ہی ہے۔ یہ طلسم جہاں جس کی سیر تو کر چکا ہے اور کر رہا ہے
 اصل میں ایک دیرانہ کا غبار ہے۔ اسی آب و گل سے تو اپنے خانہ دل کی تعمیر
 کر رہا ہے۔ دل نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ جہات سے منزہ ہے لیکن تمام جہات
 اور زمان و مکان اسی کے پیدا کردہ ہیں اور تمام کائنات جس میں مکان و
 زمان ہیں دل ہی میں سمائے ہوئے ہیں، دل سے باہر عدم ہیں۔ یعنی خارج از دل
 ان کا وجود نہیں، خواہ یہ ذہنی امور ہوں یا خارجی حالات ہوں سب دل کے

خیالات ہیں) یہ شجر دل ہی ہے خواہ اس کی جڑیں ہوں یا شاخیں یا پتے۔ خواہ گمانِ دوہم یا یقین ہو سب دل کے نقوش ہیں البتہ یقین سے دل کو ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے مگر یہ بھی دل ہی کی ایک کیفیت ایسی ہی ہے جیسے گمان، دل ایک باغ ہے جس میں طرح طرح کی نیرنگی تو مشاہدہ کرتا ہے خواہ یہ علمی صورت ہو یا ذہنی امر یا خارج میں اعیان ہو دل ہی کے رنگ میں رنگیں ہیں۔ یعنی ان کا وجود دل ہی میں ہے دل سے باہر تصور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ دل بظاہر تیرے اندر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تو صرف ایک لفظ کی صورت ہے۔ دل معانی کا دفتر ہے۔ انسانی دل کی حقیقت ہی دل ہے۔ مولوی معنوی کہتے ہیں کہ:

ای برادر تو ہمیں اندیشہ مابقی تو استخوان و ریشہ

اب تجھے خود سوچنا چاہئے کہ تو خود کیا ہے؟ تو خود دل کے اندر ہی ہے۔ اس پردہ دل سے تو باہر نہیں ہے۔ یہ دل کی قابلیت ہے کہ جو کچھ خیال کرنا ہے اس کی مثالی صورت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یہ گل اور گلشن سب مثالی صورتیں ہیں، جو کچھ خیال چاہتا ہے ایک خیالی صورت بنا لیتا ہے۔ اس دائرہ کائنات یا تیرے دائرہ دل سے خارج ایک ”ذہن“ ہے، اسی ذہن کے تصورات یہ کائنات ہے اور اسی کائنات کے نقوش تیرے دل پر ثبت ہیں۔ دراصل ایک ہی ”دل“ ہے۔ اس لئے ذہنی اور خارجی امور یا عالم غیب و شہادت میں کچھ فرق نہیں غیب میں بھی وہی کچھ ہے جو شہادت میں ہے ہمیں اگر کچھ تفاوت نظر آتا ہے تو یہ کرشمہ ”دوہم“ ہے، ”دوہم“ پر بیدل نے مثنوی طلسم حیرت میں مفصل بحث کی ہے اور اسی کے تحت ہم بھی اس پر بحث کریں گے۔ آیہ کریمہ قرآن بھی اس کی تائید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تفاوت نہیں ہے۔ یہ تعلق جو ذہن اور خارج میں ہے اور جو علاحدہ علاحدہ نظر آتا ہے ایک فریب نظر ہے، تو خود بھی دل ہی کا ایک گل ناشگفتہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے

کہ بہارِ شہود میں تیرے سوا اور کوئی گل نہیں۔ اس طوفانی بحر میں تیرا غیر موجود ہی نہیں، تو اپنے دل ہی میں سیر کر رہا ہے۔ یہ تعلق کا خیال اس زمین دل میں صرف وہم و گمان کا کرشمہ ہے۔ زمین پست اور آسمان بلند نظر آ رہا ہے۔ جب میری نظر پستی کی طرف گئی، تو تخت کی بلندی سے خاک مذلت پر گرا۔ اور اس تعلق کا نقش ایسا گہرا ہے کہ تو ابھی تک اسی سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھ رہا ہے، بلکہ اس کو غنیمت شمار کرتا ہے، جب تک تو آگ میں جلنے کیلئے کمر بستہ نہ ہو، تمام کلفت اور پریشانی کا بھی خاتمہ نہ ہو، اور پھر سے تخت راحت پر متمکن نہ ہو۔ جب تو ”امیدِ دہیم“ سے کنارہ کش ہو، تو تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ تو اپنی اصلی جگہ پر ہی مقیم ہے، نہ کہیں گیا اور نہ کہیں سے آیا۔

ہم نے ان ابیات کی ترجمانی تو کی ہے مگر یہ فلسفہ دقیق ہے۔ چونکہ بیدل نے اور مقامات پر اس کی تشریح کی ہے اس لئے سر دست یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ تمام کائنات ایک واحد دل کے تصورات ہیں۔ یہ مذہب اہل تصوف کا ہے اور گزشتہ صدی میں ”بشپ بارکلی“ نے اس فلسفہ یا نظریہ پر مدلل بحث کی ہے، یونانی فلسفہ ”سوفسطہ“ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم خیال ہی ہے۔ لیکن اسلامی تصوف یہ ہے جسے مولانا جامی نے اس رباعی میں بیان کیا ہے۔

سوفسطائی کہ از خود بے خیر است گوید عالم خیالے سرسراست
آرے عالم ہمیں خیال است فلے جاوید درو حقیقتے جلوہ گراست
جہاں تک اس عالم صورت یا محسوسات کا تعلق ہے یہ خیالات یا تصورات یا بقول بیدل یہ صرف صوتیں ہی ہیں۔

دلت ہر چہ اندیشہ اندر خیال بود جملہ منقوش لوح مثال
لیکن انہی صورتوں میں حقیقت رونما ہو رہی ہے۔ جس طرح حروف

میں معافی یہ ”حجابِ صورت“ (من و دراء حجاب) ہی ہے جس میں اہل ذکر و فکر حقیقت کی تلاش کرتے ہیں جو ”الغیب“ ہے۔ اور ناممکن ہے کہ بشر کو حقیقتِ مجردہ کا احساس ہو جب تک وہ کسی صورت میں رونما نہ ہو۔

ان ابیات میں ”رشی“ کی زبانی یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ انسان کو سوچنا چاہئے کہ وہ خود کیا ہے؟ ”انسان“ اور اس کی حقیقت پر بھی بیدل نے چہار عنصر اور دیگر تصانیف میں مفصل بحث کی ہے۔ بیدل کا نظریہ کائنات اور ہستی ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ ان ابیات میں بیدل یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ ”دفتر دل“ کا ایک لفظ یا صحیفہ فطرت کی ایک آیت انسان ہے۔ آیات بے شمار ہیں، لیکن انسان کو یہ تفصیل حاصل ہے ”علمہ البیان“ وہ ان آیات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے اور اس کو ان کا فہم بھی حاصل ہے اور ان کو بیان بھی کرتا ہے۔

بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ وہ غنی عن العالمین ہے، تخلیقِ انسان کا مشاہدہ ہے کہ انسان اپنے مرتبہ سے واقف ہو۔ چنانچہ مزامیر نے اور طنبور اور چنگ وغیرہ کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک رات میں ہستی کی گتھی سلجھانے کی فکر میں غلطان تھا کہ :

دریں حالت از چنگم آید بگوش نوائی کزد آب شد رنگ ہوش
اس حالت استغراق میں چنگ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ یہ نوا
کیا تھی ہوش و حواس فہم ہو گئے۔

کے سر بسر نقش دیوانگی ہمہ پردہ ساز بیگانگی
کہ تو بھی عجیب دیوانہ ہے بلکہ مجسم دیوانہ ہے جو اپنے ہی ساز سے اتنا
بیگانہ ہے کہ غیر اور ”غیریت“ کی نغمہ سرائی کرتا ہے۔

چو آئینہ چنگ داری بہ پیش مشو غافل از صورتِ حال خویش

چنگ آئینہ ہے اور اس میں تیری ہی صورت ہے اور تیری ہی آرزو تیرے ہی دم اور ہاتھ سے نکل رہی ہے۔

توئی قبلہ خود چو محرم شوی تو محراب خویشی اگر خم شوی
اگر تو اس راز سے واقف ہو تو معلوم ہو گا کہ تو اپنا آپ "قبلہ" ہے،
آئینہ میں تیرے رد و برو تو ہی ہے اور ذرا تفکر سے کام لے اور جھک کر اپنے
اندر نظر کرے تو تو ہی اپنا آپ محراب ہے۔
ساتویں دور کے شروع میں بیدل لکھتا ہے:

دریں گنبد بے در آسمان ز بیگانہ تا چسند جوئی نشان
یہ آسمان ایک گنبد ہے جس کا کوئی دروازہ آمد و رفت کا نہیں اور
تو اس گنبد میں موجود ہے اس لئے سوچنا چاہئے کہ اگر اس گنبد کا کوئی
دروازہ ہوتا اور کھلا ہوتا تو تیرا غیر باہر سے آتا یا اندر سے باہر جاتا اگر
کوئی اس خانہ بے در میں مکیں ہے تو تو ہی ہے اس لئے کسی بیگانہ کا نشان
تجھے یہاں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔

بچشم تو نقش سوائی تو نیست بگوش تو غیر از صدائی تو نیست
تو جو بھی نقش دیکھ رہا ہے وہ تیرا ہی تصور ہے۔ دیکھنے والی تیری ہی
ہنکھ ہے۔ اس گنبد میں تیری ہی آواز گونج رہی ہے۔

بوہم و گماں بر چہ پیچیدہ چرا خویش را غیر فہیدہ
وجہ کیا ہے کہ تو دوہم و گمان میں الجھا ہوا ہے۔ اور اپنے آپ کو اپنا
غیر سمجھ رہا ہے۔

گمان عدم و ہم ہستی، ز تست خار از تو سر جوش مستی ز تست
یہ عدم اور ہستی کا دوہم و گمان جو تجھے اضمحلال اور ایک دوسرے کا غیر
دکھلا رہا ہے۔ یہ بھی نقش عدم و ہستی تیرا ہی تصور اور تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔
یہ خار جو درد سر کا موجب بنا ہوا ہے۔ یہ بھی تیری اپنی ذات کا نتیجہ ہے اور

مستی کا جوش بھی تیری ذات ہی کا کرشمہ ہے۔

زجائے دگر نیست این گفتگو توئی نشاء غفلت و جست و جو

حقیقت یہ ہے کہ تیرے دل میں جو ایک تڑپ ہے کہ تو را زمستی معلوم کرے یا اس طرف سے بالکل غافل ہے تو یہ غفلت اور یہ جست و جو غرض ہر ایک حال کا مقصد خود تو ہی ہے۔ یعنی اگر تلاش در پیش ہے تو جس شے کی تلاش ہے وہ تو ہے، اس لئے تو اپنی حقیقت کا فہم حاصل کر۔

یکے ہمچو خم در گریبان خویش نظر کن بہ میں جوش طوفان خویش
کبھی خم یعنی شٹکے کی طرح اپنے گریبان میں مٹھ ڈال کر دیکھ اور اپنے ہی
طوفان کا جوش دیکھ، اگر شراب ہے تو شٹکے کے اندر ہے اور اگر شراب
جوش مارتی ہے تو اسی شٹکے کے اندر، اس لئے خم بھی تو اور شراب اور نشہ
بھی تیرے ہی اندر ہے۔

ز رشور تو این بزم دارد خروش ز خاموشی تست عالم خموش
جب تک تو زندہ ہے تمام کائنات زندہ ہے تو خاموش ہوؤا تو جہا تک
تیری ذات کا تعلق ہے تمام عالم عدم ہے۔

طلسم جہاں پردہ ساز تست تہی از خود پر ز آواز تست
یہ جہاں ایک طلسمی کا رخانہ ہے، یہ سمجھ کر کہ تیرے ہی ساز و جود کا
پردہ ہے۔ تیرے ہی چھپڑنے سے اس میں سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ ورنہ یہ عالم
طنبور کی طرح خود کھوکھلا اور اندر سے خالی ہے۔ آوازیں اور نغمات تو ہی
پیدا کر رہا ہے۔

چہ داماندہ در غم این آں طلسم خیالی ست نقش جہاں
تو اس جہاں میں سرگرداں کیوں ہو رہا ہے، یہ نقش عالم سب ایک
”دل اعظم“ کے تصورات ہیں، سورج کی طرح تو اپنی ہی کرنوں کے خط پر
گردش کر رہا ہے۔ اسی طرح تیرا راستہ تیرا ہی خط شعاعی ہے اور منزل بھی

تیرا اپنا آپ ہے جب تو اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے گا تو راز ہستی بھی تجھ پر کھل جائے گا کہ تیرے ہی دم سے ظہور عالم ہے۔ بیدل کا نظریہ حیات یہ ہے کہ منشاء فطرت ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ اور جب خود شناس ہو جائے گا تو اس پر ”الغیب“ یعنی ان امکانات کا انکشاف ہو گا جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہیں، اور اس علم کے بعد اس پر اپنے حقیقی مقام یا منزل کا انکشاف بھی ہو گا۔ انسان گمراہ کن وہم میں اُبھا ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اغیار کا محتاج سمجھتا ہے حالانکہ جس چیز کی طلب وہ غیر سے کرتا ہے وہ اس کے اپنے پاس ہے۔

بھیک کا بھوکا کوئی نہیں سب کی گھڑائی لال

گرہ کھول نہیں جانتے اس بدیہ کنگال

خواجہ حافظ بھی یہی کہتا ہے کہ

ساہا دل طلب جام جم از مامی کرد

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

گو ہری کز صدف کوئی مکان بیوں بود

طلب از گم شد گال لب دریا می کرد

بیدل کہتا ہے کہ

یکے در پس زائے خود نشیں

رخ خود در آئینہ خود بہیں

تماشا ئے ہستی ہمیں است بس

دریں بزم ہستی ہمیں است بس

در آئینہ عالم رنگ و بو

نہا شد نمودار جز نقش تو

چونظارہ خیر و شر می کنی

بہ نیک بد خود نظر می کنی

منور عشوہ ہر کس و نا کسے

تو گرنستی نیست این جا کسے

ز تحقیق عالم چه خواهد کشود

کہ از وہم ہم وہم خواهد نمود

مکن صید غیر از کیس گاہ خویش

دراں کوش تا گردی اہ گاہ خویش

کہ با خود بیک لحظہ پرداختن

تواں کار ہر دو جہاں ساختن

انسان اپنی انفرادی حیثیت کا جائزہ لے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ”آپ مرے جگ پر لو“ اگر وہ خود جہاں میں نہ ہو تو جہاں تک اس کی انفرادی زندگی کا تعلق ہے جہاں عدم ہے، تو جو کائنات یا ہستی عالم کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لے کہ خواہ مخواہ درد سر مول لے رہا ہے۔ تیرے سوا جو کچھ بھی ہے سب موبہوم ہے۔ وہم کا انکشاف آخر وہم ہی ہوگا۔ ”باطل از باطل بروید حق ز حق“ تجھے وہم وہم میں ابھار رہا ہے۔ تو بغرض تحقیق اس طرح گھات میں بیٹھا ہوا ہے جس طرح شکاری شکار کے لئے۔ تو ”غیر“ کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ تجھے کوشش یہ کرنی چاہئے کہ خود آگاہ ہو۔ اگر ایک ساعت بھی ”باخود“ ہوگا تو دو جہانوں کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

جب ”میاں مٹھو“ کو پرٹھا نا منظور ہوتا ہے تو آئینہ اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اور پرٹھانے والا آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر چند الفاظ کہتا ہے۔ طوطا آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ لیکن اتنا شعور نہیں ہوتا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے، وہ اتنا سمجھتا ہے اس کا ”مگر ہم جنس بول رہا ہے۔ تو یہ بولی وہ خود بولنے لگتا ہے، حافظ کہتا ہے کہ:

دہلےں آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت ہاں می گویم

اسی ضمن میں ”وجی“ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ لیکن سر دست یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ آئینہ تیرا اپنا قلب ہے، اور اسی آئینہ میں تو اپنا آپ ہی دیکھ رہا ہے، لیکن غلط فہمی سے سمجھتا ہے کہ تو غیر کو دیکھ رہا ہے غیر کی آواز سن رہا ہے، حالانکہ جسے تو محسوسات کہتا ہے وہ تیرے ہی حواس کا احساس ہے غرض تیرے ہی دل یا قلب میں کل کائنات سمائی ہوئی ہے تو ہستی کا مشاہدہ اپنے دل سے باہر نہیں کرتا لیکن یہ عجیب طلسمی کارخانہ دل ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ تجھ سے باہر ہے،

حالانکہ جو کچھ تو مشاہدہ کر رہا ہے وہ تیرے ہی دل میں ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ غیب و شہادت یا ظاہر و باطن اعتباری اور نسبتی امور ہیں مثلاً ہم اجرام سماوی کو بہت دور اپنے سر پر بلند دیکھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ ہم پستی میں رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی سیارہ میں ہوں تو ہم زمین کو بھی اتنی دور دیکھیں گے جتنا یہ سیارہ زمین سے بلند نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں وہ خود اشیا نہیں ہیں۔ بلکہ اشیا کی "ظل" ہیں جن کو ہم "صورت" سے موسوم کرتے ہیں، یہ عالم صورت یہی رنگ و بو ہی ہے۔ یہ وہ صورتیں جو ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں، با صرہ میں رنگ اور روپ اور سامعہ میں آوازیں اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے صرف صورتوں کا مجموعہ ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں اور ہمارے حواس صورتوں کے سوا کچھ محسوس کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہم کو ایک اور ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اشیاء محض صورتیں ہی نہیں ان صورتوں میں حقائق بھی رونما ہو رہے ہیں۔ ان حقائق کا انکشاف ہمارے قلب پر ہوتا ہے۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ سر درست سوال صرف یہ ہے کہ "حق" کا انکشاف ہم پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیا معیار ہے جس پر حق و باطل پرکھا جاسکتا ہے؟ اس لئے بحث تحقیق پر آرہی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ :-

بدیو ان ہستی سخن ہا بسے است ازاں جملہ یک حرف تحقیق نیست
لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور باتیں بناتے والے
بھی بہت ہیں، حرف تحقیق کسی سے نہ سنو گے۔

ازاں نقش کار جہاں ابتر است کہ آثار تقلید یک دیگر است
دنیا کے کاموں میں خرابی کی وجہ یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی
تقلید کرتے ہیں اور کرتے چلے آرہے ہیں۔

زہن درس تقلید شد آشکار نشد هیچ کس واقف از اصل کار
 جس کی بات سنو وہ کچھ اپنی تحقیق اپنا مشاہدہ اپنا تجربہ بیان نہیں کرتا اور
 اگر کرتا ہے تو لوگوں کو اپنی بات ہی منوانا چاہتا ہے مقلدین اس کو مل جاتے
 ہیں اور وہ اس کی باتوں پر فریفتہ اور دوسروں کو فریفتہ کرتے ہیں، اصل
 حقیقت سے واقفیت تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے اگر ہم علی وجہ بصیرت
 اس کی باتوں کو وزن کریں۔ لوگ اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور جس
 شخصیت کی تقلید کرتے ہیں اس کو خدائی درجہ دیتے ہیں۔ ایسے معبود لوگوں
 نے بہت بنا رکھے ہیں اور ان میں اختلاف اور شرانگیزی تفرقہ بھی ہے۔ یہ کہنا
 کچھ بے جا نہیں کہ اسی تقلید کا کرشمہ ہے کہ عالم انسانی میں فتنہ و فساد برپا
 ہے، اگر ان پر حق کا انکشاف ہوتا تو سب امن سے زندگی بسر کرتے۔
 اس لئے کہ حق میں اختلاف نہیں۔

بخار از دماغ یکے شد بلند رسانید و ہمیش بگردوں کند
 ایک شخص کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ
 حق یہی ہے، اب وہ آسمان سے باتیں کرنے لگا، کہ اسے آسمان سے الہام
 ہو رہا ہے۔

یکے فکر جمع کتب می کند ز اوراق سب جب می کند
 بعض اشخاص کتابیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ کتابوں میں مصنفین کے
 خیالات ہی تحریر ہوتے ہیں، یہ پڑھتا ہے اور تقلید انہیں سچ یقین کرتا ہے،
 اس لئے یہی کتابوں کے اوراق اس کے ذہن پر پردہ کا کام دیتے ہیں، وہ
 خود نہیں سوچتا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ وہ
 انہیں اس حد تک صحیح یقین کرتا ہے کہ اپنا زور و طبع ان کی تائید پر صرف
 کرتا ہے، اس طرح اکثر کتابوں کی شرح لکھی گئی۔

یکے شد مہندس بگفت و شنید یکے ساغر فیلسوفی چشید

ریاضی دان تو چند آدمی گزرے ہیں۔ انہی کی کتابوں کو رٹ کر لوگ ریاضی دان مشہور ہو جاتے ہیں، ابوالفضل کے دفتر پڑھ کر لوگ منشی فاضل بن جاتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ پڑھ کر لوگ فلسفی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدرسوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

یکے خاک را گفت تمکین شعار یکے گفت گردوں ندارد قرار
پہلے حکماء کا یہ نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور تمام اجرام سماوی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ آج یہ نظریہ باطل ہو گیا۔ ایک مدت دراز تک۔

بوہم دگماں جمعے از پیرواں نکرذند جز کسب تصدیق آل
لوگ اسی نظریہ کو صحیح یقین کرتے رہے اور اسی مفروضہ کو صحیح قرار دیکر کائنات کی گتھی سلجھاتے رہے، اور دلوں کو تسکین دیتے رہے کہ ہم کو کائنات کا راز معلوم ہو گیا۔ لیکن اس عرصہ میں تحقیق و تصدیق کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔

ندیدند از عقل جہل الکتاب
کہ ہست از چہ رہ این سکون و شتاب
کسی نے کوشش نہ کی کہ پہلے یہ تو تحقیق کرے کہ ”حرکت“ اور ”سکون“ کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اگر کبھی کچھ عقل سے کام لیا تو جہل ہی کسب کیا۔

دے کز حقیقت بیاں می کند حوالہ بغہم کساں می کند
اگر کوئی ان اسباب کو بیان بھی کرتا ہے تو حوالہ متقدمین کے اقوال ہی کا دیتا ہے۔

کہ آں بحر دانش چنین گفتہ است
در معرفت این چنین سفتہ است

کہ فلاں بحر العلوم نے یہ اور وہ فرمایا ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ معرفت کے آبدار موتی اسی نے جمع کئے۔ یہ سلک مردار پیدا اسی نے تیار کی۔

کسے تکیہ بر فہم مردم کند کہ چوں جہل راہ خرد گم کند
بیدل کہتا ہے کہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہی شخص دوسروں کی عقل کا سہارا
لیتا ہے جو خود عقل سے بے بہرہ ہے۔ یعنی جاہل ہے۔ اس لئے تقلید اور
جہالت لازم و ملزوم ہے۔

قیاس و گماناں خصم دانائی است سراپائی تقلید رسوائی است
تحقیق اور شے ہے اور قیاس اور گماناں اور چیز ہے۔ آخر الذکر یعنی قیاس و
گمان عقل کی دشمن ہیں اور تقلید عقل ہی کی رسوائی ہے۔

دے کا متھاں آشکارا شود مقلد بہ تحقیق رسوا شود
مقلد کی شناخت یہ ہے کہ جب اس کے علم کا امتحان کیا جائے تو
جاہل ہی ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں بیدل نے ایک حکایت لکھی ہے کہ
فضولے بائین کار آگہاں بلاں سخن بود گرم بیاں
ایک فضول بیہودہ گواہل تحقیق کی طرح باتیں بنا رہا تھا۔ کہ میں نے
اکثر دریا کا سفر اس طرح کیا ہے جس طرح بادل کرتا ہے تجارت پیشہ ہوں
اور اسی ذریعہ سے کشتی کی طرح کئی دریاؤں سے عبور کر چکاں۔

زمن معنی بحر پوشیدہ نیست دریں نسخہ حرفی نغمیدہ نیست
مجھے بحر کے تمام حالات کا علم ہے اور کوئی ایسی بات بھی تو نہیں جو
میں نہیں سمجھتا۔ جو لوگ ساحل پر رہتے ہیں انھیں سمجھاؤں تو کیسے سمجھاؤں
کہ انھوں نے کبھی سمندر کو دیکھا تک نہیں۔

یکے گفت زیں جملہ سیرو سفر زماہی اثر بردہ باشی مگر
حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے اتنی سیرو سفر میں مچھلی تو
ضرور دیکھی ہوگی۔

کہ چوں دیدہ و رہا ب دارد وطن ز دلغ است پھوں دشن بیرہیں
 مچھلی کی مشابہت صورت آنکھ سے ہے دونوں پانی میں ڈوبی رہتی ہیں اس
 تشبیہ نے شعر میں لطف پیدا کر دیا۔ کہ آنکھ کی طرح پانی میں اس کا وطن ہے اور
 اس کا لباس تمام داغدار دل کی طرح ہے۔ اس یادہ گونے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا سوال
 ہے۔ اس تمام سفر میں یہی مچھلی تو میری غذا تھی، سائل نے جب دیکھا کہ آپ اس قدر
 عتاب فرما رہے ہیں تو کہا کہ جنور میں مچھلی اور اس کے حالات سے بالکل ناواقف
 ہوں۔ اگر سوال کیا تو خفا نہ ہوں۔ اگر کچھ بیان فرمائیں تو میں قیاس کروں گا۔ کہ
 مچھلی کی کیا شکل و صورت ہوتی ہے۔ اس بیہودہ گونے کہا کہ ہوشمند مچھلی وہی ہے
 جس کے سر پر اونٹ کی طرح دو سینک ہوتے ہیں۔ بہیں اشترو ما ہی ایجاد کُن
 اونٹ دیکھ لو اور اس پر مچھلی کو قیاس کرو۔ تمام حاضرین قہقہہ مار کر ہنسے اور
 سمجھ گئے کہ ”چو ما ہی شتر نیز کم دیدہ است“ کہ مچھلی تو دیکھی نہیں اونٹ بھی نہیں
 دیکھا۔ بیدل کہتا ہے کہ

چہ لانی بحرف کساں خامہ ار صریح تحقیق خود ہم برآر

لوگوں کی باتیں سن کر وہی لوگوں سے باتیں کرنا اور اس پر فخر کرنا کہ میں صاحب علم
 ہوں یا مجھے لوگ عالم سمجھ کر عزت کریں، نہایت ناوابج بات ہے قلم حروف تو لکھتا ہے
 مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ حروف شناسی قلم کو حاصل نہیں۔ اس لئے شایان انسانیت یہی
 ہے کہ تو اپنی تحقیق اگر کچھ ہے بیان کرے۔ اس موضوع پر مولانا رومیؒ نے بھی لطیف بحث
 کی ہے کہ بعض لوگ اہل اللہ کی سی باتیں کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح
 شکارے جانور دل کی بولیاں بولتے ہیں۔ جانور اپنے ہم جنس کی بولی سن سکتا ہے
 اور جال میں چنسن جاتا ہے اسی طرح یہ ریاکار فریبی لوگوں کو پھانس لیتے ہیں وہ تو
 سمجھتے ہیں کہ حضرت مقربان میں سے ہیں مگر کیا معلوم کہ نرے باتوں ہی ہیں۔ عقل کے
 اندھے اور کانٹھ کے پورے اکثر چنسن جاتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم رئے ہست پس نباید او در ہر دست دست
 اکثر آدمی صورت شیطان ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنی چاہئے۔

عرفان

مثنوی "عرفان" کے گیارہ ہزار ابیات ہیں، اس مثنوی کے اختتام پر
بیدل نے تاریخ تصنیف کہی ہے کہ

وضع ابیات میں خیال نمود	جز خطے چند در خیال نمود
یک ہر گاہ در شمار آمد	برزباں یازدہ ہزار آمد
کرد تاریخ او نیاز اقلم	ہدیہ ذوالجلال والا کرام

۱۱ ۲۴

اس مثنوی میں بیدل نے داؤد تحقیق دی ہے -
علم تحقیق می کنند تلقین کہ در آئینہ ظہور یقین
تا بر افشائی رسد اسرار محو گیر از تحقیق آثار
علم تحقیق یہ ہے کہ کسی امر، کسی شے، کسی واقعہ کے بارہ میں یقین نہیں
ہو سکتا جب تک وہ "اسرار" یعنی پوشیدہ ہے -

جب تک وہ کسی صورت میں رونما نہ ہو جسے ہمارے حواس
محسوس کریں، اس حالت پوشیدگی میں وہ "ہیولی" سے تعبیر ہوتا ہے،
اور جب تک محسوس و مکتوف نہ ہو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جہاں تک ہمارے
علم یقین کا تعلق ہے بمنزلہ عدم ہے -

اعتبارِ طبیعت بیزنگ از ہیولی شد اشتہار آہنگ
 یہ ”طبیعت بیزنگ“ ہے جو ہیولی کے نام سے اصطلاح میں مشہور ہے۔
 ہر ایک شے کی ”طبیعت“ خود بیزنگ ہے، اور جب تک کوئی شے کسی رنگ
 روپ میں محسوس نہ ہو اس کا انکشاف ہم پر نہیں ہو سکتا، یہی ”طبیعت بیزنگ“
 جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کیل ہے ہیولی کے نام سے تعبیر ہوتی ہے اور
 اس کی موجودگی کا احساس اس صورت سے ہوتا ہے جس میں وہ رونما ہوتا
 ہے، اس لئے یہ صورت محض اشارہ ہے جو ہیولی کی ہستی کی طرف ہے، یا جیسا کہ
 بیدل نے اور مقام پر کہا ہے۔ حروف یا ”کسوت عبارت“ ہے جس میں معانی
 پوشیدہ ہیں۔ اصل شے یہی ”ہیولی“ ہے، ایک غزل کا مطلع ہے کہ
 یک دودم بنگامہ تشویش مہر و کیسنہ بود
 ہر چہ دیدم یہاں خانہ آئینہ بود

زندگی ایک دودم ہی ہے، یہی سانس ایک آتما اور وہی دوسرا جاتا
 ہے، اس لئے زندگی بھر ”مہر و کیسنہ“ نے پریشان رکھا، یعنی مہر و کیسنہ ہی
 ہے جس سے رشتہ تعلقات اس دنیوی زندگی میں انسان کا اپنے ہم جنس
 انسانوں سے بلکہ کائنات کی اشیاء سے ہے کہ کسی طرف۔ طبیعت مائل ہوتی ہے
 اور کسی شے سے نفرت ہوتی ہے۔ لیکن جب میں نے بنو۔ دیکھا تو یہ جذبات مہر و
 کیسنہ آئینہ دل پر صورتوں کا نقش ہی تھے، اور زندگی کے ساتھ چھو ہو گئے،
 آئینہ میں کوئی صورت منتقل نہیں ہوتی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے کہ
 بیچ شکلے بے ہیولی قابلِ صورت نہ شد
 آدمی ہم پیش ازاں کا دم شود بوزینہ بود

”ہیولا“ کی موجودگی مقدم ہے اور جب تک یہ نہ ہو کوئی شکل متصور نہیں
 ہو سکتی، اس لئے صدمت آدم کا ”ہیولا“ ”بوزنہ“ تھا، کہ اسی سے ارتقا کرتا ہوا
 آدم، انسانی صورت میں آیا۔ لیکن بندر کی صورت تو محسوس ہوتی ہے،

اس لئے یہ ابتدائی ہیولا نہیں ہے۔ بندر کا ہیولا بھی کچھ اور ہونا چاہئے جو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہی ہوگی، پہلی کڑی حسب ارشاد قرآن "نفس واحدہ" ہے جو "طین" سے ارتقاء کرتا ہوا آخر انسان بنا۔ اسی طرح اس شہادت کی روش سے انسانی ہیولا اس صورت کا ہوگا جو "خلق جدید" میں رونما ہوگی، اس کا صحیح تصور ہم موجودہ حالت میں نہیں کر سکتے، لیکن جس طرح بندر انسان کے بہت مشابہ ہے اسی طرح انسان کے مشابہ وہ صورت ہوگی جو "خلق جدید" میں متوقع ہے۔

فکر ہر جارموز تخم شگافت جز ہیولائے برگ و بار نیافت
درخت کا "ہیولا" بیج ہے، اہل فکر جب درخت کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان پر واضح ہوتا ہے کہ درخت کے پتے اور پھل وغیرہ کی اصل یا ہیولا وہی بیج ہی ہے جس میں ارتقاء یہ درخت کرتا ہے۔

برگ و بر نیز گاہ پیدائی می کند تخم را ہیولائی
یہ قانون فطرت ہے — کہ پیدائش میں کوئی شے چونکہ باطل نہیں اور ذات باری تعالیٰ حق ہے اور حق سے حق ہی پیدا ہوتا ہے باطل از باطل بروید حق ز حق "اس لئے کوئی شے جو ایک دفعہ خلق ہوئی معدوم نہیں ہوتی یعنی کسی شے کا "بیج" ناس نہیں۔ اس لئے بھی ہر ایک شے اپنے وجود میں کامل ہے، بیدل کہتا ہے کہ

بیج موجود ہے، بعض شوق ناقص جلوہ نیست

ذره ہم در رقص مو ہو میکہ دارد کاملست

ہر ایک شے جو موجود ہے اپنے ظہور یا جلوہ میں ناقص نہیں ہے، ذرہ بھی اپنی فطرت کا اظہار رقص میں کرتا ہے اگرچہ یہ موبہوم ہی ہے مگر کامل ہے۔

اس لیے کوئی شے خواہ ارتقاء کے بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہو ہر ایک

ارتقائی مرحلہ کی شہادت بھی موجود ہے، یہی بیج "نشوونما پاکر درخت بنا، لیکن بیج ناس نہیں ہوا وہی پھر پھل میں ظاہر ہوا۔

آب گاہ لطافت است ہوا چوں ہوا از فسر دن آب نما
پانی کی اصل ہوا ہے، دونوں کی مختلف صورتیں حرارت کی کمی بیشی سے ظہور میں آئیں، پانی کو حرارت دی جائے تو لطیف ہو کر بخارات اور پھر ہوا کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے جب ہوا میں حرارت ایک خاص درجہ تک کم ہو تو وہ پانی بن جاتا ہے۔

جلوہ بر جلوہ آنچہ پیدا شد آں یکے صورت آں ہیولا شد
ایک صورت سے دوسری صورت جلوہ نما ہوتی ہے، پہلی "ہیولا" اور دوسری اسی کی صورت ہے۔

اسم آخر باشتہار آمد کہ ہیولا بروئے کار آمد
"ہیولا" اسم "اول" ہے اور جب اس کا ظہور ہوا تو یہ اسم "آخر" کا مظہر ہے۔

بیدل پیدائش میں ہر ایک شے کو اسما و صفات سے تعبیر کرتا ہے، کہ سب مظاہر قدرت انہی اسما و صفات کے ہیں۔

صور جسم ہائے امکانی دارد این آئینہ بربانی
ملکات یعنی جو کچھ بھی موجود ہے یا موجود ہو سکتا ہے ان کی مادی صورتیں انہی اسما و صفات کی آئینہ دار ہیں اور یہی بے حجابانہ منکشف ہو رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ

نقش پیدا و آئینہ محبوب بخفا گشت ازین باب منسوب
آئینہ میں صورت منعکس ہو تو صورت تو مشاہدہ ہو رہی ہے مگر آئینہ کو اس صورت نے چھپا لیا، آئینہ غیب ہے اور صورت ظاہر۔ اس لئے "خفی" بالغیب سے یہ حقیقت موسوم ہوئی اور یہی "ہیولا" ہے۔

ایں ہیولانہ عرض و طول است
چوں طبیعت وجود معقول است

یہ ہیولانہ نہیں جس کا عرض و طول ہوتا ہے، عرض و طول اس میں نہیں جس طرح ”طبیعت“ معقول فی الذہن شے ہے اسی طرح اس کی موجدگی یا ہستی ایک ذہنی امر ہے اور حقیقتاً اور اصل شے ہے، طویل بحث کے بعد بیدل ان طبقات کو جو کرۂ ارض پر مشاہدہ ہو رہے ہیں بطور شہادت پیش کرتا ہے، ہم نے چندا شعار کا انتخاب کیا ہے، مقصد تو اتنا ہے کہ قارئین بیدل سے روشناس ہوں۔

کرہ ارض پر سلسلہ موجودات کی آخری کڑی ”انسان“ ہے۔ بیدل انسانی صورت کا ہیولانہ تلاش کے بعد پیش کرتا ہے، کہ ادنیٰ طبقہ جمادات کا ہے اور پھر نباتات اور اس کے بعد حیوانات کا اعلیٰ اور بلند تر طبقہ ہے آخری طبقہ میں ”انسان“ ایک ممتاز ہستی مشاہدہ ہوتی ہے۔ اس کا ہیولانہ طبقہ جمادات میں ہے اور اسی طبقہ میں وہ خاص خاص صورتوں میں ظاہر ہوا جس کی شہادت موجود ہے۔ بیدل کی تحقیق سمجھنے کے لئے یا موضوع زیر بحث کے فہم کے لئے ”ہیولانہ“ کے بعد ”علم“ کا فہم مقدم ہے جو انسان کی امتیازی خوبی ہے۔
”علم“ کے بارہ میں بیدل کہتا ہے :

چلیست علم؛ اصل قدرتیچوں قلم جمیعت ظہور و بطوں
علم کیا ہے؟ حقیقت قدرت اقبیہ ہے جہاں چہ و چند و چوں کام نہیں آتے۔ کائنات خارجی اور ذہنی تصورات میں عین مطابقت کا نام ہے۔

حسن مرآت عالم و معلوم نور تمیز حاکم و محکوم
علم آئینہ ہے جس میں ہر ایک حسن و خوبی خواہ عالم میں ہے یا معلوم میں رونما ہوتی ہے۔ اور مختلف طبقات ہستی کے نشیب و فراز اور اعلیٰ و ادنیٰ میں امتیاز اسی نور علم کی روشنی میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

تا نگیری ز علم خامہ بدست صورت پیچ چیز نتوان بست
یہ علم ہے جو مصور ہے اور ہر ایک شے کی صورت ہو ہو کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔
غیر علم آنچہ کردہ اندر قم نیست جز جہل و جہل جملہ عدم
علم کی ضد جہالت ہے اور جہالت کا مفہوم عدم ہی ہے کہ کسی شے سے
انسان روشناس نہیں ہو سکتا اس لئے غیر علم جو کچھ بھی ہے محض جہل ہے اور
جہل عدم کے ہم معنی ہے۔

نزد اہل حقیقت ایجاد پیچ چیزے بغیر علم نرادر
جوانی نظر محقق ہیں ان کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ کوئی شے علم کے بغیر
ایجاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ کائنات جو عالم ایجاد ہے اس کی اصل وہی
”قدرت بیچوں“ یعنی علم ہے۔ بعض حکماء کا یہ نظریہ ہے کہ علم مادہ کی پیداوار
ہے۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ مادی کائنات علم نے ایجاد کی ہے۔ کیونکہ یہ
حقیقت ناقابل انکار ہے کہ کوئی ایجاد بغیر علم ممکن ہی نہیں۔

ہرچہ بینی ز مفرد و ترکیب دارد از علم جو ہر ترتیب
خواہ کوئی شے مفرد ہو یا مرکب اس کی ترتیب علم ہی سے ہے۔ بیدل
نے مادی کائنات کے نظام اور اشیاء کی ترکیب و ترتیب کی شہادت پیش
کی ہے کہ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ”جو ہر ترتیب“ یعنی اس کی اصل علم ہے،
اس حد تک بحث نظری تھی جس کی تصدیق تجربہ اور مشاہدہ سے ہو سکتی ہے۔
یہ مجمل بحث ہے اس کی تفصیل حسب ذیل آیات میں کرتا ہوں۔

غافل از عالم جماد مباحش کہ نہا نہادیں محل شدہ فاش
کہہ ارض پر تین مادی لطقات ہیں، ایک جمادات و دوسرا نباتات
تیسرا حیوانات، تینوں کی حقیقت ایک ہی ہے، مادہ صرف صورتیں ہیں
جو ہم اپنے حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں، حقیقت ایک پوشیدہ شے ہے،
حقیقت مجرہ کا احساس ناممکن ہے جو الغیب ہے احساس اسی حالت میں

ممکن ہے جب وہ کسی صورت میں رونما ہو، جس کو اصطلاح میں ”مجاز“ کہتے ہیں، یہ حقیقت زیر بحث ہم پر منکشف نہ ہوتی اگر وہ کسی صورت میں رونما نہ ہوتی، یہ صورت مادی ہے۔ بیدل ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ
 باخفا حقیقت، بافتشا مجاز بہ تشبیہ عالم، بہ تنزیہ راز
 حقیقت پوشیدہ یعنی کسی صورت میں رونما نہ ہو تو ”الغیب“ یا باطن سے تعبیر ہوتی ہے، اور جب کسی صورت میں ظاہر ہو مجاز سے موسوم ہے۔ جب ظاہر صورتوں میں رونما ہو جو ہم محسوس کرتے ہیں تو، ”عالم“ اس کا نام ہے اسے ”تشبیہ“ کہتے ہیں یا عالم ”امثال“ اور اگر تنزیہ یا غیب ہو تو ”راز“ کہلاتا ہے۔

عقول و نقوش از دلش تازباں

موالید و عنصر زباں تابیاں

”عقولات اور محسوسات یا تصورات جو دل پر ثبت ہیں اور خیالات کی صورت میں دل سے زبان پر آتے ہیں۔ موالید یعنی جمادات و نباتات و حیوانات اور وہ عناصر جن سے ان کی ترکیب ہوتی ہے اصل میں ایک ہی مختلف قسم کی صورتیں ہیں۔ بلکہ نہ صرف زبان بلکہ ان کا بیان جو زبان ادا کرتی ہے جسے ”کلام“ کہتے ہیں۔ یہ بھی اسی کی ایک صورت ہے۔ بیدل کے میکما نہ تفکر کی بلندی کا اندازہ اسی شعر سے ہو سکتا ہے۔ ”بیان“ کیا ہے؟ خیالات کی ترجمانی حرف و صوت کی ”صورت“ میں، خیالات کیا ہیں؟ نقوش یا تصورات جو کائنات خارجی کے مشابہہ سے بذریعہ حواس دل پر ثبت ہوتے ہیں یا پیدا ہوتے ہیں، کائنات کیا ہے۔ صورتیں، یا نقوش ہیں جن میں ”حقیقت“ رونما ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہو کہ یہ ”حقیقت“ متکلم ہے اور ہم مخاطب، تصویری زبان میں ہم پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم گفتگو میں اپنا

ما فی الضمیر اپنے مخاطب پر اپنی مادری زبان میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے بیان کے سلسلہ کی پہلی کڑی یہ حقیقت مجروحہ ہے۔ جو کائنات کی صورتوں اور پھران صورتوں کے نقوش اور خیالات کی شکل میں ہمارے دل میں پیدا ہو کر زبان پر آتے ہیں۔ اس لئے حقیقت ایک ہی ہے اگرچہ صورتیں یا اشارات مختلف ہیں۔ حروف اشارات ہی ہیں۔

تامل بمعنٰی، نفس در نبات۔ حیوان صداد و در انسان لغات جب ہم کسی سوچ میں ہوں تو خاموش ہوتے ہیں مگر دل ہی دل میں باتیں کرتے ہیں، اسی طرح یہ کلام حقیقت معدنیات یا طبقہ جمادات میں خاموش ہے، اور یہی نباتات میں "سانس" کی صورت اختیار کرتا ہے، جب ہم غفلت کرتے ہیں تو سانس کی آمد و رفت اور حرکت زبان سے آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ صوت حروف کی صورت اختیار کرتی ہے، نباتات میں زبان نہیں مگر سانس ہے، سانس زندگی کے آثار میں سے بھی ہے۔ طبقہ حیوانات میں سانس اور زبان دونوں ہیں اس لئے ان میں آوازیں ہیں، مگر حروف نہیں، انسان میں یہ تینوں باتیں ہیں اور اس کی زبانوں اور بولیوں نے "لغات مرتبہ کی۔ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

آں قلم بے نشانے پردہ راز کا نشان زانوئے اوست منحرج پوز

در آئینہ جماد موج رنگست در طبع نبات، حیوان آواز

حقیقت تو غیب الغیب ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں تشریح کی ہے کہ خارجی صورت آخر انسان ہے (خلق الانسان علمہ البیان) یہی اس کا بیان بھی ہے اور بیان کر رہا ہے، یہی جمادات کے آئینہ میں رنگوں کی صورتیں موج مار رہی ہے، یہی نباتات میں "بو" یعنی سانس لے رہی ہے، اور یہی حیوانات میں آواز دے رہی ہے۔

الغرض "غافل از عالم جماد مباش" ہم سمجھتے ہیں کہ جمادات پتھر اور

مٹی کی چیزیں بے شعور مردہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ یہ غفلت ہم آیات الہیہ سے برہمتے ہیں۔ ان کا مطالعہ عقلاً نہیں کہتے، یہ اشیاء بھی ہم سے ہم کلام ہو رہی ہیں۔ لیکن بوجہ غفلت ہم ان کی نہیں سنتے، مولانا روم فرماتے ہیں۔

نطق آب و نطق باد و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل

اہل دل جو اہل علم و حکمت ہیں وہ طبقہ جمادات کی باتیں سنتے ہیں، ہمیں اشیاء کے خواص کا علم ہی کیسے ہو سکتا تھا اگر یہ اشیاء اپنے حقائق اپنی فطری زبان کے ذریعہ ہم پر واضح نہ کرتیں، ہماری تمام مادی ترقیات انہی مادی اشیاء کے خواص و حقائق کے علم سے وابستہ ہیں۔ بیدل کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک حقیقت مجردہ ہے، یہ کلمہ الہیہ ہے، ناممکن ہے کہ اللہ کسی سے ہم کلام ہو۔ یعنی حقیقت مجردہ کا احساس ناممکن ہے، جب یہ کسی صورت میں رونما ہوتی ہے تو اس کی ”ہستی“ کا شعور نہیں ہوتا ہے، لسان قرآن میں یہ صورت ایک ”توحی“ ہے جس میں غلطی کا احتمال بہ تعلق فہم بھی نہیں ہے۔ دوسری ”من وراء حجاب“ یعنی اشیاء کی صورتوں کے پردہ میں اور یہ بذریعہ تذکرہ تفکر اہل علم پر عقلاً ہوتا ہے۔

زیر تعین کہ وقفہ جوار ہست جوش اسرار علم بسیار ہست
اگرچہ طبقہ جمادات میں اشیاء کی صورتیں متعین ہیں اور ایک ہی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہیں اور ان میں زندگی کے آثار بظاہر نمایاں نہیں مگر ”حضرت علم“ کے اسرار ان میں بھی جوش مارتے ہیں۔

سیر اشکال گر ہوائے کسے است خفت و ثقل طول و عرض ہے است
اگر کسی کو خواہش ہو کہ ان جمادی اشیاء کی شکلوں کا جائزہ لے تو کم و

بیش ان میں وزن اور طول و عرض تو مشاہدہ ہو رہا ہے۔

آنچہ زیریں ہا بہ پردہ کشوف است

اکثرے برخواص موقوف است

ان شکلوں کے پردہ میں جو کچھ ہم پر منکشف ہو رہا ہے زیادہ تر ان اشیا کے خواص ہی ہیں۔

باوجود جوارح مفقود موجدی زندگی خواص وجود جمادات میں حیوانات کی طرح دست و پا و اعضا نہیں لیکن ”وجود“ کے خواص ان سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔

جہل عام است و طبیعت سنگ کہ نصیب ندارد از فرہنگ
پتھروں پر عام جہالت طاری ہوتی ہے۔ جاہل انسان بھی پتھر ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی گیا گزرا، اس لئے کہ کسی امر کو شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے جیسا کہ انسان کرتا ہے (علمہ البیان) ”بیان“ کسی شے کے خواص یا حالات کو تفصیل کے ساتھ واضح کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی سے علم کا نشو و نما ہوتا ہے، جہاں بیان یا قوت گویائی نہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر سکے وہاں جہل مسلط ہے۔

صفحہ اس جافسردگی رقم است نقش قدرت بنور در عدم است
اس صفحہ ہستی جمادات پر افسردگی چھائی ہوئی ہے، وہ نقوش جو نباتات و حیوانات میں صاف صاف صاف ممیز مشاہدہ ہوتے ہیں ان کا وجود جمادات میں بمنزلہ عدم ہے۔

اس موضوع پر بیدل نے طویل بحث کی ہے، ہم صرف چند اشعار کا انتخاب کرتے ہیں۔

نام اجمار خاص فلزات است کہ زانوار علمش آیات است
پتھروں کی بے شمار قسمیں ہیں، ان میں سے ایک خاص قسم کا نام ”فلزات“ ہے، جو علم کے نور کی نشانیاں ہیں، یعنی ان میں نور علم کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد چاندی اور سونا اور فولاد اور الماس کے خواص پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

ذہب از معنی است شاہ پذیر خاصہ در اعتبار اسم بصیر
 ”نشہ“ بھی غیر محسوس شے ہے، معنی بھی، الفاظ محسوس ہوتے ہیں،
 مطلب شعر یہ ہے کہ سونا میں معنی کا نشہ ہے، یعنی بے معنی شے نہیں۔ اسم بصیر
 کے خواص اس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

گر ز خامیتش خبر گیری بہرہ قوت بصر گیری
 اگر تو اس کی خاصیت سے واقف ہو تو قوت بصر کی حقیقت منکشف
 ہوگی، یہ حقیقت تو ہر ایک ڈاکٹر اور حکیم کو معلوم ہے کہ سونا امراض چشم
 بالخصوص ضعف بصر کے لئے بہت مفید ہے۔

سیم دارد بہرہ قوت دل رفیع حاجات و حل ہر مشکل
 چاندی کی پوشیدہ خاصیت یہ ہے کہ دل کو تقویت دیتی ہے اور سونا
 چاندی ویسے بھی ہر ایک شکل کا حل اور ہر ایک حاجت رفع کرتا ہے۔

سے زر تو خدانہ و یکن بنہ

ستار عیوب و قاضی الحاجات

از زر و سیم نزد اہل نذر نیست پنہاں خواص شمس و قمر
 اہل نظر جانتے ہیں کہ سونے میں سورج اور چاندی میں چاند کے
 خواص موجود ہیں، یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے کہ زمین اور چاند ابتداء
 میں ایک سورج کا جزو تھے اور یہ کہ سیم وزر وغیرہ دھاتیں سورج ہی سے
 ان کے حصّہ میں آئی ہیں اور یہ کہ شمس و قمر کے خواص زمین میں بھی ہیں۔
 غالباً بیدل کا اشارہ اس طلسم سے ہے جو بعض حضرات چاندی اور سونے
 سے باندھتے ہیں۔ اور لگن اور گھڑی اور بھورت وغیرہ یا سعد یا نحس
 ساعت میں گنڈے تعویذ بناتے ہیں۔

ہم چناں روشن از نہو۔ حدید اعتبارت نفع و باس شدید
 اس شعر میں قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے

حدید کو نازل فرمایا جس میں نفع اور باس شدید ہے، لوہا بہت مفید دھات ہے اور جنگ میں بہت کارآمد ہے۔

نہیں نسق درجواہر ا حجار علم دار و ظہور بے تکرار
می فزائد ز اققنائے اثر حجر سرمہ نیز نور بصیر
اسی طرح جواہرات میں ”علم“ کا ظہور ہو رہا ہے، ایک سنگ سرمہ ہے، لوگ آنکھوں میں لگاتے ہیں، سرمہ کا فطری اثر ہے کہ نور بصیر زیادہ کرتا ہے یہ سمجھنا چاہئے کہ ”اسم بصیر“ کا ظہور سنگ سرمہ کے اثر میں ہوا ہے۔
توتیا است ہم بریں تاثیر بمددکاری نظر توفیر
اسی اثر و تاثیر کی وجہ سے اسے ”توتیا“ کہتے ہیں کہ نظر کی تیزی میں مدد دیتا ہے۔

ہر یک ایں جابرنگے ز آثار میدد عرض جوہر اسرار
اسی طرح ہر ایک پتھر اپنے اپنے خواص کا اظہار مختلف پیرایہ اور صورتوں میں کر رہا ہے جو ان میں پوشیدہ ہیں۔

گشتہ در عالم ظہور عیاں بلباس خواص قدرتشاں
عالم ہستی میں ان کی قوتیں ان کے خواص کے لباس میں ظاہر ہو رہی ہیں۔
اثر قدرت اند خاصیات بے خبر نگذری ازیں درجات

یہ اسی ”قدرت بیچوں“ کا اثر ہے جو خواص اشیاء سے تعبیر ہوتا ہے، ان میں بھی درجات ہیں، ان سے بے خبر نہ رہنا چاہئے۔ ارشاد قرآن ہے کہ قتی آیات ارض و سموات میں ہیں لوگ یونہی ان پر سے گزر جاتے ہیں اور وہ تو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں، یہ منہ پھیر لیتے ہیں یہی غافل لوگ ہیں۔

ادلیں نشاد ظہور ایں جاست ابجد در س گاہ نور ایں جاست
لیقہ جمادات میں اسماء و صفات کا ظہور اول اسی میں ہوا ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ کتب علم و حکمت کی ابجد خوانی کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

جمادات میں وہ جذبات بھی ہیں جنہیں ہم محبت و نفرت سے موسوم کرتے ہیں، بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

یعنی ایں جانقاب شوق درید میل آہن ربا بجزب حدید
آہن ربا یعنی مقناطیس اور لوہے کو دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ شوق میں لوہا خود بخود بے جبابانہ بے تکلف کچھا جا رہا ہے۔

قدرت افشائے معنی دارد کاین کشش درظہوری آرد
یہ اسی قدرت بیچوں کا کرشمہ ہے وہی اس معنی کو واضح کر رہی ہے کہ یہ کشش کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔

نہ حدید است پیش خود مختار کہ بجزب و قابود خود دار
لوہا خود مختار نہیں ہے۔ اس کا اختیار آہن ربا کے سامنے سلب ہو جاتا ہے وہ بے اختیار کچھا چلا جاتا ہے، انسان میں بھی جذبہ محبت جب عشق کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی اپنی قوت ارادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ حسن کے حضور بے اختیار ہو کر رہ جاتا ہے جذبہ وفا کے ساتھ خودداری لوہے میں باقی نہیں رہتی۔

ندرد آہن ربا تغافل ناز کہ بر آہن ردش نگر د باز
حسن کا تقاضہ تغافل ناز ہے۔ مگر آہن میں خود مختاری اور خودداری نہیں تو آہن ربا میں ”تغافل ناز“ بھی نہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوہا تو کچھا چلا جائے اور آہن ربا کچھا رہے، اور منہ پھیرے۔

آن بجزب اختیار داد دست ایں بہ تسلیم ناتوانی مست
جذبہ انفت میں لوہے نے تو اپنا اختیار ہاتھ سے دیدیا اور آہن ربا بھی سر تسلیم خم کر رہا ہے اور بیچارہ اسی میں مست ہے۔

درجنوں زار عشق علی ہست کہ بہ فہمش کسے نداد دست
اس جنون محبت میں بھی حضرتِ علم ہی کا فرما ہے کہ جو فہم و ادراک

سے بالاتر ہے، کنہ حقیقت نامعلوم ہے، جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے اس کے تاثرات ہی ہیں جو اس کی ہستی کا پتہ بتاتے ہیں۔
اس کے بعد بیدل جذبہ نفرت پر بحث کرتا ہے کہ دیکھو پارہ آگ سے دور بھاگتا ہے، گویا ان میں بغض کا رفرما ہے۔

پس بہ طبع جمادات افسردہ نتوان بست تہمت مُردہ
نتیجہ واضح ہے کہ اگرچہ جمادات افسردہ نظر آتی ہے مگر اس پر مُردہ کا حکم نافذ نہیں کیا جاسکتا، یہ مُردہ نہیں، مَرُوئی کی تہمت سے بری ہے۔
اس اثر پائے آگہی درجات نیست بیہتک گاہ ساز حیات
یہ خواص اور ان کے تاثرات درجات علم ہی ہیں اور زندگی کے ساز و سامان کے بغیر نہیں ہو سکتے۔

علم اس جانمور نفع حجاب اول از آہن آئرازی سیاب
علم نے اس مقام پر پہنچا دیا اول آہن اور آہن ربا کے حالات میں اور آخر آتش اور سیما کی صفات میں۔
منقل کز آگہی قلم برداشت بغض و حب نام اس صفات نہاد
عقل نے جب شعر کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کرنا چاہا تو ان صفات کا نام بغض و حب رکھ دیا۔

انس و وحشت و دبعت از لیست جوہر اس صفات لمیز لیست
حُب و بغض، انس و وحشت، نفث و نفرت جذبات ازل سے ہر ایک شے کی فطرت میں ودبعت ہیں۔ ان صفات کی اصل یا حقیقت ایسی ہے کہ کبھی زائل یا تبدیل، تحویل نہیں ہوتی۔

اس طویل بحث کے بعد جسے ہم نے بالاختصار ادا کیا ہے بیدل مشدق ارتقا کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس کی تائید میں طبقہ نباتات سے شہادت پیش کرتا ہے کہ جمادات کا ارتقاء نباتات میں مشاہدہ ہوتا ہے بعض پتھر

جن کو ”سنگِ شجر“ کہتے ہیں نباتات کی شکلیں ان میں نظر آتی ہیں۔ بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ اس عالم ایجاد کی اصل ہوا ہے، جو جوہر لطیف ہے، اسے اصطلاح تصوف میں ”نفسِ رحمانی“ کہتے ہیں، جمادات نے ایک سانس لیا تو دوسرا سانس نباتات کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حکمت ایجاد عالم من و ما یعنی آں جوہر لطیف ہوا
دم دیگر نفس بقدرت راند صبح ہنگامہ نبات دماند
اس کے بعد یہ بحث ہے کہ طبقہ جمادات میں جو خواص و حقائق ادا کرنے
درجہ میں مشاہدہ ہوتے ہیں وہی نباتات میں بدرجہ اعلیٰ نظر آتے ہیں۔
خود جمادات میں افسردگی کے درجات ہیں اس طبقہ میں جو اعلیٰ اجزاء ہیں
ان میں افسردگی کم اور کمتر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ارتقائی سلسلہ
کی آخری کڑی نباتات کے ادنیٰ درجہ سے آکر مل جاتی ہے، نباتات میں
بھی وہی خواص اور جذبات ہیں جو ادنیٰ درجہ کی حالت میں جمادات
میں مشاہدہ ہوتے ہیں۔

ریشہ ناتواں دریں عالم می شکافد دماغ سنگسار ہم
نباتات کا ریشہ کتنا کمزور ہوتا ہے اور پتھر کتنا سخت اور زنی ہوتا
ہے مگر نباتی ریشہ پتھر کو توڑ کر نکل آتا ہے۔ پہاڑوں پر روئیہ کی اسی طرح
مشاہدہ ہوتی ہے۔

دانہ تاشود نمو مائل سربروں می کشد رعد من نعل
ایک دانہ کی کیا بساط ہے مگر جب نشوونما کی طرف مائل ہوتا ہے تو
سومن مٹی سے باہر سر نکالتا ہے۔

بظہور خواص نفع و ضرر قدرت آئینہ شاخ تابان
درخت کا پتہ پتہ، شلخ سے ٹرتک اس کا ہر ایک جزو اپنے نفع و ضرر
سے واقف ہے اور حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کے لئے جس قوت کی غیب سے

ہے وہ درخت اور اس کے پتوں اور شاخوں اور پھلوں میں صاف صاف کار فرما ہوتی مشاہدہ ہو رہی ہے۔

گر ہمہ نیم گام رہ سپرست ریشہ را بر خرام خود نظر است
اگر درخت کا ریشہ ایک آدھ قدم بڑھتا ہے تو اس کی نظر اپنی رفتار پر ہے۔ وہ غلط قدم نہیں اٹھاتا۔

ہمہ سوا میا ز شمع نمود ہمہ جا روشن احتیاط وجود
ہر ایک طرف اس کا نشوونما مناسبت کے ساتھ ہو رہا ہے، شمع کی روشنی ہر ایک طرف یکساں پڑتی ہے اسی طرح درخت بڑھتا ہے تو ہر ایک طرف ایک خاص مناسبت سے ایک جیسا پھیلتا ہے، ہر ایک جگہ یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اپنے وجود کی حفاظت کر رہا ہے۔

خواہ در باغ خواہ در بیشہ سوئے آتش نمی رود ریشہ
خواہ باغ میں ہو یا جنگل میں ریشہ درخت آگ کی طرف نہیں جائیگا۔
آگ اور لکڑی میں بیر ہے، اس لئے وہ اپنے دشمن جان کو خوب جانتا ہے اور اس سے دور ہی رہتا ہے۔

یک ہر جاست آب تل اوست بیقرار تلاش حاصل اوست
لیکن وہ کسی جگہ سو پانی اس کی طرف مائل ہوتا ہے، بغیر جدوجہد تلاش وہ لے خود بخود حاصل کر لیتا ہے، پانی نباتات کی زندگی ہے اس لئے وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ میرا مایہ حیات ہے۔

اتراز در جوع آتش و آب نیست بے دانش خطا و صواب
اس کا آگ سے بچنا اور پانی کی طرف رجوع کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اسے خطا و صواب کا شعور ہے، وہ جانتا ہے کہ آگ کی طرف جانا خطا ہے اور پانی کی طرف رجوع کرنا صحیح ہے۔

قدرت و اختیار فطرت شل ظاہر است از تمیز سود و زیان

نباتات کی طاقت اور اختیار اسی سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے نفع و ضرر، نقصان اور فائدہ میں تمیز کرتی ہے اور نفع کی خواہش اور ضرر رساں اشیاء سے بچتی ہے۔

بار و رنخل ہا بعلم تر اند کہ ز تنبیہ قابل اثر اند
ذی خرد را بفہم دور اندیش ہر قدر علم بیش عبرت بیش
نخل ہا کایں سبق شناختہ اند از نباتات بیش تافہ اند
جس طرح عالم انسانی میں بھی علم و شعور کے درجات ہیں بعض جاہل اور بعض عالم اور جہات و علم کے بھی مراتب ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں۔ تربیت سے یہی بعض درخت پھل عمدہ اور زیادہ دیتے ہیں۔ اور ان پر تنبیہ و زجر و توبیخ اور بدنی سزا کا بھی اثر ہوتا ہے۔ بیدل اس کی مثالیں پیش کرتا ہے کہ اگر کوئی درخت پھل نہ دے یا کم دے تو اس درخت کے پاس آکر کہو کہ اگر تو نے اب کے موسم میں خاطر خواہ پھل نہ دیا تو تجھے کاٹ دیا جائے گا اور مناسب ہے کہ کلہاڑی کی ایک دو ضربات بھی لگائی جائیں، دوسرا شخص بیچ بچاؤ کرتا ہوا کہے کہ اب در گذر کرو، اس طرح درخت پھل کثرت سے دیگا۔ اگر کسی درخت کے پاس آکر کہو کہ مجھے تیرا پتہ یا چمک فٹاں مرض کے لئے فلاں روز یا ساعت درکار ہے تو اس میں مرض کے ازالہ کی خاصیت پیدا ہو جائے گی۔

زیں مراتب چمن طرازیہات رنگ ہا چیدہ از مزاج نبات
جہات کے چمن آرائی کرنے والے نے نباتات کے مزاج سے طرح طرح کے رنگوں سے ہر طرف ایک آرائش و زیبائش کا سامان فراہم کر رکھا ہے۔

نار و دودے کہ در دل کہسار لعل و یاقوت کردہ بود بخار
برق زدا از مزاج لالہ و نخل جلوہ گر شد ز سبز و سنبل

وہی آگ اور دھواں جو پہاڑوں کے دل سے اُٹھتا ہے اور جس نے محل
یا قوت کی صورت اختیار کی وہ لالہ و گل کے مزاج میں ایک برقی زوہ ہے
جو سبزہ و سنبل کی شکل میں نمودار ہوئی۔ محل و یا قوت طبقہ جمادات کی
چیزیں ہیں ان میں جو بات ہے وہی لالہ و گل میں ہے یہی آگ دونوں طبقوں
میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے، کوئلہ اور نیلا ایک ہی شے ہے
جسے ”کاربن“ کہتے ہیں۔ کوئلہ کو زیادہ حرارت آفتاب پہنچی جل گیا اور
یا قوت کو مناسب حرارت ملی۔ دھواں پیچ و خم کھاتا ہوا پھیلتا ہے اسی
طرح سبزہ و سنبل پھیلتے ہیں۔

نرگستاں بخامہ تقدیر داد پرواز دستگاہ بصیر
نباتات کو جمادات سے ہی مناسبت نہیں بلکہ حیوانات سے بھی
ہے۔ نرگس کی شکل آنکھ کی ہے، خامہ تقدیر نے یہ صورت انسان اور
نرگس میں ایک ہی جیسی کھینچی ہے۔ اسم ”بہیر“ کا ظہور نرگس میں ہوا
ایک رباعی ہے۔

گر بہ تحقیق اس بہارت نظر لیست ہر سبزہ زبان شرح و بسط دگر لیست
در پردہ گوش گل و چشم نرگس آراکش کار گاہ سمیع و بصر لیست

لالہ ہم طرح بنیشے انداخت

چشم واکردہ مرد مک پر داخت

لالہ نے بھی بنیائی کی شکل و صورت کی بنیاد رکھ دی، آنکھ کھولی اور
آنکھ کی پتلی بھی مشاہدہ ہو رہی ہے، لالہ کی صورت آنکھ کی طرح گونہ ہے اور
جیسے آنکھ میں پتلی سیاہ ہوتی ہے ایسا ہی لالہ میں نارنج ہے۔

تا مہیا کند سمیع آغوش پنبہ غنچہ برگرفت از گوش

اسم ”سمیع“ کا تا کہ ظہور ہو اور نباتات کو اپنے ”غوش“ غنچہ کے کان
سے روئی نکال دی، تاکہ وہ ہمہ تن گوش ہو اور جبلت مانع شنوائی ہے دور ہو جائے۔

غنجہ کی صورت بھی گوش و آغوش کی ہے۔

ہر گھلے راکہ فہم چشم انگاشت
صورت گوش نیز در برداشت
شکل و صورت، صحت و امراض و جذبات و احساسات طبقہ نباتات میں
بھی پائے جاتے ہیں۔

تازہ رزم حیا شومی محرم گذر از فہم پنچہ مریم
”پنچہ مریم“ ایک بوٹی ہے جس کو ”لاجوتی“ اور بعض شرم بوٹی کہتے
ہیں، اگر اس کو ہاتھ سے چھوئیں تو فوراً مٹ جاتی ہے، اس کے بعد ہاتھ اٹھالیں
تو اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔ گویا اس بوٹی کو حیا دامن گیر ہے کہ نامحرم
غیر سے اپنے آپ کو چھپاتی ہے۔

کان تعمیر نہال شرم نشان بمہ چشم است و سر سر مرگاہ
اس بوٹی کی پتیوں پر ہلکے ہلکے نرم کانٹے سے ہوتے ہیں جو مرگاہ کی
صورت ہیں، یہ عجیب بوٹی شرم کا مجسمہ ہے۔

گر نظر سولیش افگنی از دور خویش را زرد و کز دستور
اگر اس پر نظر دور سے پڑے تو اپنے آپ کو چھپاتی ہے
برگ برکش سایہ اغیار پتوں مڑہ برنہ تندنا چار
اس کی پتی پتی نامحرم کے سایہ سے حیا کرتی ہے اور مرگاہ کی طرح
نگاہ پر چادر ڈالتی ہے۔

بے گمان معنی بصیرت جاست کہ سراپا ش پردہ دار حیا است
بلاشبہ اسم بصیر کی یہ منظر ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک پردہ دار حیل ہے۔
حاصل الامر جہان نبات علم دارد ہزار رنگ آیات
علم ہی ہے جو نباتات میں مناسب صورت میں کار فرما ہے۔
حکم اسماء دریں تجلی زار داد پیش از جہاد عرض بخار
حقیقت میں یہ اسماء الہیہ کا ظہور ہے جو اس کائنات میں جلوہ فرمایا۔

جمادات سے پہلے ”بخارات“ تھے یا ہوائیں (تھیں، ”علم کیمیا“ کے عالم جانتے ہیں کہ یہی ہوائیں یا ”غاز“ ہی جمادات کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

فسط انقاس بال چند کشاد شوقی رنگے بویروں افتاد
یہ ”غاز“ جب ”فسط“ ہوئیں تو رنگ و بو کی شوقی بھی نباتات میں ظاہر ہوئی، ان ہواؤں کو انگریزی میں ہائی ڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، کاربن کہتے ہیں۔ یہ زندگی کی مدد ہیں، نباتات کی زندگی انہی سے ہے۔
ایں زماں سحری طراز و عشق علم ناز می فراز و عشق
جب اس حقیقت نے جو جمادات سے نباتات میں ارتقائی حالتیں ظاہر ہوئی تو ”عشق“ نے جادو پھونکا، اور اپنا جھنڈا بلند کیا۔

گر می سعی آن بخارا کنوں خوان بہ رشدم، معود فصول
بخارات تو بلند ہوتے ہیں ان میں جو زیارت ان کی حرکت طبعی نے پیدا کی تھی اتنی بڑھی کہ شعلہ کی صورت میں نمودار ہوئی، چمک دمک کے بعد سرد پڑ گیا اور پستی کی طرف مائل ہوا۔

خامہ فطرت یقین تقریر نرد روح با تیش تحریر
خامہ فطرت نے جو نقش بھی کھینچ رکھا ہے وہ یقینی تقریر ہے۔ اس کا نام ”روح نبات“ لکھ دیا۔

ہر طرف شکل ہا معائنہ شد دست و پا و بجای آئینہ شد
طبقہ نباتات میں ہر طرف شکلیں نظر آئے لگیں۔ ہاتھ اور پاؤں اور دیگر اعضاء بھی صاف صاف دکھائی دینے لگے طبقہ نباتات میں دست و پا و جوارح نہیں ہیں۔ ان اعضاء کا کچھ فطری کام بھی ہے، نباتات میں یہی کام یہ کرتے ہیں۔

نخل قامت باقتدار کشید شلخ ہا دست برہو با بازید

درخت سیدھے کھڑے ہو گئے اور ایک وقار کے ساتھ سراونچا کیا، شانوں نے ہوا میں اپنا ہاتھ بڑھایا۔

صورت دست و پا چشم و زباں ہمہ زیں جلوہ سر کشید عیاں
ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان کی صورتیں اس میں جلوہ نما ہوئیں۔
لیکن تصویر کامل اس جا نیست جز ہیولی از شخص پیدا نیست
لیکن یہ صورتیں اور شکلیں ایسی کامل نہیں ہیں جیسی کہ حیوانات میں مشاہدہ
ہوتی ہیں، اس طبقہ نباتات میں ابھی تک ”ہیولی“ نے وہ صورت پیدا نہ کی جو
طبقہ حیوانات میں ہے۔

جوف پیدا نشد دریں اعضا تا نماید تصرفات ہوا
اس کے اعضا میں جوف پیدا نہ ہوا تاکہ ہوا کی جگہ بھل آئے اور اس کے
تصرف سے وہ کیفیت پیدا ہو جو طبقہ حیوانات کے جسم اور ہڈیوں وغیرہ
میں ہے۔

ہرچہ زیں صورت و شہا مل است

باد و دست و پائے در گل است

ان صورتوں اور شکلوں میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ”باد و دست“ ہوا تو ہاتھ میں اور پاؤں کچھڑ میں، ہوا شانوں اور پتوں سے لگ کر گزر جاتی ہے، ”باد و دست“ محاورہ ہے، چونکہ ہاتھ میں ہوا بند نہیں رہ سکتی اس لئے محاورہ میں مراد بے فائدہ کوشش ہے۔ اور ”پادر گل“ کے معنی پابندی، جو آزادی کے منافی ہے، جمادات میں حرکت نہیں مگر نباتات میں ہے اور ہوا و باد و دست، اور پائے در گل کے ساتھ محدود ہے۔

دست خالی چہ ہے بجام کند پائے در گل چہاں خرام کند
ہاتھ خالی شراب کو پیالہ میں کیسے انڈیل سکتا ہے، یعنی اس نشہ سے
محروم ہے جو ہاتھ کی حرکت میں ہے، پابند کس طرح چل پھر سکتا ہے۔

سعی دست تہی دریں گلزار مگر آتش زند بخود چو چنار
اس گلزار میں خالی ہاتھ پاؤں مارنا اپنے آپ میں چنار کی طرح آگ لگانا
ہے چنار اور آگ میں خاص مناسبت ہے، اس درخت کے مزاج میں اتنی
حرارت ہے کہ اگرچہ سرد مالک میں پیدا ہوتا ہے مگر اس پر برف گرتی ہے تو
پانی ہو کر بہہ جاتی ہے۔

از موالید ہرچہ گشت رقم بود مشق عبارت آدم
ان طبقات جمادات و نباتات کا بیان جو ہم نے کیا ہے تو غرض یہ تھی کہ
آدم کی ابتدائی تاریخ لکھی جائے۔

حکمت ایں است آن نقوش خیال

شخص ایں جاست مابقی تمثال

جس طرح آئینہ میں کسی شخصیت کا عکس صورت ہوتا ہے اسی طرح شخصیت
تو آدم ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس آئینہ کائنات میں "تمثال" ہے۔ یعنی اس آئینہ
میں جس ملک انسان کی شخصیت یا وجود ہی کی نظر آتی ہے ان طبقات میں حقیقت
تو صرف وہی ہے جو حقیقت انسانی ہے باقی جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ سب
صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت رونما ہو رہی ہے، اور یہی حقیقت وجود انسانی
میں بدرجہ اتم جلو نما ہوئی۔

برزباں نام آدم آمد در نظر ہر دو عالم آمد
میری زبان پر آدم کا نام آتے ہی دو جہان میری نظروں میں پھر گئے،
جو کچھ ان دونوں جہانوں میں ہے اس کا خلاصہ آدم ہے۔ یا یوں کہو کہ آدم
کے دم سے دو عالم ہیں۔ ان کی پیدائش کا منشا اور حکمت آدم ہے، (لولاک
ما خلقت الافلاک)

نریں کفے خاک زدو عالم پیش اعتدال حقیقی آمد پیش
آدم خاکی میں دو عالم سے بڑھ کر حقیقی اعتدال پایا جاتا ہے۔

ہر کجا اعتدال جلوہ گراست
کف و موج و محیط یک گہراست

جہاں کہیں اعتدال جلوہ نما ہے وہاں کثرت و وحدت میں محو ہو جاتی ہے۔ دریا ہو یا کف ہو یا موج سب اپنی اصل وحدت میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ ”اعتدال“ کی کمی بیشی ہے کہ کثرت کی نمائش ہو رہی ہے، علماء کا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات میں حرارت کی ایک خاص مقدار سرگرم عمل ہے۔ یہ مقدار کم و بیش نہیں ہوتی، لیکن اس کی تقسیم میں کمی بیشی کثرت پیدا کرتی ہے، پانی، برف، بخارات، ہوا مختلف اشیاء ہیں، مگر ان کی اصل حرارت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہو رہی ہے، حرارت کمتر درجہ پر برف اور ذرا زیادہ درجہ پر پانی اور اس سے اور زیادہ ہو تو بخارات اور آخر ہوا کی صورت۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں ”اعتدال“ ہی مشاہدہ ہوتا ہے اگر میزانِ عدل (اس عالمِ اعداد میں توازن قائم نہ رکھتی تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو گیا ہوتا۔ آدمِ خلاصہ موجودات ہے، اس کے وجود میں یہی فطری اعتدال بدرجہ کمال نظر آتا ہے اور اسی عدل کی وجہ سے کہ

جسمِ اصلی ہمیں کفِ خاں است کہ محیط رموزِ افلاک است
جسمِ انسانی تو مٹی بھر مٹی ہی ہے مگر تمام رموزِ حکمت اور کائنات کی پیدائش کے مقصد پر یہی آدمِ خاکی حاوی ہے۔
”عرفان“ میں بیدل لکھتا ہے کہ جب میں نے تحقیق کی تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان است
نہاں در ہر کفِ خاک کے جہاں است

یعنی اصل ہر شے کی "حیات" ہے، مادہ تو محض صورتیں ہیں جن میں یہ حقیقت "حیات" رونما ہو رہی ہے۔ صورتیں متغیر اور تبدیل اور فنا ہوتی رہتی ہیں اور حیات انہی بہتر سے بہتر صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور بہترین صورت انسانی ہے، اس لئے زندگی اسی صورت میں اپنی ممکن ارتقائی حالت میں مشاہدہ ہوتی ہے، اور یہ کہ انسان اگرچہ بظاہر بلحاظ جسم و جسد حقیر معلوم ہوتا ہے مگر کل کائنات اس کے قلب میں سمائی ہوئی ہے۔ مرجع خلق، منبع اشکال مرکز علم و مصدر اعمال تمام کائنات کی پیدائش کا رجوع اسی آدم کی طرف ہے، یہ خود خلاق ہے، تمام شکلوں کا سرچشمہ یہی ہے، اشیاء کی صورتیں اور ان کے تصونات اسی میں محسوس اور متصور ہوتے ہیں۔ علم کا مرکز بھی یہی ہے اور علم کے مناسب اعمال کا صدور بھی اسی سے ہوتا ہے۔

پس ز ترکیب تا جہان بسیط جسم و علم یک آدم است محیط کائنات تو مادی جسم ہے اس میں علم کا فرما ہے، لیکن علم کا مشاہدہ انسان ہی میں ہوتا ہے، علم سے خالی کوئی شے نہیں جیسا کہ ہم مثنوی "طلسم حیرت" کے تحت بیان کر چکے، لیکن انسان مرکز علم ہے، اور اس کا عمل وہ تصرف ہے جو وہ کائنات میں کرتا ہے، بیدل کا ایک شعر ہے۔

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

اے بہار نیستی از قدر خود ہیشیا را باش

مرکب اور مفرد غرض کوئی شے ہو جسم و علم کی تعریف میں ہی آتی ہے اور ان تمام پر انسان محیط ہے، اس شعر میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ آدم کو خلعت خلافت عطا ہوا تو اس لئے کہ "جسم و علم" میں تمام کائنات کی اشیاء اور ہر ایک طبقہ ہستی سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ طاوت بنی اسرائیل میں سب سے چھوٹے قبیلہ "بنیمن" کے سب سے چھوٹے

خاندان کا سب سے چھوٹا فرد تھا، مگر ”جسم و علم“ میں ہر ایک قبیلہ کے ہر ایک خاندان کے افراد سے بڑھ کر تھا۔ اس لئے سموئیل نبی نے اسی کو بادشاہ بنایا اور وجہ بھی بتائی کہ جسم و علم میں سب سے بڑھ کر ہے۔

ثنوی عرفان کے ابیات گیارہ ہزار ہیں۔ ہم نے صرف ایک موضوع پر چند اشعار کا اقتباس کیا ہے، بیدل کا خاص موضوع تو یہی ہے مگر ضمناً وہ بہت کچھ بیان کرتا ہے، بطور نمونہ ہم صرف ان اشعار کو درج کرتے ہیں جو اس محقق بے بدل نے اختلاف عقائد پر لکھے ہیں۔

اے دولت کار خانہ نیرنگ غنچات گل فروش چندیں رنگ
تیرا دل کار خانہ نیرنگ ہے، اس کار خانہ میں تو نت نئی ایجاد کرتا رہتا ہے، تیرا غنچہ دل کتنی رنگینوں کی گل فروش کر رہا ہے، شاعرانہ تخیل اور زبان کی حسن و خوبی ایسی باتیں ہیں جس پر ہم نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو بات اس کے الفاظ اور ان کی بندش اور تشبیہات وغیرہ میں ہے اس کی ترجمانی اگر کی جائے تو شعر کا خون کرنا ہے، بطور نمونہ ہم چند اشعار مناسب مقام پر پیش کریں گے مگر اس کتاب کا اصل مقصد یہ نہیں ہے ہم صرف بیدل کے حکیمانہ تفکر اور تحقیق کی داد دے رہے ہیں۔

ہنچ گل زیں بہار رنگ نہ بست کہ براہ شعور سنگ نہ بست
جو بھی خیال یا تصور دل میں پیدا ہوتا ہے اگرچہ بہار فطرت کا حسین رنگین پھول ہی ہوتا ہے لیکن اس کے حسن اور رنگینی کے مشابہہ میں سنگ اور امور بھی ہیں، کہ پائے شعور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے، غرض ظہور تو یہ ہے کہ ہر ایک شے کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھا جائے یعنی مشاہدہ حق ہو۔

اصل ہر حق و باطل است یکے جاوہ بسیار و منزل است یکے
جیسے ہم حق و باطل سے تعبیر کرتے ہیں ان کی اصل ایک ہی ہے منزل

مقصود تو ایک ہی ہے اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے شمار راستے ہیں، یعنی مذاہب بہت ہیں اور سب کی منزل حق تک پہنچنا ہے۔

ایں ہمہ جاوہ است منزل نیست

لیک رہو تمیز و تباہ نیست

یہ تمام مذاہب راستے ہیں، منزل نہیں ہے۔ غلط فہمی سے لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کو منزل مقصود سمجھ رکھا ہے، اور ان میں اتنا شعور نہیں کہ جاؤ و منزل میں فرق کر سکیں۔

اگر ایں عبرت تناسخ خام در جہان ظہور بودے نام
توم دیگر ہم از وقوع خیال می شد آئینہ دار ایں تمثال
راستہ گزر گاہ ہوتا ہے، لفظ ”عبرت“ نہایت موزوں اور مناسب
واقع ہوا ہے، اگر ”تناسخ“ ہی صحیح ”منزل“ اس جہان ظہور میں ہوتی تو
حقیقت تو بدل نہیں سکتی ہر ایک قوم کا یہی عقیدہ ہوتا کیونکہ ”حق“ ایک
ہی ہے، ہر ایک قوم کے آئینہ عقائد سے یہی صورت تناسخ کی جھلک کھائی
دیتی۔

زیں نہال آنچہ برافراشتہ اند در زیں ہائے ہند کاشتہ اند
اس آواگونی دہرم کے درخت سے جو کچھ خوشہ چینی ممکن ہے اس کے
لیے خاک سیاہ ہند ہی موزوں و مناسب ہے، اگر یہ ہندو تناسخ کے قائل
ہیں، کہ ہر ایک روح ”پورا سی“ بنیں جو گتی ہے۔

از گرو ہے دگر بریں آثار نیست آگاہ خفتہ تا بیدار
لیکن دوسری قوموں کا یہ عقیدہ نہیں، ان قوموں میں خواہ جاہل
ہو یا عالم اس مذہب سے ناواقف ہیں۔

نہ نصاریٰ است زیں مقام آگاہ نہ خیال یہود دارد راہ
مسیحی اس مقام سے یا اس راستہ یا مذہب سے واقف ہی نہیں اور

یہود کا خیال بھی اس راہ کی طرف منتقل نہیں ہوا۔

در مزاج یہود اگر ساریست حکم توراتیک قلم جاریست
ان کے دل و دماغ پر تورات کے احکام چھائے ہوئے ہیں، ان کے
خیالات اور جذبات اور احساسات کا سرچشمہ ان کی ہی مقدس کتاب ہے
جس سے وہ سب کچھ اخذ کرتے ہیں۔

وز نصاریٰ نے نبی شود مشہود جزئیما لے کہ عیسیٰ فرمود
نصاریے کے عقاید میں بھی وہی بات مشاہدہ ہوتی ہے جو ان کے
حضرت عیسیٰ کے ارشاد ارتہ میں۔

ہر یکے لاء درس کامل خویش سبق علم بردیست، بیش
جو کچھ ان کے پیغمبر ارشی منی یعنی کامل انسان نے ان کو درس دیا
اسی سے سبق علم لے کر گیا۔

تہا عقاید حجاب را ندیدہ برہمن کعبہ را بخواب اندید
”ہا العلم حجاب الاکبر“ علم سب سے بڑھ کر حجاب ہے جب عقاید
نے پردہ علم کو بھاڑ کر اس کی تار و پود الگ کر دی تو حالت یہ ہوئی، مگر
اب کوئی برہمن کعبہ کو خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔

تا مسلمان مدارج دیں خواند بے نیاز از خیال کاشی ماند
مسلمانوں نے جب اپنے دین کے مدارج ذہن نشین کئے تو ”کاشی“ کا
خیال تک ان کے دل میں نہیں آتا، ”کاشی“ ہندوؤں کا مقدس تیرتھ ہے
جیسا مسلمانوں کا کعبہ۔

قصص انبیائی فرقائی بیدیاں راست محض نادانی
قرآن میں انبیاء کے قصے مذکور ہیں جس سے ویدوں کے ماننے والے
محض جاہل ہیں۔

حالت دیوتائی شاستری مسلمین را گواہ بخبری

اسی طرح شاستروں میں جو دیوی اور دیوتاؤں کے افسانے ہیں مسلمان اس سے بے خبر ہیں۔

زریں حقیقت بزمِ اسلام نرسانید پیکِ علمِ پیام
قامدِ علم جو اللہ کا پیغام لے کر آیا یعنی آلِ حضرت نے مسلمانوں کو
ان مذاہب مختلفہ کا پیام دیا۔

نسخِ درُامتِ محمدنیست بزمِ مقبول جائے مرتدنیست
عقیدہ تناسخِ امتِ محمدیہ میں نہیں ہے مقبول بارگاہِ الہی کی بزم
میں کسی مُرتد کو اجازت نہیں کہ داخل ہو۔

بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ ”علم“ اور شے ہے اور ”عقیدہ“ اور
چیز ہے۔

بیچ گل زریں بہارِ رنگ نہ بست
گرہِ براہِ شعور سنگ نہ بست

علم کا سنگِ راہ عقیدہ ہے۔ عقیدہ لفظ ”عقد“ سے مشتق ہے،
قوتِ فکر یہ کہ یہی شے جکڑ بند میں رکھتی ہے، اور اسی کا کرشمہ ہے کہ اچھے
بھلے انسان کو جاہل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہزار علمی شواہد اور دلائل عقلیہ
پیش کرو مگر جس عقیدہ کی زنجیروں میں اہلِ مذاہب جکڑے ہوئے ہیں اجازت
نہیں دیتا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں، یہی حقیقت قرآن کی اس
آیت میں واضح کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَالْمَنَافِعُ لِلَّهِ وَالْخَسَارُ لِلْكَافِرِينَ
الطَّبِيعَاتِ وَيَحْصِرُهُمْ عَلَيْهِمُ الْغَبَاثَةُ وَيُضَعِّفُهُمْ أَمْرُهُمْ
وَالْأَغْلَالُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۹: ۹)

لوگوں نے وہ اشیاء جو فطرتاً پاکیزہ ہیں عقائد کے تحت حرام بنا رکھی
ہیں۔ اور اھروہنی یعنی قوانین بھی ایسے وضع کر رکھے ہیں جن میں یہی عقائد

کار فرما ہیں۔ یہ پیغمبر طہیات کو حلال اور نجاست کو حرام قرار دیتا ہے اور جن رسوم کے طوق ان کی گردنوں کا ہا رہیں اور جس رولج کی زنجیروں کے بوجھ کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں، یہ رسول توڑ پھوڑ کر ان کو بسکدوش کرتا ہے۔ عموماً بحث مباحثہ میں لوگ اپنے اپنے عقائد کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، گویا یہ حقیقت ثابتہ ہیں، غرض عقیدہ نہایت مکروہ شے ہے۔

کانِ وفا جو ہر کرم بنیاد

ہمہ را وعدہ قیامت داد

وہ وفا جو ہر اور کرم بنیاد یعنی آنحضرت نے مسلمانوں کو ان کے اعمال کی سزا و جزا اور مغفرت کا وعدہ بروز قیامت دیا۔

بر مسلمان نہ فکر دور اندیش

اگر آید قیامت آید پیش

مسلمانوں کے ذہن میں بھی قیامت کا نقش اتنا گہرا ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے ظہور میں آتا ہے ان کی فکر دور اندیش اس میں قیامت کا جلوہ ہی دیکھتی ہے۔

مومنوں را ظہور این آیات نبود جز بموقف عرفات

ہر ایک مسلمان کا اس پر ایمان ہے کہ سزا و جزا عرصہ قیامت ہی میں ملے گی۔

گر مکافاتے از عمل بینند خویش را ہم در آن محل بینند

اگر اسی دنیا میں اپنے اعمال ناشائستہ کی سزا انھیں ملتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت قائم ہے اور ہم اللہ کے حضور اعمال کے جوابدہ ہیں۔

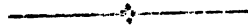
علم مارا بحکم رحمت فسرود مبتلائے خیال وہم نہ کرد

رحمۃ اللعالمین کے ارشاد کے مطابق جو علم ہمیں حاصل ہوا ہے،

اس نے ہمیں توہمات کی بھول بھلیوں سے بچا لیا۔

بیدل

اہل اسلام از ہر کجا زادند
 زیں خیالات فارغ افتادند
 مسلمانوں کی قومیت خواہ کچھ ہو خواہ کسی ملک میں رہائش ہو انکی
 جنم بھومی خواہ کہیں ہو ان تو ہمت سے بے نیاز ہیں۔
 بیدل نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اور تنازعہ کی چند
 مثالیں بھی بیان کی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عقیدہ جب قوی ہو
 اور ہزار یا سال سے بچتہ ہو چکا ہو تو وہ "وراثت" میں منتقل ہوتا رہتا
 ہے، اور اہل عقیدہ جیتی جاگتی دنیا میں وہی کچھ مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے
 عقیدہ کے مناسب تائیدی شہادت ہوتی ہے۔ "وراثت" ایک مستقل
 موضوع ہے۔ اس پر بحث کی گنجائش اس مقام پر نہیں۔



طلمسم حیرت

مثنوی عرفان اور طلمسم حیرت اور طور معرفت میں بیدل کا شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر جمع ہے۔ یہ بیدل کے شاہکار ہیں، طلمسم حیرت میں اس مادی کائنات کا مذکور ہے اور اس عالم اجسام میں سے خلاصہ موجودات ”انسان“ کے وجود پر بحث کی گئی ہے، ”سلطان حقیقت“ ایک بادشاہ ہے اس کی تعریف یہ ہے۔

کہ در ملک تقدس بود شاہ ہے معلیٰ مسند عزت کلاہ ہے
کہ ملک تقدس ”میں ایک بادشاہ تھا، اس کا تخت عالی اور
تاج عزت نکلاہ تھی۔

”وجوب آباد“ بیرنگی حصارش ”تعیین ما“ سپاہ بیشمارش
”وجوب آباد“ اس کے ملک مقدس کا صدر مقام تھا اور ”تعیینات“
اس کی بے شمار سپاہ تھی۔

ز تختش سطح نہ گردوں نشستے دو عالم از کلاہ او شکستے
اس کے تخت کی سطح پر نو آسمان پست تھے اور عالم (دنیا و آخرت)
اس کے تاج کی زیبائش کے آگے ماندہ تھے۔

یہ شہنشاہ اپنے دارالملک ”تنزیہ“ میں ”اقلیم تشبیہ“ پر فرمانروائی

کر رہا تھا۔

بدن را مقدس تشریف جاں داد
زمین را اعتبار آسماں داد
اس اقلیم میں تشریف فرما ہوا تو ”بدن“ کو اس کے قدوم میں منت لزوم
نے جاں افزائی بخشی، زمین کو آسمان کی عزت نصیب ہوئی ”بدن“ میں سنے
تین قلعے دیکھے جو پسند فرمائے، اول ”دماغ“

حصارے دید چوں اندیشہ عالی چو بہت متطر صاحب کمالی
یہ قلعہ خیال کی طرح بلند پرواز اور بہت کی طرح کمال کا منظر تھا۔
بدہ منزل سواد او مزین بہر یک منزل استاد می محین
عمارت دس منزلہ تھی اور ہر ایک منزل پر ایک ایک پہرہ دار تھا۔
ان کے نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) سامعہ (۲) باصرہ (۳) شامہ (۴) ذائقہ (۵) لامسہ (۶)
حس مشترک (۷) خیال (۸) فکر (۹) وہم (۱۰) حافظہ۔

ان حواس ظاہری اور قویٰ باطنی کی تعریف کرتے ہوئے بیدل
نے اپنے شاعرانہ تخیل کو بلند تر مقام پر پہنچایا جہاں آج تک کسی شاعر کی رسائی
نہیں ہوئی۔ بطور نمونہ ہم صرف (۹) ”وہم“ کا آگے چل کر ذکر کریں گے، اس قلعہ
کو دیکھتا ہوا سلطان ”حقیقت“

ازاں منزل عنان شوق گرداند حقیقت جانب حصن جگر لاند
”دماغ“ سے گزرتا ہوا جگر کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی، اس جگہ
بھی آٹھ پہرہ دار دیکھے :-

(۱) غاذیہ (۲) تابیہ (۳) مولدہ (۴) مصور (۵) جاذبہ (۶) مست (۷)
ہاضمہ (۸) دافعہ۔

جگر سے ”دل“ کے قلعہ کی طرف نہ بھٹ فرما ہوا، اس میں چھ پہرہ دار

اس کے آستانہ پر کھڑے دیکھے۔

(۱) امید (۲) خوف (۳) محبت (۴) عداوت (۵) فرح (۶) غم۔
یہ سب کچھ دیکھتا گیا سلطان حقیقت ان ممالک میں سے ایسا مقام انتخاب کرنا چاہتا تھا جہاں آرام فرمائے۔

چو سلطان حقیقت زیرِ مسالک نمود آہنگ تفتیش ممالک
مقائے زیرِ مقامات مجازی ندید آرام گاہ بے نیازی
ان میں سے سوائے ایک دل کے کوئی پسند نہ آیا۔

مگر معمورہ بیرنگی دل کہ جاں آنجا تواند کرد منزل
یہ بستی جو دراصل بوجہ بیرنگی اُجڑی ہوئی تھی اور جس میں ”جان“ (نفس انسانی) مقیم تھی پسند فرمائی کہ چھ پہرہ داروں سے دل کا حال دریافت کیا۔ تو خوف و عداوت و غم نے مخالف رائے دی کہ دل ایسی جگہ نہیں کہ وہاں شہنشاہ آرام فرمائے۔ محبت نے کہا کہ

محبت گفتش اے شاہ دل آرا بدل جاکن بدل جاکن بدل جا
بادشاہ نے یہ رائے پسند فرمائی۔ اور

بحکم مصلحت تہدید سرکرد
ازیں شہر آں سہ مفسد را بدر کرد

سیاست کا تقاضا تھا کہ بادشاہ نے اس شہر دل سے ان مفسدوں خوف و عداوت و غم کو بدر کر دیا۔

اس کے بعد ”بدن“ کے چار حکام (۱) خون (۲) صفرا (۳) سودا (۴) بلغم کو خلعت عنایت فرمایا۔

”کرامت شد بخون تشریف گلگلوں“ خون کو سُرخ لباس پہنایا، ”قبائے زعفری صفرا ببرد کرد“ صفرا کو زعفرانی پوشاک عنایت ہوئی جس کے دامن میں نرگستان پیچیدہ تھا۔ ”لباس عنبریں شد وقف سودا“ عنبریں لباس سودا کے

بیدل

حصہ میں آیا۔ سرپا سرہ چشم تماشا، یہ بلغم خلعت برگ سمن داد، بلغم کو سمن کا خلعت ملا۔ لیکن ان حکام میں آخر کار نہ بنی، ہر ایک غلبہ کا خواہاں تھا، ان میں مفسدوں خوف و عداوت و غم کی بن آئی۔ یہ قصہ طویل ہے اور ہر ایک انسان کی آب بیتی ہے۔

بیدل کا نظریہ وجود یہ ہے کہ

عالم ہمہ یک جلوہ ذات اعدا است این جانہ ہیولیٰ نہ صورت جسد است
کثرت آثار چشم واکردن ماست این صفر جو محو شد ہاں یک عدا است
آنکھ کی صورت بھی صفر کی ہے، اس لئے جب ٹھلی ہو تو ایک عدد پر صفر

کا اضافہ کرتی جاتی ہے۔ اس طرح ایک سے دس اور دس سے سو اور سو سے ہزار تالا انتہا، حقیقت وجود واحد ہے۔ لیکن یہ ”چشم واکردن“ کا کرشمہ ہے کہ ہم کثرت مشاہدہ کرتے ہیں اب آنکھ بند کر لو، آخر ایک دن خود بخود بند ہو جائے گی تو یہ صفر بھی محو ہو جائیں گے اور وہی ایک باقی رہ جائے گا۔ (تمام اشیاء یعنی کثرت فنا ہونے والی ہے باقی صرف تیرے پروردگار ذوالجلال والاکرام کی ذات ہے) بیدل ”عقل“ پر بحث کرتے ہوئے ”وہم“ کی نسبت لکھتا ہے کہ عقل تو اشیاء کی صورتوں اور حقائق جیسے کہ ہیں مشاہدہ کرنی ہے، لیکن ”وہم“ محال اندیش ہے۔

دبستاں کمالات محالی خطش بطلاں احکام خیالی

خیالے را کہ در خاطر در آورد محالے کرد و از جیش بر آورد

خیال یا نقش محسوسات خارجہ کا ہمارے قلب پر ثبت ہوتا ہے، اگر وہ ہو اور من و عن اشیاء خارجی اور ہمارے ذہنی تصور میں مطابقت ہے تو یہ ”حق“ ہے۔ جس کی تصدیق عقلاً اور بدایتاً ہوتی ہے۔ مگر قوت ”واہمہ“ کا یہ کام ہے کہ اسے باطل بنا کر چھوڑتی ہے جو صحیح خیال کے احکام و آثار ہیں ان پر خط باطل کھینچ دیتی ہے۔

زمرہ گان نشر آزار فہمی زگیسو پچ و تاب مار فہمی

طنین پیشہ ونا خوردہ برگوش خروش طبل و رعدش بردہ از ہوش
 غبارے گربہ پیش چشم بالید گمانش چوں صدا بر کوہ پیچید
 فرورفتی ز طبع وحشت اندیش بحام اژدر از خمیازہ خویش

اکثر شعرا کے کلام میں یہی قوت ”واہمہ“ کا رہا ہوتی ہے۔ کسی محبوب کی مرثاں کو نشتر آزار سے تشبیہ دیتے ہیں اور گیسو کو سانپ سے کہ پیچ و خم کھا رہا ہے۔ حالانکہ مرثاں اور گیسو کو نشتر اور مار سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اہم حیرے میں ہم رسی کو سانپ تصور کرتے ہوئے ڈر جاتے ہیں، ارشاد قرآن ہے کہ شعرا کا اتباع گمراہی ہے جو ہر ایک وادی میں سرگردان رہتے ہیں۔ قرآن کی نسبت کفار کہتے ہیں کہ یہ شعر و شاعری ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہم نے اس حضرت کو شاعری نہیں سکھائی۔ کچھ عقل و فکر سے کام لو۔ یعنی جو حکیمانہ ارشادات میں شعرا کے کلام سے بالکل مختلف ہیں اگر کسی مجھ کی بھننا اسٹ سمع نوازی کرتی ہے تو کان پر کاٹنے سے پیشتر ہی حواس باختہ ہو جاتے ہیں گویا نقارہ رعد کے شور و غل سے کان کے پردے پھٹ گئے، اگر آنکھوں کے سامنے غبار اٹھے تو گمان یہ ہوتا ہے کہ پہاڑیں آوازیں گونج رہی ہیں، اگر انگڑائی لی تو یہ وہم ہوا کہ اژدھا کے منہ میں آ رہے۔

ہمانا چشم او صفر رستم بود

کہ ہر نقشے ازودہ بر یک افروہ

وہم کوئی نیا خیال تو پیدا نہیں کر سکتا، صحیح خیال کی ترتیب یا اس فطری تعلق کو جو اشیاء میں ہے بدلتا ہے، اسی وہم کا کرشمہ ہے کہ انسان اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔

حقیقت وجود واحدہ ہے اور حق ہے مگر واہمہ نقش وحدت کو کثرت دکھا رہا ہے۔

بیدل اب تفصیلی بحث کرتا ہے کہ ”واہمہ“ کو قوت حافظہ سے مدد کیسے

ملتی ہے، ”حافظہ“ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

صفائی طینت اور لوح محفوظ کرد نقش دو عالم بود ملحوظ

حافظہ ”لوح محفوظ“ ہے کہ اس پر دو عالم کے نقوش مشاہدہ ہو رہے ہیں،

یہ شعر اعلیٰ حکیمانہ تفکر کا نتیجہ ہے، اور ہر ایک زمانہ کے حکماء مشرق و مغرب کا یہی

موضوع رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات خارجی میں اشیاء ایک تو صورتوں

کا مشاہدہ ہے جو ”محسوسات“ ہیں اور دوسرے حقائق کا جو ان صورتوں میں

رو نما ہوتے ہیں، اور یہ ”معقولات“ ہیں۔ صورتیں خارج میں ہر آن بدلتی

رہتی ہیں اس موضوع پر ہم ”تجدد امثال“ کے تحت بحث کریں گے، لیکن صورتیں

ہوں یا حقائق قلب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، اور خود انسان بھی

انہیں محو نہیں کر سکتا، یہ خیالات () یا نقوش ہم بالا ارادہ اور بلا ارادہ،

شعور یا بلا شعور اخذ کرتے ہیں۔ ہم صرف چاند کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ

اس ماحول کو بھی دیکھتے ہیں جس میں چاند واقع ہے۔ ہم ایک درخت کی شاخوں

اور اس کے پتوں کو شمار نہیں کرتے مگر درخت اس کی شاخیں اور پتے بلکہ تمام

باغ اور اس کی روشیں بلکہ زمین و آسمان سب کچھ ایک نظر میں دیکھ چکے ہیں

اور یہ ہمارے قلب میں محفوظ ہو گیا۔ خواب میں ہم سب کچھ دیکھیں گے، اور

بالا ارادہ و شعور بیداری میں دیکھتے ہیں۔ قوتِ حافظہ کا کام یہ ہے کہ ان نقوش

کو جب ہم چاہیں بیداری میں ہمارے دیدہ تصور کے سامنے لاتی ہے اس کو

اصطلاح میں ”تذکر“ کہتے ہیں۔ یعنی کسی نقش یا واقعہ کی یاد۔

ویسکن در دستان مراتب منقش لوحش از ملک دو کاتب

دو ہم نقش تصویر خیالی ہم از دہمش اثر ہائے محالی

اس لوح محفوظ پر دو کاتب جن کو ”کرام کاتبین“ کہنا چاہئے حروف یا

نقوش لکھتے ہیں یا یہ کہو کہ ہمارے نامہ اعمال پر سیاہ و سپید، نیک و بد جو کچھ

ہم کسب کرتے ہیں، لکھتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہی صحیح خیال یا نقش ہے جسے

نیکی سے تعبیر کرنا چاہئے اور یہ عقل ہے، دوسرا ”واہمہ“ ہے جو صحیح تصویر خیال میں اثر محال کی رنگینی پیدا کرتا ہے۔

محال کا تصور انسان نہیں کر سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ جو بھی انسان کے ذہن میں خیال پیدا ہو ”محال“ نہیں۔ مناسب اسباب کے ساتھ ”ممکن“ ہے۔ واہمہ ضرور بظاہر محال اندیش ہے، مگر ممکنات کے تصورات ہی سے محال اندیشی کرتا ہے۔ اس کی مثال قرونِ اولیٰ کے مذاہب میں ملتی ہے اور ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے افسانوں (میں اس کا مذکور

ہے۔ کسی شکل کے چار ہاتھ، اور کسی خرغز کے دس سر، بیل کا جسد اس کو پر لگے ہوئے ہیں۔ شیر کا چہرہ، بیل کے سم اور علیٰ ہذا القیاس یہ اشیاء خارج میں تو فطرتاً موجود نہیں لیکن انسان نے ممکنات کے توڑ جوڑ یا ترتیب بدلنے سے ایک نئی شکل پیدا کی اور پھر خارجی اسباب سے مورتیاں بھی گھڑ لیں، حقیقت یہ ہے کہ قوتِ واہمہ بڑے کام کی چیز ہے، محال اندیش ضرور ہے مگر جب عقل کے سامنے پیش کرتی ہے تو وہ اس کو ممکن صورت میں ڈھالتی ہے، تمام اختراعات اور ایجادات میں عقل واہمہ کی نمون ہے۔ ”بے مصلحتی نیست ظہور شیطان“

زہر رنگے تو ہم ساز صد کہنگ محال اندیش چوں کیفیت بنگ
رنگ ایک ہو تو واہمہ اس کو سونگوں میں دکھاتا ہے، جس طرح بھنگ کے نشہ میں انسان زمین پر رہتے ہوئے فلک کی سیر کرتا ہے یہی کیفیت واہمہ قلب میں پیدا کرتا ہے، اسی طرح

ہمانا چشم او اصف رستم بود
کہ ہر نقشے از وہ بربک افزود

یعنی کثرت جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں چشمِ وہم سے کرتے ہیں فی الحقیقت یہ وحدت ہی ہے جو کثرت کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

جسے ”علم“ کہتے ہیں وہ اشیاء ہی کی معرفت ہے اور اس تعلق کا جاننا

جس سے اشیاء آپس میں مربوط ہیں۔ اشیاء میں تو کثرت مشاہدہ ہوتی ہے اور اختلاف اور کثرت لازم ملزوم ہیں، بلکہ ان میں تخالف تضاد کی حد تک ہے۔ اس میں ربط ”وحدت“ ہی ہو سکتی ہے، ہمیں کسی شے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو نقطہ وحدت پر نہ لائیں۔

کثرت کا مشاہدہ تو ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ ”وحدت“ کا مشاہدہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے دو طریق ہیں، ایک استدلال عقلیہ سے اور دوسرے بیدار ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ بدیہی امور میں کوئی الجھن کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا، ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ استدلال عقلیہ میں غلطی کا احتمال ہی نہیں بلکہ واجب ہے کہ انسان عقلاً غلطی کرے، کیونکہ اسی پر اس کا ذہنی ارتقا منحصر ہے۔ طبقہ حیوانات ماسویٰ انسان غلطی نہیں کرتا مگر ترقی بھی نہیں کرتا استدلال عقلیہ میں چند امور بنیادی ہیں، ”عینیت“ یعنی دو اشیاء کا مختلف زمان و مکان میں ہر ایک تفصیل میں بعینہ ایک جیسا ہونا، مماثلت اور مشابہت اور تخالف اور تضاد بہ تعلق زمان و مکان مثلاً دور و نزدیک اور تہ و بالا اور پس و پیش اور علیٰ ہذا القیاس اور علت وغیرہ، ان قوانین تحقیق کے تحت کسی شے کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نامعلوم معلوم ہوتا ہے، یہ طریق استدلال اصطلاح میں تذکر و عبرت و تدبیر و فکر سے موسوم ہے ”عقل“ ایسے امور میں جو ابعد اسبغیہ سے تعبیر نہیں ہوتے اور خواہ بدیہی ہوں مدد کرتی ہے، ان امور میں اس کی تصدیق واجب ہے۔

طور معرفت

یونیورسٹی لائبریری لاہور میں قلمی نسخہ ثنوی محیط اعظم اور طور معرفت کا موجود ہے۔ یہ نسخہ اسدائندہاں غالب کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اور اس پر غالب مرحوم کی مہر ثبت ہے۔ غالب نے دونوں ثنویوں کی تعریف میں ایک ایک شعر اپنا اس نسخہ پر لکھا ہے۔ مہر پر ۱۲۳۱ھ ثبت ہے۔

ازیں صحیفہ بنوئے تہو معرفت است

کہ ذرہ ذرہ چراغاں طور معرفت است

مرجباے را کہ موجب گل کند جام جم است

آہیواں آجھوئے از محیط اعظم است

اس سے بڑھ کر بیدل کے کلام کی تعریف و توصیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ غالب سا بلند پایہ شاعر مداح ہے۔

طور معرفت میں بیدل نے مظاہر فطرت، قوس و قزح و شفق و کہسار و کوہ و ابرو وغیرہ پر دیکھ کر کہا ہے کہ قلم توڑ دیا؟ اس کے بعد اور کوئی کیا لکھے گا۔ اس ثنوی اور ثنوی طلسم حیرت کے ابیات چھ چھ ہزار ہیں۔ مگر مکمل اب و متیاب نہیں ہوتی۔ ہم طور معرفت سے چند ابیات دربارہ قوس و قزح اور جباب کا

انتخاب کرتے ہیں۔

زموں سبزہ و گل رنگ ہاجست
شفق تابے زد و قوس و قزح بست
گھاس اور پھول کی سبز اور سرخ رنگینی ابھری، اس سے شفق نمودار
ہوئی اور قوس و قزح بنی۔

گرا ز وصف قزح گیرد بیاں رنگ
ببالد از زمیں تا آسماں رنگ
اگر قزح کی تعریف میں بیان کسی رنگ میں کیا جائے تو زمین سے
آسماں تک رنگینی ہی چھا جائے گی۔

رگ ابر بہارستانِ نیرنگ طلسم ریشہ فردوس در چنگ
قوس و قزح کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابر بہار کی رگوں سے رنگینی
برس رہی ہے یا باغ فردوس نے جو طلسم باندھ رکھا ہے وہ اس کے قبضہ تصرف
میں ہے۔

پر طاؤس صرف رشتہ دام خیال لعلِ نوحہ برب جام
مور کے پروں کی رنگینی اور نقش و نگار کی تحسین تو لوگ کیا کرتے ہیں،
یہ سمجھو کہ قوس و قزح نے جال پھیلا رکھا ہے جس کے تاروں میں مور کے
پروں کے رہ گئے یا جام کے لب پر لعلِ نوحہ کا تصور کرو، یعنی ایک حسین کے
سرخ لب جس پر سبزہ کا آغاز ہو جام کے لب سے ملے ہوئے ہیں جس میں بادہ
ارغوانی کا بھی ایک رنگ ہے، یہ سب رنگینیاں مل کر قوس و قزح بنی۔

کشتیدہ خامہ نقاشِ فطرت خطوط امتحاں رنگِ قدرت
نقاشِ فطرت کے خامہ نے قدرت کی رنگینوں کو امتحانِ خطوں میں
کھینچا کہ معلوم ہو کس درجہ پر ہیں۔
اگر یعنی بسوئے مرکزِ خاک نزولِ قطرہ ہزار اوجِ افلاک

خدا تک بے خطائی میں کمان است کتنا آماجگاہ دل روان است
اگر تو یہ نظارہ دیکھ رہا ہے کہ آسمان کی بلندی سے قطرے مرکز خاک کی
طرف گر رہے ہیں تو یہ تصور کر کہ تیر ہیں جن کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ اور اسی
”دھنک“ سے یہ تیر پرواز کرتے ہوئے دل کے ہدف پر بیٹھتے ہیں۔
چند اشعار ابر، شفق اور جناب پر ملاحظہ ہوں۔

چہ ابر آئینہ ناز گل و مل بہار صد شبستان زلف و کاکل
ابر کیا ہے؟ گل و مل کی لطافت و نزاکت کا آئینہ دار ہے زلف و کاکل
کی سوشبستان کی بہار ہے، بہار کے موسم میں پھول کھلتے ہیں اور بہار ہو اور
ابر ہو تو دور شراب کا لطف اور زیادہ ہوتا ہے۔ گھنگھو گھٹا کی زلف و کاکل سے
تشبیہ نہایت موزوں ہے۔

ولے زلفے کہ در یک جنبش باد ہزاراں دل تواند کرد ایجاد
زلف بھی وہ کہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے لہرائے تو ہزاروں دل گرفتار
ہو کر رہ جائیں۔

جنوں پیما بہ چشمے گریہ آہنگ
سیہ مستے شکستہ شیشہ در چنگ

ایک عالم وحشت میں جا رہا ہے اور آنکھ رونے پر آمادہ ہے، بدست
ایسا کہ ٹوٹا ہوا شیشہ پنجہ میں ہے۔ یہ تو الفاظ ہیں ان سے جو کیفیت ذہن میں آتی
ہے وہ کچھ اور ہے ”سیہ مست“ انتہائی بدست کو کہتے ہیں، ابر سیاہ کے ہاتھ
میں شیشہ سے تو ہے مگر ٹوٹا ہوا، سیہ مستی کا یہ کرشمہ ہے، شیشہ ٹوٹا تو بادہ گر کر
زمین پر آ رہا۔ اس پر اس جنوں زدہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

سپہرے ریزش سیارہ خرمن شبستان چراغاں زیر دامن
آسمان کی طرح چھایا ہوا ہے اس کے خرمن میں سیاروں کے دانوں کا
انبار ہے مگر وہ اب چپکتے نظر نہیں آتے، ابر نے ان آسمانی چراغوں کو اپنے

دامن کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔

چومڑگان ہجوم اشک بستہ قدح در دست وینائی شکستہ
مڑگان سیاہ کی طرح جس پر آنسوؤں کا ہجوم ہو، قدح ہاتھ میں اور
صریحی ٹوٹی ہوئی۔

ہماں دیوانہ ژر ویدہ مؤہست

کہ با سودائی خویش ہائی مؤہست

وہی دیوانہ ہے کہ بال ژر ویدہ (جٹا دھاری) اپنی وحشت میں ہا دہو میں

مست ہے۔

گہے از برق بر آفاق خند گہے برخاک سیل گریہ بند
کبھی تو آفاق پر بجلیاں گراتا ہے ساتھ ہی رعد کی گرج سے تہقہ بھی
لگاتے کبھی زمین پر آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا ہے۔

بتیغ کوہ گاہے سینہ مالد گہے گیر درہ دشت و بنالد
”بتیغ کوہ“ پہاڑ کے پہلو کو کہتے ہیں، کبھی پہاڑ کے پہلوؤں سے سینہ
رگڑتا ہے اور کبھی جنگل کا راستہ لیتا ہے اور روتا ہے یعنی برستا ہے۔

نگویم ابر مستے نشہ فیلے بگردوں موج زن دریائی نیلے
وے فیلے کہ تابو شید میلش بہ پیچہ کوہ را خرطوم میلش
میں یہ نہیں کہتا کہ ابر نشہ میں مست ہاتھی ہے آسمان پر ایک دریائیل
طغیانی میں ہے مگر ہاتھی وہ کہ جب جوش میں آتا ہے تو اس کی سونڈھ پہاڑ
کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔

بہر جائیکہ شبنم رشحه کارد مزاج عالم از خشکی بر آرد
جہاں کہیں تھوڑی سی اوس کا ترشح بھی ہوتا ہے، عالم کی طبیعت سے
خشکی دور کر دیتا ہے، شفق کے متعلق چار شعر ملاحظہ ہوں۔
چہ گویم زین شفق ہائی جہاں تاب کہ آتش ہم نمی باشد بایں آب

شفق ایک تو طلوع صبح کے بعد اور ایک غروب آفتاب کے وقت اُفق پر ظاہر ہوتی ہے، ان کی نسبت کیا کہا جائے آگ میں بھی وہ آب یعنی چمک مک نہیں۔

دو عالم رنگ رنگ شعلہ دود ہوا صل کر دو برگردولش اندود
عالم صبح و شام شفق کے رنگ میں رنگیں مگر رنگ دھواں جو شعلہ ہے
جسے ہوانے حل کر کے آسمان کے چہرہ پر غازہ کر دیا ہے۔
دے کایں شعلہ نیزنگ فروخت جہاں در نالہ آمد کا سماں سوخت
جس وقت یہ شعلہ نیزنگ بھڑکا جہاں سے شور اٹھا کہ آسمان جل رہا ہے۔
کہ امیں بسل ایں جا پر فشاں شد
کہ خونش رفتہ رفتہ آسمان شد
وہ کون بسل تھا جو تڑپا کر یہاں پہنچا کہ اس کا خون رفتہ رفتہ آسمان بن گیا۔
”جباب“ پر تو سچی مچ قلم توڑ دیا ہے۔ شمع و شاعر وغیرہ پر شعراء نے بہت کچھ
لکھا ہے طور معرفت سے شفق اور شاعر اور ابر پر کتنے مضامین جمع ہو سکتے ہیں۔
زہے وضع جباب بے سرو پا کہ حیرانی ز نقش اوست پیدا
پانی کا بلبلا کیا ہی عجیب شے ہے کہ نہ سرنہ پاؤں، اس کی شکل و صورت
سے حیرانی ہوتی ہے۔

نفس در دامن دل پاشکتہ نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ
اس کا سانس دل کے دامن میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہا، نگاہ مارے شرم
کے آنکھ سے باہر نہیں نکلتی۔

”نگہ با شرم عقد دیدہ بستہ“ میں اشارہ ”دلہن“ کی شرم و حیا و حجاب
کی طرف ہے، نگاہ نے شرم کے ساتھ عقد باندھا پردہ نشین ہو گئی، ”جباب“
کی صورت آنکھ کی ہے مگر نگاہ پردہ مڑگاں سے باہر نہیں آتی۔

اگر چشم است بر غیرش نظر نیست و گر پا از خودش بیرون سفر نیست

آنکھ ہے تو غیر پر نظر نہیں پڑتی پاؤں ہیں تو اپنے وجود سے باہر نہیں نکلتے۔

چو ساغر بادشاہ عالم آب کلاہ آرائی ناز از وضع آداب
جباب ساغر کی طرح ”عالم آب“ کا بادشاہ ہے۔ بحریا دریا عالم آب
ہے، ”عالم آب“ میخانہ کو بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے جباب ساغر
ہے جس سے اس کی صورت ملتی جلتی ہے، اور بادشاہی کی مناسبت سے کلاہ
یاتاج کی شکل بھی ہے۔

جیا چوں چشم حصن آبتیش خموشی ہم چوب نقش نگینش
”حصن“ کے معنی قلعہ جس میں بیٹھ کر بیرونی حملے سے محفوظ ہو جاتے ہیں،
جیا کی جگہ آنکھ ہے، مگر جباب کی آنکھ ایک آہنی قلعہ ہے یہ قلعہ بھی سر بہر
ہے۔ جباب کی صورت دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہر ہے، ”مہر“ سے تخیل
”مہر لب“ کی طرف منتقل ہوا جو خموشی کے ہم معنی ہے، جس شے پر مہر لگا
دی جائے وہ بند ہو جاتی ہے، لب پر مہر لگنا محاورہ ہے۔ یعنی خاموش ہے۔
مطلب یہ ہے کہ جباب میں دونوں باتیں مشابہہ ہوتی ہیں ایک ”جیا“ اور
دوسری ”خاموشی“۔ جیا کا تقاضا بھی خاموشی ہے جیا کا تعلق آنکھ سے اور خاموشی
کالبوں سے۔ دونوں سر بہر ہیں۔

چو اونتواں صفائی سینہ داون نفس را صیقل آئینہ داون
جباب کی طرح کسی کا کیا دل و گردہ ہے کہ سینہ صاف ہو، سانس سینہ سے
نکلتا ہے جب سینہ صاف ہو تو سانس بھی لطافت میں صاف ہونا چاہئے۔
مگر اگر آئینہ پر سانس پھونکا جائے تو وہ مکدر ہو جاتا ہے۔ لیکن جباب کی کیفیت
ہی مختلف ہے، کہ یہی سانس اس کے آئینہ سینہ کو صاف کر رہا ہے گویا
صیقل کا کام دے رہا ہے اور کدورت رفع کر رہا ہے۔

نہفتہ از نفس آں سر بہر چشم پری در شیشہ چوں نظارہ در چشم
جباب کی صورت سر بہر آنکھ کی ہے مگر ہوا بھی ہے جو اس نے باندھ

رکھی ہے، آنکھ کا کام نظارہ ہے۔ نگاہ پرواز کرتی ہے تو کسی منظر پر پڑتی ہے اور یہ منظر حسین پری رو ہے، ان مختلف خیالات کو اس شعر میں ربط دیا گیا ہے کہ جناب دم بخود ہے سرسبز آنکھ کی صورت ہے مگر جس طرح نظارہ آنکھ میں سمایا ہوتا ہے اسی طرح اس نے شیشہ میں پری آتا رکھی ہے، آنکھ میں بھی شیشہ ہے اور اسی شیشہ پر بیرونی دنیا کا عکس پڑتا ہے تو ہم اسی عکس کو دیکھتے ہیں جسے بیرونی اشیاء کی صورتوں سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح جناب میں ہوا شیشہ کا کام دے رہی ہے، جس میں جہان رنگ خارجی کا عکس پڑتا ہے جسے ”نظارہ“ سے موسوم کیا جاتا ہے، اگر مسئلہ تجد و امثال سمجھ لیا ہے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ نظارہ پری ہے مگر جناب نے اسے شیشہ میں بند کر رکھا ہے۔ یعنی جناب کے آئینہ میں بیرونی دنیا کا عکس ہے۔

نفس در آئینہ دزمیدہ زان رنگ
کہ اشکش سوخت آتش در دل منگ

بیدل کے تخیل کی لطافت اور بلندی کو کون پہنچ سکتا ہے، ہر ایک شعر کی شرح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایک کیفیت ہے جو ذہن میں آتی ہے، نثر میں ادا نہیں ہو سکتی۔ اور شعر کی خوبی ہی یہ ہے کہ نثر میں ادا نہ ہو سکے، اس شعر میں وہی ہوا یا سانس کا تخیل ہے، کتنی تشبیہات ہیں جن کے پیرایہ میں اس نے اس خیال کو واضح کیا ہے، آئینہ خود پتھر ہے، اور پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ لیکن جب پتھر آئینہ کی صورت اختیار کرتا ہے تو یہ آگ جل کر آب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، علم کیمیا کے عالم جانتے ہیں کہ پانی کے دو اجزاء دو ہوائیں ہیں ایک ہوا خود آگ ہے اور دوسری آگ کی معاون و مدد ہے، جب دونوں ایک خاص تناسب سے ملتی ہیں تو آگ کی ضد پانی بن جاتا ہے، اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ فطرت کی صفت عجیب ہے، یہی مطلب اس شعر کہے کہ آئینہ میں ہوا اس وضع سے دم بخود ہے کہ اس کے آنسو

پتھر کے دل کی حرارت ٹھنڈا کر رہے ہیں۔

چراغش در کمین پاس ناموس نفس دزدیدہ ترا و وضع فانوس
ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے لیکن یہی آگ جب چراغ کی روشنی میں ہو تو ہوا کے
جھونکے اسے ٹھکارتے ہیں، جناب کی صورت چراغ کی ہے، اور اس میں ہوا بھی
ہے گویا چراغ رہ گزرا باد پر ہے اور بجھ جائے گا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے جو
جناب کی زندگی کو لاحق ہے اس نے دم سادھ لیا ہے۔ چراغ پر فانوس بھی ہوتا
ہے، جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ چراغ کو بیرونی ہوا کے حملہ سے بچائے، لیکن جناب
کے اندر تو خود ہوا ہے، اور فانوس باہر ہوتا ہے اور باہر کی ہوا کے لئے روک تھام
کا کام دیتا ہے۔ اس لئے جناب نے اس خطرہ کا سید باب اس طرح کیا ہوا
باندھ رکھی ہے۔

سُبک روجی و کار امتیازش تہی از خود شدن سامان سازش
سبکی جسے ہم محاورہ میں ہلکا پن کہتے ہیں ”وقار“ کی نفی ہے۔ اور جو ہاتھ
خالی ہو یا جس کے گھر میں آؤ بولتا ہو وہاں اسباب و سامان منفقود ہوتا ہے،
یہ اضداد ہیں جو بیدل نے اب تمام ابیات میں جو ہم کچھ چکے ہیں جمع کر دئے ہیں۔
سبکی سے وقار اور تہی دستی سے ساز و سامان کا مفہوم پیدا لیا ہے۔ ساب میں
سائنس یا روح ہے، ”روح“ اور ”راج“ اور ”ریح“ ایک ہی لفظ ہے، جس کا
ترجمہ ہوا ہے، یہ روح کتنی سُبک یا لطیف ہے کہ جناب کی اتیازمی خوبی بھی
اسی کی لطافت میں ہے، ”تہی از خود شدن“ کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں غر کی
گنجائش کا کیا سوال ہے جبکہ وہ آپ ہی اپنے آپ سے خالی ہے، بیدل نے خودی
اور بیخودی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر میر حاصل بحث کی ہے۔
مناسب مقام پر چند شعرا کا حوالہ دیا جائے گا۔ جناب کا ساز و سامان ہی
”تہی از خود شدن“ ہے۔

چناں بر آب دار دسیر تکیں کہ گوئی بیضہ مرغابیست ایں

مرغابی یعنی بطخ وغیرہ پانی کے جانور ہیں اور خشکی پر رہتے ہیں، پانی میں غوطے بھی لگاتے ہیں مگر ان کے پروں کا دامن تر نہیں ہوتا، اسی طرح جناب پانی پر تمکنت کے ساتھ سیر کر رہا ہے، گو یہ مرغابی کا انڈا ہے۔

بہر آب از سبک ساری رواں است

تہی چوں گشت کشتی بادباں است

ہر ایک پانی پر خواہ دریا کا ہو یا بحر کا، بے تکلف پیر رہا ہے، جب اپنے آپ سے خالی ہوا تو یہی کشتی بادباں کا کام دے رہی ہے، بادباں میں ہوا بھرتی ہے تو کشتی ہوا کے زور سے تیز رو ہو جاتی ہے۔ چونکہ جناب ”از خود تہی“ ہے اس لئے یہ تو ہونی کشتی کی صورت ہوا جو اس کے اندر ہے بادباں کا کام دیتی غرض جناب کشتی بھی ہے اور بادباں بھی، اس لئے اس کی روانی کے اسباب اس کے اندر ہی موجود ہیں، غیر کا محتاج نہیں۔

بہاں رنگش نزاکت نقش بستہ است

اگر چشمے بہم مالد شکستہ است

اس کی نزاکت کا یہ عالم ہے، نزاکت نے یہ رنگ باندھا ہوا ہے کہ اگر آنکھ ملے تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے، فارسی میں رنگ بستن اور شکستن محاورہ ہے۔ ہم محاورہ میں رنگ جانا اور رنگ اڑنا کہتے ہیں، نزاکت نے اپنا رنگ اس وضع سے جھار کھا ہے کہ اگر ذرا آنکھ ملے تو اڑ جائے یعنی جناب کا وجود ہی فنا ہو جائے، جناب کی صورت آنکھ کی ہے لیکن یہ تب تک ہی زندہ ہے جب تک چشم بستہ ہے، ذرا آنکھ کھلی اور یہ کہیں کا نہ رہا۔

نگاہ از ناز کی نکشودہ مرگاں قدم از عاجزی نشکستہ داماں

نگاہ نزاکت کی وجہ سے مرگاں اٹھا نہیں سکتی اور قدم ضعیف کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتا۔

ہوا صہبا یا غے دل شکستہ نفس روغن چراغے شعلہ جستہ

بیدل

بفانوس نفس می سوزد و بس خیلے محض می افروزد و بس
 اس نیم نفس نے جو ہوا باندھ رکھی ہے اس میں ایک نشہ ہے، خود لوٹے
 ہوئے پیالہ کی شکل ہے جس سے مستی ٹپکتی ہے، اس کا سانس یا یہ ہوا جو سراپا
 ہے چراغ میں تیل کا کام دیتی ہے، یہ خود چراغ کی صورت ہے مگر شعلہ جستہ ہے،
 چراغ میں تیل ہوتا ہے اور وہی جلتا ہے، اس سے شعلہ نکلتا ہے، یہ سب کچھ جناب
 ہی ہے، یہ سامان نور و نار بھی اسی میں ہیں، اس کے فانوس میں اسی کا سانس
 جل رہا ہے اور محض خیال کی صورت نمایاں ہو رہی ہے، اس شعر میں ”سورہ
 نور“ کی ابتدائی آیات کی طرف اشارہ ہے، کہ چراغ ہے اس میں روغن زیتون
 ہے اور اتنا صاف ہے کہ اس میں صلاحیت ہے کہ بغیر آگ دئے خود بخود
 بھڑک اٹھے۔

چو صبحش در قفس غیر از نفس نیست

وے تا پرزند ساز قفس نیست

صبح کو بھی نفس ہی کہا گیا ہے۔ صبح کی طرح اس کے قفس میں سانس
 کے سوا اور کچھ نہیں ہے، گویا یہ ایک پرندہ ہے جو پنجرہ میں بند ہے، اگر پھر پھر
 تو پنجرہ ندارد، پانی کا ٹبلہ ایک قطرہ آب میں ہولے سوا اور کچھ نہیں اگر یہ
 ہوا نکل جائے تو ٹبلہ ختم ہو گیا۔

معنائے چنیں عالم ندارد کہ تابشگفت نامے ہم ندارد
 تمام دنیا جہان میں جناب ایک معما ہے، اسے حل کرو تو اس کا نام
 نشان مٹ جائے گا۔

بیدل نے ابرو و شفق و جناب و غیوم پر جو کچھ لکھا ہے اس کا شاعرانہ تخیل
 بلاشبہ بہت بلند ہے لیکن وہ اس سے کچھ اخلاقی نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے، چنانچہ
 ”جناب“ پر اتنا لکھ کر کہتا ہے کہ
 میرس از من تماشا ئے جاہم کہ من ہم گر بخود اندیشم آبم

یہ مشاہدہ جو جناب کا میں نے کیا ہے اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا ہے کہ میں تو جناب کی طرح نقش بر آب ہوں، میری بھی اصل اور زندگی یہی آب ہے۔ (کل شیء حی من الماء)

شبے کو گریہ طوفاں کا ریم بود جناب آئینہ دلداریم بود
ایک رات جب میرا گریہ طوفاں برپا کر رہا تھا جناب میں مجھے دبحوئی
کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

نفس در پردہ دل آہ می بیخت
ہنگاہ از چشم حیراں نالہ می ریخت
دل کے پردہ میں نفس آہ بھر رہا تھا، نگاہ چشم حیرت زدہ سے نالہ و فغاں
کر رہی تھی۔

تار نظر اور نالہ ایک ہی روش پر چلتے ہیں، یہ گریہ وزاری جناب میں بھی
مشاہدہ ہوتی ہے، اب جناب زبان حال سے کچھ کہہ رہا ہے۔

کہ اے غافل تو خود ہم چشم مائی
ز وضع بیدلی بیدل چرائی
کہ اے بے خبر تو خود میرا ہم چشم ہے، تیری وضع بیدلی میری وضع ”تہی
از خود شدن“ ہے، تو دل شکستہ اور یابوس کیوں ہے۔

طرب ہا کن گرت اشکے وآہیست
سرے بے مودریں عالم کلاہیست
خوش رہ، خوشی منا اگر اشک اور آہ کا ساز و سامان تیرے پاس ہے
جو لازمہ عشق ہے، تو اس عالم میں جو ”سر بے مو“ ہے وہ تاج ہے۔ سر بے مو ”وہ
سرجس پر بال نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

کے کشد بار کلاہندی را سرے ما
ہست موئے سرا بر سرا افسر ما

کلاہندی کا بوجھ میرا سر پہداشت نہیں کر سکتا، میرے اپنے سر کے بال
میرے سر پہ کلاہ ہیں، بیدل کہتا ہے کہ ان بالوں کا بوجھ بھی ناقابل برداشت
ہے، قلندر کو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ ”سر بے مو“ بھی تو کلاہ کی صورت ہے۔
مثنوی طور معرفت چھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ہم نے چند اشعار پیش
کئے ہیں وہ بھی جستہ جستہ، مثنوی کے آخر میں ارشاد تفسیر من عرف نفسه
فقد عرف ربہ کی ہے۔

بیالے بیدل بے حاصل خویش بخود پیچیدہ اما غافل از خویش
اے بیدل تو کتنا اپنی حقیقت سے بے خبر ہے اگرچہ تو اپنی ذات سے اُلجھا
ہوا ہے مگر اپنی خودی سے غافل ہے۔

حق از ساز تو پیدا و تو باطل
دل از حبیب تو در جوش و تو بیدل
حق تیرے ہی ساز ہستی سے نغمہ سرا ہے اور تو اسے باطل سمجھ رہا ہے دل
تیرے ہی پہلو میں ترپ رہا ہے اور تو بیدل ہے۔

بصد دل چوں صنوبر بیدلی چند سراپا حاصلی بے حاصلی چند
صنوبر کی طرح سینکڑوں دل تیرے پہلو میں ہیں تو کب تک بیدل رہے گا۔
تو سراپا حاصل ہے، خود مقصد ہے، کب تک بے حاصلی کا شکوہ کرتا رہے گا۔
بوہمت صرف شد عمر گرامی تمامت کر دآخر نامتامی
تو بہمت میں تیری عمر گراں مایہ صرف ہو گئی، آخر نامتامی نے تجھے ختم
کر کے رکھ دیا۔

نہ گردت زیب دامن ہوا شد نہ رنگت باشکستے آشنا شد
تیرے غبار ہستی نے ہوا کے دامن پر کچھ زیبائش پیدا نہیں کی نہ تیرے رنگ
نے شوخی کا اظہار کھل کر کیا آدم خاکی ہے اور ہوا و موس کا پتلا، اس میں بھی
اس نے کوئی شان پیدا نہیں کی، رنگ کی شوخی اس کے کھلنے پر ظاہر ہوتی ہے

نہ داغے سرکشید از لالہ زارت
 نہ خونے ریخت رنگ نو بہارت
 تیرے لالہ زار سے کوئی داغ نہ اُبھرا، اور یہی لالہ کے حسن کو دوبالا کرتا ہے
 اور نہ تیرے ہونے کو بہار کا رنگ پیدا کیا۔

اگر حسنی بدہ عرصہ جاملے و اگر آئینہ بنما مثالے
 اگر تو حسن ہے تو جمال میں جلوہ نما ہو تو کوئی حسین صورت دکھا۔
 حسن آئینہ میں حسین صورت ہی دکھاتا ہے۔

بہر دامن چو گرد آویختن چند بہر رنگے چو آب آیمختن چند
 گرد و غبار کی طرح ہر ایک کے دامن کو آلودہ کرنا یا اس سے وابستہ
 رہنا کب تک، ہر ایک رنگ میں پانی کی طرح ملنا کب تک۔ اگر کسی کا دامن
 پکڑیں تو محاورہ میں اس کی دستگیری قبول کرنا ہے، یا توصل یا وسیلہ کے
 معنی ہیں، رنگ پانی ہی میں حل ہوتا ہے۔

اگر گردی بداناں خود آویز و اگر آبی بروی خویشتن ریز
 اگر تو گرد ہے تو اپنے ہی دامن سے وابستہ رہ اور اگر پانی ہے تو اسے اپنی
 آبرو دینا۔

فراموشی نیاز این د آں کن بخود پرداز و کار صد جہاں کن
 جو بھی تیرا غیر ہے، یہ ہو یا وہ بھول جا، خود شناس ہو اور سودنیا جہاں کا
 کام سرانجام دے۔

شوی تا از نماز عشق محرم وضوئی کن بخوں ہر دو عالم
 نماز کے لئے اول وضو شرط ہے، نماز عشق کا وضو دو عالم کے لیے ہوتا
 ہے، یعنی دو عالم مقصد بالذات نہیں، اس کثرت کی نفی اثبات وحدت ہے،
 تو نماز عشق سے واقف اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب دو عالم سے ماتمہ دھو کر
 یک سو ہو۔

ز نقش غیر اگر آگاہیت نیست براؤ کفر ہم گمراہیت نیست
اگر غیر کا نقش یا تصویر تیرے دل میں نہیں تو کفر کے راستہ پر چل کر بھی تو
گمراہ نہ ہو گا۔

اگر آلودہ احرام غیری ہمہ گر کعبہ باشی تنگ دیری
اگر تونے غیر کا احرام باندھا ہوا ہے تو خواہ تو سر تاپا کعبہ بھی ہو بیت خانہ
بھی تجھ سے عار کرے گا۔

جہاں یک برق تازی نگاہست
تو گر پوشی نظر عالم سیاہست
یہ عالم یہ کائنات کیا ہے تیری اک نگاہ کی جولانی، ایک ہی نگاہ برق تاز
تمام جہان کو تیرے آغوش مرگاں کے احاطہ میں لے آتی ہے۔ اگر تو بند کرے تو
تمام عالم تاریک ہے، معلوم ہوا کہ یہ تیری برق نظر کا نور ہے جس سے یہ عالم منور
ہے۔ تو نظر بٹالے تو یہ سیاہ ہے۔

اگر نظارہ غیر است در پیش بسوز داغ شود آتش خویش
اگر غیر کا نظارہ تیری نگاہ کے سامنے ہے تو اپنی ہی آگ میں جل بھن کر
داغ ہوتا رہ۔

کہ نزد آگہی افروختہ ناست سزائی کار غفلت سوختہ ناست
عقل و شعور کے نزدیک تو چمکنا دکننا پسندیدہ ہے مگر غفلت کے کاموں
کی سزا جلنا، پشیمان ہونا ہے۔

بہ عین قرب محروم حضوری
بجو خود را کہ از خود سخت دوری

تو عین قرب میں ہوتے ہوئے حضوری سے محروم ہے اپنے آپ کو ڈھونڈتے
خود شناس ہو تو اپنے آپ سے بہت دور ہے، حالانکہ فی نفس الامر تو اپنی خودی
کے نزدیک تر ہے اس قرب کے ہوتے محروم ہے۔

مباش از جستجوئے خویش نوید
 ہمیں نور است رہبر تا بخورشید
 تو اپنی خودی کی تلاش میں نگارہ، مایوس نہ ہو، تیری خودی اسی سولج
 کی ایک کرن ہے جو نور کا سرچشمہ ہے، یہی تیری رہنمائی اس چشمہ نور تک
 کرے گی۔

بلکہ خویش تانواں رسیدن جمال حق چہ امکانست دیدن
 جب تک تو اپنی کنہ اپنی ہی حقیقت سے واقف نہ ہوگا۔ یہ کب ممکن ہے
 کہ تو جمال حق کے دیدار سے مشرف ہو۔
 حکیم سنائی "حدیقہ" میں کہتا ہے کہ
 آنکہ در نفس خوزبوں باشد عارف کردگار چوں باشد
 جسے اپنے ہی نفس کی معرفت نہیں وہ اپنے رب کی معرفت کیسے حاصل
 کر سکتا ہے۔

خواجہ حافظ کا ارشاد بھی یہی کچھ ہے، بیدل کہتا ہے۔
 درال وادی کہ طالب نیست معلوم
 طلب با جملہ موہوم امت موہوم
 طالب اور مطلوب میں رابطہ طلب کا ہے۔ جب طالب ہی وادی تحقیق
 میں نامعلوم ہو تو ظاہر ہے کہ طلب ایک امر موہوم ہے۔

وگرا سرار خود ہمیدہ باشی یقین نقش ذاتی دیدہ باشی
 امر موہوم اور شے ہے جس سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اگر تو
 "اسرار خودی" کو سمجھ گیلے تو یقیناً تجھے نقش ذات کا مشاہدہ بھی ہوگا۔
 نخست از رہ غبار خویش بردار وگرا منزل حق سربروں آر
 اس جادۂ تحقیق خودی کو ضرور ہے کہ گرد و غبار سے صاف کر اور یہ تیرے
 توہمات ہیں جو دیدہ مشاہدہ میں اڑا کر خاک دھول ڈال رہے ہیں۔

جب یہ راستہ گرد و غبار سے صاف ہو جائے گا تو منزل حق بھی صاف صاف دکھائی دے گی اور تو وہاں پہنچ جائے گا۔ اول تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔
توئی سر منزل تحقیق و عین عالم تنگ و پوی کہ ہم درست مدغم منزل اور یہ عالم کیا ہے تو خود ہے تیری خودی ہے۔ اور منزل تنگ دوڑ دھوپ بھی تو ہی کر رہا ہے جو تیرے وجود کا خاصہ ہے تیرے ہی وجود کا جزو ہے۔

ز منزل تا نخواستی سر کشیدن دریں صحرا محال است آرمیدن
جب تک تو منزل پر نہیں پہنچتا تو ناممکن ہے کہ تو دشت ہستی میں ایک دم آرام سے بیٹھ سکے۔

یکے منزل دوئی را ہست ایں جا بفہم ہر کہ آگاہست ایں جا
منزل تو ایک ہی ہے مگر راستے اس کی طرف کثرت سے جاتے ہیں اس راز کو حق آگاہ حضرات ہی سمجھتے ہیں۔

زمین تا آسماں گامے ندارد رہ منزل بجز نامے ندارد
حقیقت یہ ہے کہ زمین تا آسماں ایک نگاہ کے ایک قدم کا فاصلہ بھی نہیں۔ اس لئے راستہ خواہ کوئی ہو ایک نام ہی نام ہے ورنہ موجود نہیں۔ جو کچھ ہے منزل وحدت ہی ہے۔

دوئی تا بست مشکل بایست رفت کہ ہر گامے دو منزل بایست رفت
جب تک دوئی یا کثرت کا تصور ذہن میں ہے تو یہ منزل نہیں بلکہ راستہ ہی راستہ ہے اور کبھی طے نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر ایک قدم دو منزلوں کی طرف اٹھے گا، اور کسی منزل تک رسائی نہ ہوگی۔

ز نام خضر تا آگاہ باشی ہمہ گر منزلی در راہ باشی
خضر کا کام تو راستہ پر رہنمائی کرنا ہے اور جب تک منزل پر نہ پہنچ جائیں خضر رہبر ہے۔ اس لئے جب تک تیرے ذہن میں خضر کا تصور ہے خواہ

تو سرتاپا منزل ہی کیوں نہ ہو، ابھی راہ میں ہے۔

نہ بندی تا بفہم خویش احرام پلید نہاست برق نبض آرام
خضر بہر حال تیرا غیر ہے، تیری خودی ہی تیرا خضر اور رہنا ہے جب تک
خود شناسی کا احرام نہ باندھے گا، یہ سمجھ کہ کعبہ مقصود کا حج نصیب نہ ہو گا۔
یہ نبض مضطرب ہی رہے گی حالانکہ تجھے منزل پر اطمینان قلب حاصل ہونا
چاہئے۔

تسلّی در ہمیں آرام گاہ است زم منزل آنچہ بیرونست راہ است
ظاہر ہے کہ منزل سے باہر جو کچھ بھی ہے راہ ہی ہے اور راہ پر دوڑ دھوپ
ہی ہے آرام اور اطمینان تو منزل پر ہی میسر ہو سکتا ہے۔



رُباعیات

رباعیات کی تعداد بھی ہزاروں ہے۔ چند رباعیات ہم بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، چند ایک ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

بیدل نخوری عشوہ اوہام ملا آفاق پر است لیک از جنس خلا
جز وحدت صرف نیست در غیب شہو الا الفے دارد و باقی لا

یہ عالم کثرت ہے، اور سطحی مشاہدہ سے کثرت ہی محسوس ہوتی ہے یہ فریب نظر ہے، اسے اصطلاح میں ”مشاہدہ حسی“ کہتے ہیں، حقیقت ”وحدت صرف“ ہے خواہ ظاہر ہو یا باطن، لفظ ”الا“ میں الف تو حقیقت ہے باقی ”لا“ ہے، الف تو ثابت شدہ حقیقت ہے ”لا“ حرف نفی ہے۔ باقی ہیج۔

انساں کہ نمودش آگہی عقیبی را در بیج مکان کرم خواہد خارا
شیطان چہ کس است اندکے فہم کنید آں کس کہ شناخت ملک خود دنیا را

دنیا تو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، عقیبی کا تصور شعور عقلی سے ذہن میں پیدا ہوا، دنیا ہو یا عقیبی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو کچھ ہے رحمت کی مناسبت سے خوب ہی ہے، اس رحم و کرم کا تقاضا یہی ہے کہ کسی زمان و مکان میں کچھ بھی ایسی بات نہ ہو جو اس کے نامناسب ہے، اس لئے شیطان کا وجود جو ہمیں اس رحم و کرم سے دور رکھنا چاہتا ہے ایسے شخص کا ہی ہے جو دنیا کو اپنی

ذاتی ملکیت خیال کرتا ہے۔ شیطان اور شیطانی اعمال کا نتیجہ فتنہ و فساد اور عذاب دنیوی اور آخروی ہے۔ جو فرعون اس دنیا کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس میں تصرف بھی اسی عقیدہ کے تحت کرتا ہے وہ ہمیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے، اور خود راندہ درگاہ الہی ہے۔

ہر گاہ کہ غنچہ گشت و شکفت جاب رمز حق و خلق پیچ نہ نہفت جاب
لیکن نہ شنید موج سرگشتہ ما آں حرف کہ پوست کندہ گفت جاب

جب تک جاب غنچہ کی صورت ہے اور پھول کی طرح کھلا ہوا نہیں اس کی ہستی بجائے۔ حق و خلق کی رمز بیان کر رہا ہے اور کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھتا، لیکن ہماری موج سرگشتہ یہ حالات گوش ہوش سے نہیں سنتی جو جاب پوست کندہ بیان کر رہا ہے، محاذہ میں کہتے ہیں پوست کندہ حالات بیان کرنا، جب تک کسی شے پر پوست ہے وہ محبوب ہے، جب یہ جاب اٹھا دیا جائے تو اس شے کے اندر نئی حالات منکشف ہوتے ہیں، جاب کی بیرونی جلد چٹ جاتی ہے تو جو کچھ اس کے اندر ہے ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ صرف ہوا ہے، جب تک اس پوست کے ساتھ ہے وہ جاب سے موسوم ہوتا ہے جب پوست اتر گیا تو جاب نہ رہا اپنے اصل پانی میں محو ہو گیا۔ یہی کیفیت خلق کی ہے، حق کا اظہار تو اس وقت ہوتا ہے جب یہ سانس یا ہوا جو ہستی موسوم نے باندھ رکھی ہے مفقود ہو جائے ہر ایک شے تعینات میں محدود ہے، جب ان تعینات کی حد توڑ دی جائے تو اصل شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ہر ایک شے جو معین اور مشخص ہے محدود اور مخلوق ہے۔

آں حُسن کہ آئینہ امکاں پُر زخاں ہزردہ بصد ہزار خورشید نواخت
بایں ہمہ جلوہ نور در پردہ غیب تا انساں گل نہ کرد خود را نشاخت

وہ حُسن ازلی جب آئینہ امکاں میں منعکس ہوا ہر ایک ذرہ کو لاکھ سورج کا نور عطا کیا۔ باوجود اس کے کہ ذرہ ذرہ نور ہے مگر پردہ غیب سے جب تک

بیدل

انسان کا ظہور نہ ہوا اس حسن نے اپنے آپ کو نہ پہچانا یعنی اسم و صفات الہیہ کا ظہور تو ہستی کے ہر ایک طبقہ اور ہر طبقہ کے ذرہ ذرہ میں ہے مگر علم و شعور مرتبہ انسان ہی میں ظاہر ہوا۔ یہ کہنا چاہئے کہ ماسوائے انسان جو بھی ہے اس میں علم معرفت کا اظہار نہیں ہوتا۔

گر طبع سلیم قابل تفہیم است انسانست آنکہ مصدر تعظیم است
 ایں کعبہ کہ مرکز وجود من تست تمثال حضور دل ابراہیم است
 اگر تجھے طبع سلیم عطا ہوئی ہے اور تجھ میں فہم و تفہیم کی صلاحیت ہے تو سمجھ
 لے کہ یہ انسان ہے جو مصدر تعظیم ہے، جس سے تنظیم کا ظہور ہوتا ہے، یہ کعبہ جو
 میرے اور تیرے سجدہ کا مرکز ہے، کیا ہے حضرت ابراہیم کے دل کا تصور ہے۔
 تحقیق کہ فہم اں بکیرت دال است بے پردہ باندا مقام حال است
 شکلے کہ بنجاک سایہ میخوان در آب نظر کنی تمثال است

یہ رباعی بہت بلند پایہ ہے بیدل کا نظریہ تحقیق یہ ہے کہ
 ہر کس میں جا از مقام و حال خود گوید خبر
 از زبانم صرف او گزشتنوی باور ممکن

ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حد نظر ہے، وہ جو کچھ ذات باری کی
 نسبت بیان کرتا ہے وہ اپنے ہی حال اور مقام کی خبر دے رہا ہے۔ اگر وہ یہ کہے
 کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی اور ایسی ہے تو باور نہ کر، وہ برتر از خیال و قیاس و
 وہم ہے، البتہ جتنا کسی کا فہم بلند اور بلند تر ہے اور جو کچھ وہ ذات باری کی
 نسبت کہتا ہے اپنے ہی قرب کا مقام بتا رہا ہے۔ عارف کامل وہ ہے جو یہ کہتا
 ہے کہ:-

ما عرفناک حق معرفتک

اس رباعی میں ہر ایک شخص کی حد نظر کو ایک مثال سے واضح کیا
 کیا گیا ہے کہ خاک پر ہم کسی شے کا سایہ اور پانی میں اسی شے کے عکس کو مثال

کہتے ہیں۔ تمثال نسبتاً زیادہ صاف اور واضح ہے، اسی طرح جتنا کسی شخص کا ذہن بلند ہوگا اتنی ہی حقیقت زیادہ صفائی سے منکشف ہوگی، مگر یہ سایہ اور تمثال ہی ہے ذات خاک اور پانی سے باہر ہے اور وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔

آئینہ خلق طرفہ جو ہر دارد صورت دگر است عرض دیگر دارد
می گویند و حق است ما باطل محض از باطل حرف حق کہ باور دارد
لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ آئینہ میں صرف صورت ہی نظر آتی ہے اور یہ مہموم ہے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مشاہدہ ہو رہا ہے سب ”مایا“ ہے ہیچ ہے، فریب نظر ہے البتہ ایک اور ہستی حق ہے۔ اگر یہ خود باطل میں تو ان کا قول بھی باطل ہے، حقیقت یہ ہے کہ کائنات باطل نہیں (ربنا ما خلقت هذا باطلا)

ہر کس اسرار عدل رحمان فہمید آنسوی تخیلات اعیان فہمید
خود مختص بنیک بدخویشتمین حق را قاضی جمال نتوان فہمید
سورہ الرحمن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے کہ ارض و سموات کو رحمن نے خلق فرمایا تو اس میں میزان عدل رکھ دی، جس سے تجاذب کوئی شے نہیں کرتی، یہ عدل جس سے نظم و نظام عالم قائم ہے ان تصورات کے دوسری طرف ہے جو اشیاء کا ہمارے ذہن میں ہے، یہ عدل انسان قائم نہیں رکھ سکتا البتہ ”قسط“ سے کام لے سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو کچھ علم ہمیں اپنی نسبت ہے وہ کسی اور کو ہماری نسبت ویسا ہی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے اپنے اعمال نیک و بد کا احتساب جیسا ہم خود کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ قاضی جمال اکبر شاہی عہد کی مشہور شخصیت ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ اسی صورت میں عدل و انصاف سے کر سکتا ہے جب اس پر حق کا حقہ منکشف ہو اور یہ ممکن نہیں، ”حق“ کا قیاس اپنے ذہنی تصورات پر نہ کرنا چاہئے، حق ان سے

ماورئی ہے۔

آن دم کہ حقیقت قدم پیدا شد دانی چہ گو نہ کیف دم پیدا شد
مارا او دید ہستی آمد بوجود خودا دیدیم ما، عدم پیدا شد
حقیقت وحدت ہے، جب اس کا ظہور ہوا، یعنی اس کا انکشاف ہم پر ہوا تو
”کیف دم“ کا سوال بھی پیدا ہوا، یعنی چہ و چند و چوں میں ہم اُلجھ گئے، اس نے ہماری
طرف دیکھا تو ہستی کا ظہور ہوا، ہم نے اپنے آپ کو دیکھا تو عدم پیدا ہوا۔ ہستی اور عدم
دو متضاد امور ہیں۔ اگر ہم باحق ہیں تو موجود ہیں اور جب اس سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو
دیکھیں تو عدم ہیں حقیقت قدیم ہے۔ حادث مخلوق ہے، نگاہ حقیقت میں تو ہستی مویڑ
ہے، ہماری نگاہ میں عدم ہے۔ (لہٰذا یکن شی مذکور) اسی کے ہم معنی یہ رباعی ہے۔

امروز کہ بر خویش نظر وا کر دیم
ایکاد خیال دی و فردا کر دیم
یعنی پیش از وجود بودیم قدیم
موجود شدیم و عدم انشا کر دیم

غالب مرحوم نے بھی اچھا کہا ہے ۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

عقل آمد طومار دلائل واکرد جمعیت نسخہ یقین اجزا کرد

آراکش لفظ رنگ معنی گردند گھٹینی ہا بہار رارسوا کرد

عقل کسی شے کا فہم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا تجزیہ نہ کیا جائے، اور چند
چند و چوں یعنی عقلی استدلال سے ثابت نہ کیا جائے حقیقت تو بالبداہت ثابت
شدہ ہے، جس طرح الفاظ کی رنگینی سے معنی رنگ آلودہ ہو جاتے ہیں، اور ذہن
معنی کی طرف نہیں بلکہ مفکوں کے حسن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح عقل
فسوں سازنے دلائل کی طرف متوجہ کر دیا۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید
راستی رفت کہ ممنوں عصایم کردند

”یقین“، تو یعنی شہادت سے حاصل ہوتا ہے، دلائل کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب حقیقت پوشیدہ ہو، قاضی جمال کے قیاسات سے تو حق کا اظہار نہیں ہو سکتا، بہار تو گل فروش ہے، مشاہدہ کر دو تو بہار کی رنگینی ان ہی میں نظر آئے گی، اگر گل چینی کر دے تو بہار کا مشاہدہ ختم ہو جائے گا۔ گل چینی فطری آرائش استدلال عقلیہ کی طرح ہے جب تک جمعیت ہے یقین بھی ہے، جب اس کا شیرازہ بکھرا تو پھر دلائل سے جمعیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تقلید زہر چہ رنگ می گرداند جابر صد طبع بنگ می گرداند
غلطیدن یک سنگ ازین کوہ بلند پہلوی ہزار سنگ می گرداند
پہاڑی کی بلندی سے اگر ایک پتھر زنی لڑھکتا ہوا نیچے کی طرف آئے تو راستہ میں جو بھی پتھر پڑے وہ بھی اس کے ساتھ لڑھکتا ہوا نیچے آ رہے گا، یہی کیفیت تقلید کی ہے، اگر ہم کسی شخص کا اتباع کریں اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ہم اس کا بھی اتباع کریں گے۔

کفر گیرد کاملے ملت شود علتے راملے علت شود
اس لئے ”ترک تقلید گیر تحقیق“ اس است، تحقیق بلندی کی طرف لے جاتی ہے، اور تقلید گڑھے میں گراتی ہے۔

ہر سانحہ کہ شد با ف نہ دیں بیکاری خلق شہر تش راست کفیل
موسوی تا حال می شگافد دریا فرعون ہنوز می خورد غوطہ بہ نیل
کوئی واقعہ جس میں افسانوی پہلو نکلتا ہو۔ بیکار لوگ اس کی شہرت کے خود کفیل بن جاتے ہیں اور اس کا ڈھنڈورا ایسا پیٹا جاتا ہے کہ بار بار اسی کا تکرار ہوتا ہے، یہ سمجھو کہ موسوی ابھی ابھی دیا کو عصا سے پھاڑ کر جا رہے ہیں اور فرعون ابھی تک نیل میں غوطے کھا رہا ہے۔

بیدل

عالمے را سرگزشت رفتگاں از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست

فردوس باتفاق ارباب علوم آنسوی ثواب برد جست و نجوم

یعنی سعد و نحس تادر نظر است عیشت نامکن است و راحت معلوم

تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ بہشت آسمان کے باہر دوسری طرف ہے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ سعد اور فلاں نحس ہے اور اس کا اثر ہم پر پڑ رہا ہے، ہم تو اسی کڑھ ارض پر انہی کو دیکھ رہے ہیں اس لئے عیش نامکن اور راحت مفقود ہے، وہ تو بہشت میں ممکن ہے، ستاروں اور سیاروں اور بروج میں ان کا داخلہ اور خروج ہی کا رفر ہے اور اثر انداز ہو رہا ہے تو عیش و آرام نہ دار۔

ہر چند جہاں بے قیاس علیم یکسر بے بہرہ مساس علیم

زیں سمع و بصیر فریبانش نہ خوری عالم دگر نیست مایاس علیم

شیخ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات ”صور علیہ“ ہیں، یعنی علم حق تعالیٰ کی صورتیں ہیں، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ ”ما معلوم حقیم نہ علم حق“ یعنی عالم الغیب والشہادۃ تو ذات حق تعالیٰ ہے ہم ”معلوم“ ہیں نہ کہ خود علم، اگرچہ ہم بھی ایک جہان علم ہیں مگر علم حق تعالیٰ انک ہماری رسائی نہیں اس سے ہم نہیں کر سکتے، جو اس ظاہری سمع و بصیر ذریعہ دانش ضرور ہیں مگر جو علم ان سے ہیں حاصل ہوتا ہے اس نے حقیقی علم کی جو بھی نہیں سونگھی، یہ کہو کہ ہم اس علم پر ایک حجاب ہیں، العلم حجاب الاکبر۔

بیدل در درس گاہ رم و مطلق از آگاہی نمیتواں برد سبق

اجزاء و محاط را کہ کردہ است محیط ما علم حقیم نے عالم حق

اللہ تعالیٰ کا علم ہر ایک شے پر محیط ہے۔ انسان کا علم ایسا نہیں کہ تمام کائنات کلا و جزو اس کے احاطہ علم میں آجائے۔ پس اتنا ہے کہ ہم علم حق

ہیں، حق کے عالم نہیں، اس رباعی میں بیدل شیخ اکبر کی تائید کرتا ہے۔

اے مُردہ انتظارِ محشر بُردن حیف است بہ فساناتِ خون خوردن
در صوفِ آفاقِ نظر کن کایں جا ہر روز قیامت است و ہر شب مُردن
کب تک تو محشر کے انتظار میں رہیگا، اس کے بارہ میں جو کچھ فسانے بیان
کئے جاتے ہیں سن سن کر مارے غم کے گھل رہا ہے آفاق میں نظر کر کہ اس جگہ
روزِ قیامت ہے اور ہر ایک رات مرنا، نیند بھی موت کی بہن ہے، سویا اور مرا
ہو دو دونوں برابر، صبح اُٹھے تو سمجھو کہ حشر قائم ہوگا۔

اے طالبِ بعیت اوقاتِ مباش حرفے ز قلندر بشنو و فادغ باش
گر آگہی از مقتضیاتِ دوراں شبِ خواب کن دروزانہ تلاش
اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے ہر وقت جمعیتِ خاطر حاصل ہو تو ایک قلندر کی
بات سن اور بے فکر ہو، اگر تجھے دن اور رات کی گردش کے تقاضا کا علم ہے تو
راتِ لمبی مان کر سورہ اور دن کے وقت تلاشِ معاش کر، اللہ تعالیٰ نے رات
آرام کے لئے اور دن معاش کے واسطے بنایا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دن کو سونا
کہاں کی عقلِ مندی ہے۔

تا زنگیست مست باید بودن آزاد ہر چیہست باید بودن
عالم یکسر مقید و ہم خود است مارا بیدل پرست باید بودن
جب تک زندگی ہے مستِ حال رہنا چاہئے جو کچھ بھی ہے سب سے آزاد
اور بے تعلق رہنا چاہئے۔ ایک دنیا اپنے توہمات میں الجھی ہوئی ہے، ہمیں
تو بیدل پرست ہونا چاہئے۔ نہ دل ہو نہ کسی سے اُچھے۔

نہ قیصر جلوہ کش نہ غفور نشیں نے مست بروں آئے نہ غمخور نشیں
حر حاصل عزت نیست منظور ہوں از دیدہ خلق اند کے دور نشیں
تیرا باہر کلنا خلوت نشیں ہونا قیصر و غفور کی طرح نہ ہونا چاہئے، نہ
اپنی مستی کا اظہار لوگوں پر کرے اور نہ غمخور گوشہ نشیں ہو، اگر تیری خواہش

عزت کے حصول کی ہے تو تھوڑا خلق سے دور بیٹھ رہو۔

در ملک تعصب از خیال باطل یکسر بیدار افتادہ خوشہ ہائی نخل
 زیں جاست کہ روز شب بے نیای ہند رنلں بزبان زاہداں از تہ دل
 توگوں نے کچھ باطل عقائد سے ایسی وابستگی پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے خلاف
 کچھ سننا نہیں چاہتے اور اسی کو ضرور منوانا چاہتے ہیں اسے ”تعصب“ کہتے ہیں،
 زند تو زبان سے اور زاہد تہ دل سے ایک دوسرے کو اینا پہنچا رہے ہیں۔
 ہر گاہ کشد مہر حقیقت علی از شبنم امکاں نتواں یافت نے
 توحید بہارے و خزانے دارد یعنی ز تو خلد و از ماعدے
 آفتاب طلوع ہوتا ہے تو شبنم اس کی حرارت سے اڑ جاتی ہے اسی طرح جب
 آفتاب حقیقت کا ظہور ہوگا تو ممکنات کی شبنم میں نم باقی نہ رہے گی، توحید کی بھی
 بہار اور خزاں ہے یعنی بہار خلد دائمی بہار تو تیری ہے اور میری جانب سے خزاں
 عدم۔

لے رہو اگر ز خویش غافل باشی سرگشتہ ترا از راہ بمنزل باشی
 چوں گوہر اگر بضبط خود پردازی در دریا ہم مقیم منزل باشی
 اے سالک اگر تو اپنی خودی سے غافل خود شناس نہیں تو منزل پر پہنچ کر بھی
 تو اسی طرح سرگشتہ رہے گا جیسے ”راہ“ دور دراز ہے اور اگر گوہر کی طرح مجھے جمعیت
 حاصل ہے تو دریا میں رہتے ہوئے بھی تو ساحل پر مقیم ہے۔

حال است بمستقبل اگر و ارسی امروز شمار می چو بفردا برسی
 عقبی دور از وجود مردم دنیا است دنیا باشد و می کہ آنجا برسی
 جب تو ”کل“ تک پہنچے تو وہ حال ہی ہوگا۔ مستقبل تو اسی وقت تک
 ہے جب تک حال نہ ہو اور تیری وہاں تک رسائی نہ ہو، جب رسائی ہوگی، تو
 مستقبل حال ہوگا، اہل دنیا سے اسی طرح عقبی دور ہے لیکن جب تو عقبی میں
 پہنچے گا تو وہ دنیا ہی ہوگی۔

اے جو ہر ہوش محرم راز بر آ زندانہ نذر ہد مگر پرداز بر آ
 عالم ہمہ یک مسخو ریش و فشاں است از سلسلہ نخلت ایں ساز بر آ
 جو شخص ہو شمند محرم راز ہے اسے زندانہ اس ریا کاری سے باہر نکھنا چاہئے جو
 زند نمائش کر رہا ہے، ایک دنیا ریش و فشاں کی مسخرہ ہے، تو اس ساز و سامان نخلت
 کے سلسلہ سے باہر آ،

ہم صحبت شیخ شومقامات آموز باز اہد انس گیر طامات آموز
 اے حرص بزرگیت سرو برگ خیال چیزے ز فسو نہائے کرامات آموز
 لوگ جو پیران خانقاہ کے مرید ہوتے ہیں یاورد و وظائف میں مشغول رہتے
 ہیں اور ریاضت میں جان کھیتے ہیں تو تحت الشعور ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ
 لوگ انہیں بزرگ سمجھیں، ان کے لئے مقامات و طامات کافی نہیں، کچھ کرامات
 کا جادو بھی سیکھنا چاہئے۔

کبر و حسد کہ مردم اندوختہ اند باید فہمید از کہ آموختہ اند
 شیطان عمر سیت مُردہ و مقتدیاں با ہم شمع مزا دیش افروختہ اند
 یہ کبر و حسد جو لوگوں نے دلوں میں جمع کر رکھا ہے چانا چاہئے کہ کہاں سے
 سیکھا ہے شیطان تو عرصہ ہوا مر گیا۔ اس کے مریدوں نے اس کی قبر پر
 مل جل کر دیا جلار کھا ہے۔

بیدل در معرض کمالات بیاں بمعنی ہزل نموسی نقصاں
 در انجن قدر حق ہم زیں رنگ بے مصلحتے نیست ظہور شیطاں
 جو شخص کلام میں اپنے کمالات کا اظہار کر رہا ہو اگر کبھی ہزل گو بھی ہو تو یہ
 کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اسی طرح شیطان کا
 ظہور بھی بے مصلحت نہیں ہے، یعنی ہزلیات شیطنت تو ہے مگر یہ بھی بے
 مصلحت نہیں۔ بیدل کے کلام میں ہزلیات کا حصہ کمتر ہے، چند اشعار ہیں
 جن میں وہ اہل مذاہب کے توہمات کا مضحکہ اڑاتا ہے، مثلاً شاہ عالمگیر کے

سیدل

عہد میں داڑھی کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لئے بھی کہ عہد اکبری میں لوگ اس سے فارغ البال تھے۔ بیدل کہتا ہے کہ ”جزیشم نبود کہ کاہید و فرود“ آخر یہ بال ہی تھے، بڑھے تو کیا اور گھٹے تو کیا، اسی طرح زیارت قبور اور پیر پرستی کی مذمت کرتا ہے، بات یہ ہے یہ تو ہمت جن کو جزو دین سمجھا گیا ہے اسی لائق ہیں کہ ہزلیات میں ان کا مضحکہ اڑایا جائے، وہ خود ایک غزل کے مقطع میں کہتا ہے کہ آج دین تو یہی ریش و فش ہی ہے ”ملت و کیش چہ معنی دارد“ مذاہب کے بارہ میں لکھتا ہے کہ سب را ہیں، منزل سے دور، ”مذہب“ مشتق ہے ”مذہب“ سے، معنی چلنا، مذہب کے معنی ”روش“۔ یہ را ہیں ہی ہیں، جو لوگوں نے اختراع کر رکھی ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اصل راہ اتنی ہی ہے جتنا مرثاں کا باہمی فاصلہ، ذرا مرثاں اٹھا کر دیکھو تو تمام کائنات تاحد نظر اس کے آغوش میں آ رہے گی، لیکن اہل غرض نے ان راہوں کو اتنا دور و دراز اور دشوار گزار بنا رکھا ہے کہ منزل پر پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

بے قطع نقص منزل آسائش کو تارہ باقیست رفتنی در پیش است
 تامل و برا خلاق نہد کردارش باید ز دم تیغ کشیدن عارش
 کارے کہ تبسمش سرانجام دہد بر چین جبین نیلغنی ز نہارش
 اگر انسان اخلاق حسنہ میں اپنے اعمال ڈھالے تو مناسب نہیں کہ تلوار کا دم بھرے یا اس سے کام لے، جو کام خندہ پیشانی سے خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام ہو سکتا ہے وہ تیور چڑھانے سے کیوں ہو، تلوار اور تیور کی صورت ملتی جلتی ہے،

گروست رسیست ز رمدارید درینغ ایبے شراں نمرمدارید درینغ
 تاہمت خست نکشد بہمت ہما اخلاق ز یکدگرمدارید درینغ
 اگر خدائے توفیق عطا فرمائی ہے اور تمہارے ہاتھ سخاوت سے کشادہ ہیں تو جو بے زر ہیں ان کو زردو، جو بے شرم ہیں ان کو شردو، شرم کسی بار و درخت

ہی میں ہوگا۔ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ اہل سخاوت سے کام لیں اور ایثار کریں اس لئے کہ تمہاری ہمت بخل کی تہمت سے متہم نہ ہو ایک دوسرے سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے تو بہت مناسب ہے۔

بیدل دار و زلیخا اہل ہمت آثار سخا بجلوہ چندیں صورت
برنجبراں پند و محتاجاں سیم بر خورداں لطف با بزرگان خدمت
اہل بخود و سخا کی طبیعت سے داد و دہش کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے جو بے خبر ہیں ان کو پسند و نصیحت سے خبردار اور متنبہ کیا جاتا ہے، چھوٹوں کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہیں اور بزرگوں کی خدمت اور احترام کرتے ہیں۔

آوازِ کریم را "صلا" می خوانند سائل چودم زند دعا می خوانند
یک نغمہ شوقِ قسمت چہ فقر و چہ غنا کز پردہ ہر ساز جدا می خوانند
ایک تو اہل کرم غنی ہیں دوسرے فقیر بینو سائل، اہل کرم جب آواز سخاوت سے بلاتے ہیں تو اصطلاح میں اس کو "صلا" کہتے ہیں، فقیر کو جو کچھ ملتا ہے تو جو الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہیں اس کو دعا کہتے ہیں، اصل میں صلا اور دعا کا مفہوم ایک ہی ہے، دونوں فقر ہو یا غنا ایک نغمہ شوق ہی ہے.....
..... مگر ہر ایک ساز کے پردہ سے نغم اور مدھم سروں کی بلندی و پستی ہی کا فرق ہے، سر یا آواز بہر حال ایک ہی ہے۔

اندیشہ بخل از یقین مجبور نیست با خلق حسد فیض معنی دور نیست
بر خویش ستم روا ماراے غافل چشمے و اکن کہ تنگ چشمی کو رست
بخل ایک ایسا مذموم فعل ہے جس کو یقین یعنی ایمان اور عمل صالح سے دور کی نسبت بھی نہیں، اور "حسد" جو بخل ہی کی ایک شاخ خاردار ہے یا میوہ تلخ ہے فیض معنی سے لگا نہیں کھاتا، حقیقت یہ ہے کہ بخل اور حسد لپٹے ہی نفس پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں تو نظر آئے گا کہ تنگ

چشمی اندھا پن ہی تو ہے۔

ایس سنگ دلاں خاک سیاب بچشم یکا شک ندیدہ شرم اجاب بچشم
مخاند بدوق خست آرائیہا چوں آئینہ نان در بغل و آب بچشم

بخیل نہایت سیاہ باطن سنگ دل ہوتا ہے، ذیوی اسباب یہی خاکِ حول ہے جو اس کی آنکھوں میں پڑتی ہے، دوست تنگی کی وجہ سے پریشان حال ہوں اور مارے شرم کے دست سوال دراز نہ کریں، یہ ان کے حالات دیکھتے ہوئے بھی نہیں پیچھے، کتنی بے آبروان کی آنکھیں ہیں کہ ابدیدہ نہیں ہوتیں، خست کی صورت جس میں یہ محو ہیں آئینہ کی طرح ہے نان تو بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور آنکھوں میں آب ہے۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، آب و نان دونوں آئینہ میں ہیں، نان بغل میں اور آب آنکھوں میں، مگر یہ نان ایسا ہے کہ اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرا بلکہ خود بخیل اپنے آپ سے بخل کرتا ہے، آب وہ ہے کہ اس سے کسی کی پیاس نہیں بجھتی، خست آرائی میں بخیل محو ہے۔

ساز و حشت حقیقتے ساکن نیست ظاہر ہر خید پر زند باطن نیست
گوہر و جہاں گنجت و گونوں گرد حرفیکہ بخاموشی رسد ممکن نیست

ذیوی ساز و سامان و اسباب محسوس ہو رہا ہے اور ”ظاہر“ ہے۔ اس کے لئے دوڑ دھوپ و حشت ہے، اضطراب ہے، جو ”سکون“ کی ضد ہے سکون ”باطن“ میں ہے، انسان فطرتاً سکون کا طالب ہے۔ لیکن اس ظاہری اسباب کی فراہمی سے جمعیتِ دل، اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر دو جہانوں کی خاک چھانو اور اس موضوع پر گفتگو کرنے و وہ بات جو ”خاموشی“ سے حاصل ہو سکتی ممکن نہیں اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر عالم صورت ہے اس میں جو اصل معنی یا حقیقت ہے وہ ان صورتوں کی چھان بین سے نہیں ملے گی۔ اہل فکر انہیں نظر انداز کرتے ہیں اور اس حقیقت کو خاموش فکر سے پالیتے ہیں، یہ بات قیل و قال مدرسہ اور بحث و مباحثہ سے حاصل نہیں ہوتی جو محض دردِ سر

اور وحشت ہے۔

”ناپرخ بساط ثابت فیسا راست خاموشی مرکز و سخن پرکار است
بے تخم بود و دیدن ریشہ محال یعنی بے نقط سیر خط دشوار است
جب تک آسمان پر تاروں اور ستاروں کی بساط بچی ہوئی ہے، تارے اپنی
جگہ سے حرکت نہیں کرتے جیسا قطب تارہ ہے، ستارے گردش کرتے ہیں، جیسے
مریخ و زحل و مشتری وغیرہ، مگر یہ سب ایک مرکز کے گرد گردش کرتے ہیں اور
مرکز قائم اور ثابت ہے ہمارے نظام شمسی میں سورج مرکز ہے۔ اسی طرح
”خاموشی“ مرکز ہے اور ”سخن“ پرکار کی طرح اس کے گرد گردش کر رہا ہے، یا یہ
کہو کہ بیج مرکز ہے اور ”ریشہ“ جوشاخوں وغیرہ میں نشوونما پاتا ہے اسی ”تخم“
سے وابستہ ہے۔ اس لئے مرکز نقطہ ہے اور اس کے گرد خط کی گردش ہے۔
جب تک نقطہ نہ ہوگا خط بھی نہ ہوگا۔ یہ مرکز یا نقطہ وحدت ہے اور خط کثرت
نقاط سے ہی بنتا ہے، جب تک نقطہ وحدت کی طرف رجوع نہ ہو کثرت کی
حقیقت منکشف نہ ہوگی۔ ریاضی میں ”نقطہ“ وہ ہے جس کا نہ طول ہو نہ عرض
یہ اقداران خطوط میں ہیں جن سے مختلف شکلیں مثلث و مربع وغیرہ بنتی ہیں۔
اس لئے اس عالم صورت کی قدر و قیمت اگر کچھ ہے تو اس حقیقت کی دی ہوئی
ہے جو ”وحدت“ ہے۔

”تا از ما و منت پیشانی نیست جمیعت آبرویت از رانی نیست
ضبط نفست قدرت تسخیر ہواست تسخیر ہوا غیر سلیمان نیست
یہ من و تو کے امتیازات نے جو مجرب میں شور و شر برپا کر رکھا ہے اگر تیرا
دماغ اس سے پریشان اور تجربہ کے بعد تو پشیمان نہیں ہوتا تو یہ سمجھ کہ وہ آبرو
جو جمیعت دل یا اطمینان قلب کی ہے سستی نہیں پڑتی۔ ”ضبط نفس“ سے مراد
ہوا ہوس کو مسخر کرنا ہے، یہ قدرت اور طاقت ضبط نفس یعنی خاموشی میں ہے
مشہور روایت ہے کہ سلیمان کے حکم سے ہوا مسخر ہو گئی تھی۔ سلیمان کی قوت

نے ہوا کو مسخر کیا ہوا تھا اگر تو بھی ضبطِ نفس سے کام لے تو تو بھی سلیمان ہے۔
من و تو خود بینی و خود رائی ہے۔

خود بینی و خود رائی در مذہب زنداں نیست
کفر است درین مذہب خود بینی و خود رائی (حافظ)
آں نشاء کل کہ سر بسر آگاہیت در ہر جودش فہور غفلت گاہیت
ہر جا بتا ملش گرہ می کر دیم در رشتہ افہام ہاں کوتاہیت
رشتہ یادھا گا کو اگر گرہ پر گرہ دیتے جائیں تو اس کا طول کم اور کتر ہوتا
جائے گا۔ بیدل نے اس تخیل سے حکیمانہ بات یہ پیدا کی ہے کہ کل تو سر بسر آگاہی
اور شعور ہی ہے کہ ہوا رہے لیکن اس کا ہر ایک بجز غفلت کا مقام ہے جب
ہم اس میں تامل یا فکر کرتے ہیں تو اس میں گرہیں ڈالتے جلتے ہیں یہی فہم کی
کوتاہی بن جاتی ہے، بوقتِ تامل جب ہم سر بزانو ہونے ہیں تو گرہ کی صورت
پیدا کرتے ہیں، یعنی جو حقیقت بالبداہت ثابت شدہ ہے اس میں استدلال
عقلیہ سے الجھن پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے حکماء کا کسی نظریہ پر کبھی اتفاق نہیں لیکن
انبیاء و رسل ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں، وہ ایک ہموار راستہ پر چلتے
ہیں اور اہل عقل ناہموار راستہ پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ہر جا ستیہ بر دل شاد و رسد از دست شعور زحمت ایجاد رسد
بر بند دینے چشم ز تمیز و خواب امید کہ غفلتے بفریاد رسد
کسی پر ظلم و ستم ہو رہا ہو اور فریاد کر رہا ہو تو فریاد رس بھی کوئی ہونا چاہئے۔
بیدل نے اس سے ایک بات پیدا کی ہے کہ یہ شعور ہی ہے جو زحمت ایجاد کر رہا ہے
اس لئے دل نا شاد پر جو ستم ہو رہا ہے وہ اسی کے ہاتھوں ہو رہا ہے، آنکھیں موند
لے اور سو جا، امید ہے کہ غفلت سے کچھ فریاد رسی ہو جائے گی۔

دور ہر را ہے کہ مقصد امی ایستد پیرو بے اختیار و امی ایستد
سیلاب ہر کجا سرش خور و بسنگ ہر موج کہ باشد بقفای ایستد

جس راستہ پر رہنا چلتے چلتے رک جائے تو پیرو خود بخود رک جائیں گے، سیلاب بہتا ہوا اگر پتھروں سے ٹکرائے تو اس کی لہریں پیچھے کی طرف بہتی ہیں۔ بیدل کی رباعیات بلکہ تمام کلام میں اس کے مشابہات ہی کا مذکور ہے، وہ ان سے اخلاقی نتائج پیدا کرتا ہے اور موزوں لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

ہر کس مضمون عافیت می داند از سطر نفس درس فنا می خواند
راحت می خواہی از خاموشی گذر کایں وضع بوضع نیستی می ماند
عافیت، راحت، سکون و اطمینان قلب کے مضمون سے جو بھی واقف ہے نفس کی آدورفت سے درس فنا پڑھ رہا ہے، سانس ہر ایک دم میں فنا ہوتا ہے مگر جب تک زندگی ہے یہ سلسلہ آدورفت جاری، ایک دم چین سے بیٹھنا قبر میں ہی نصیب ہو گا، گفت و گو یا حرف و صورت اسی سانس کے رشتہ سے وابستہ ہیں، اگر تو راحت چاہتا ہے تو وہ خاموشی میں ہے۔ یعنی اس سانس سے اضطراب حرف و صوت دور کر دے چونکہ راحت کامل نیستی میں ہے خاموشی کی وضع اسی نیستی سے ملتی جلتی ہے۔

اے محرم موج و طیش آموختنش غیر از کف پوچ چہیست اندوختنش
غافل مشوار تامل وضع صدف چیزے دار دلبار سخن دوختنش
بحر تحقیق میں اہل فکر ہی غوطہ لگاتے ہیں، اور سطح بحر پر موج اور کف ہرزہ نوا ہیں۔ اگر انہیں جمع کیا جائے تو کیا حاصل ہو گا۔ صدف کو دیکھو کہ اس کے دونوں لب ملے ہوئے ہیں اسی خاموشی میں ایک قیمتی شے ہے، معنی دار دیکھو کہ درگفتن نمی آید، یہ گوہر ہے۔ یعنی اہل فکر تامل سے گوہر مقصود پالیتے ہیں اور فکر خاموشی سے وابستہ ہے، جو لوگ منہ کی بکواس اور قلم کی گھیس گھیس میں مشغول ہیں وہ سطح پر موج و کف کی طرح مضطرب اور پریشان حال ہیں لیکن کامل سکون خاموشی سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

تا شور نفس پرور ما و من است ہر منظر افگنی جنوں انجمن است

بیدل

اوہام گرفتست جہات امکاناں جمعیت کو گوشہ دل ہم سخن است
 شور نفس سے ماومن کی پردہ دری ہو رہی ہے جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو
 جنون نے انجمن آرائی کی ہوئی ہے بخشش جہت امکانی توہمات کی گرفت میں
 ہیں۔ اطمینان قلب کسے نصیب دل کے گوشے باہم ہم سخن ہیں، کوئی خیال
 دل میں بے حرف پیدا نہیں ہوتا۔

تا فضل و ہنر آئینہ پرداز نشد اقبال درش بروے کس باز نشد
 فولاد برآہن شرف از جو ہر یافت بے علم بجنس خویش ممتاز نشد
 جب تک کسی شخص کے فضل و ہنر کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوتا تب تک
 وہ مقبول عام و خاص نہیں ہوتا، لوہا اور فولاد ایک ہی شے ہے۔ جو ہر دونوں
 میں ہے لیکن لوہے میں پوشیدہ ہے اور فولاد میں نمایاں اس لئے فولاد کو
 لوہے پر فضیلت دی گئی ہے، ہر ایک شے اپنی جنس میں ممتاز درجہ حاصل
 نہیں کر سکتی جب تک اس کا جو ہر علم ظاہر نہ ہو یعنی وہ خواص و حقائق، جو
 اس میں پوشیدہ ہیں جب تک ظاہر نہ ہونگے گراں قدر نہ ہوگی۔

بیدل زیبا طوہر وحشت انگیز گریاے ہست سربروں آرو گریز
 آوارہ یاس پیش ازیں نتوان نیست جانے بلشینی کہ نگوید بر خیز
 اس دنیا کے درد و یوار سے وحشت ٹپکتی ہے اگر تیرے پاؤں ہیں تو سر پر
 رکھ کر بھاگ، جو زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اس کا جینا اور مرنے برابر ہے ایسی
 جگہ جا کر بیٹھ جا کہ کوئی نہ کہے کہ اٹھ، ایسی کونسی جگہ ہے؟ ”آثار قدیمہ“ والے
 مردوں کی ہڈیاں بھی اکھاڑ رہے ہیں، ”اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے،
 مر کے بھی چین نہ پایا تو کہہ جاؤ گے، یہ بھی مقام عبرت ہے کہ قبریں انہی کی
 اکھڑ رہی ہیں جو اغنیاء تھے، مرنے کے بعد بھی اپنی آرام گاہ کی آرائش و
 زیبائش کا خیال نہ چھوٹا۔

غالب کہتا ہے کہ

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں
 بیٹھے ہیں رہ گزریہ ہم کوئی، ہمیں اٹھائے کیوں
 غالب نے رہ گزرا یہی جگہ تصور کی ہے جہاں سے کوئی اٹھا نہیں سکتا
 حالانکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں چلنے پھرنے والے ٹھکراتے ہیں، اور کچلتے ہیں۔
 بیدل بر خلق کسر شاں نمنائی تاثیر تو اس شدن کماں نمنائی
 خاصیت ایں معرکہ عاجز کشتی است ایں جا ز نہار نا تو ان نمنائی
 اس گیر و دار دنیا میں جو معرکہ آرائی ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ زبردست
 کمزور کو دباتا ہے، اور کمزور کچلا جاتا ہے اس لئے اس عاجز کشتیِ خونخوار دنیا
 میں جس شخص نے اپنی کمزوری کا اظہار کیا اسے کچل کر رکھ دیں گے۔ اس لئے
 کبھی یا تو سرے سے کمزور نہ ہونا چاہئے، تو انائی پیدا کرنی چاہئے مقابلہ کرنا
 چاہئے، یا اپنی کمزوری دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دو، ورنہ مارے جاؤ گے۔



دیوان بیدل

فارسی شاعری میں شعر کی اصناف تو بہت ہیں، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مگر غزل کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی کا حصہ نہیں، اور یہی زبانِ زو خلّاق ہے۔ غزل کا موضوع بھی مختلف ہے۔ عشقیہ اور صوفیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے، تصوف دراصل فلسفہ نظری اور عملی ہے، تصوف میں عشق بھی کار فرما ہے جسے عشق حقیقی کہتے ہیں، بیدل نے تمام اصناف شعر میں بہت کچھ لکھا ہے، سہر دست، ہمیں غزلیات کا جائزہ لینا ہے، مناسب تو یہ تھا کہ ہم ہر ایک غزل سے دو دو تین تین شعر منتخب کر کے ان کا مفہوم اردو میں بیان کرتے۔ لیکن بقول غالب اس بحر بکراں میں شناوری کون کر سکتا ہے، حروف ”ت“ اور ”د“ اور ”میم“ وغیرہ کی ردیف میں بیدل نے جتنی غزلیں لکھی ہیں فردا فردا ان کی تعداد اکثر شعرا کے دیوان اور کلیات کے اشعار سے بڑھ کر ہے، سہر دست ہمارے مد نظر بیدل کا شاعرانہ تخیل بھی نہیں، صرف حکیمانہ تفکر ہے۔ لیکن بیدل نے دونوں کو اس ہنرمندی سے جمع کیا ہے کہ حکمت کی خوبی اس کے حسین کلام میں اہل نظر مشاہدہ کریں تو ان کو جدا کرنا مشکل ہے۔ پہلے ہم بیدل کی غزلیات سے وہ شعر انتخاب کرتے ہیں۔ جن میں اس نے خودی اور بخودی، امروز و فردا، دنیا و عقبی، آزار اور آسائش

بالخصوص ہستی کی گنتی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

آج تک جو کچھ حکماء نے لکھا ہے وہ جتوئے حق ہی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے پاس کوئی معیار حق بھی ہے یا دریافت ہو سکتا ہے۔ قرآن عظیم نے شروع میں ہی معیار پیش کیا ہے کہ ”ذالک الکتاب لاریب فیہ“ وہ کتاب کائنات یا صحیفہ فطرت ہے جس میں کوئی الجھن نہیں اور الجھن ہی کا نتیجہ شک و شبہ ہوتا ہے اور اس ذہنی حالت میں قوت فیصلہ تذبذب میں آ رہی ہے۔ بیدل نے نکات میں بھی یہی کچھ لکھا ہے کہ جو کچھ اشیاء محسوسہ معینہ مشخصہ کے سوا نظر آئے سب سودا ہے۔ اس لئے جو کچھ بصر و بصیرت سے مشاہدہ ہو رہا ہے اور سب ایک ہی طرح مشاہدہ کرتے ہیں حق ہے۔ انسان پر کیا موقوف ہے حیوانات بہ لیل و نہار میں اختلاف جو کچھ ہے فطرتاً محسوس کرتے ہیں، دن کے وقت فکر معاش ہے تو رات آرام کے لئے ہم چہار غنصر اور نکات کے تحت بیدل کے نظریہ تحقیق پر بحث کر چکے ہیں، شنوی عرفان وغیرہ میں وہ اس امر کی تصریح بھی کرتا ہے کہ کائنات کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مختلف صورت ہوگی کیونکہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کل پر حاوی ہو اس لئے اگر کسی نے ہر ایک شے پر تغیرات وارد ہوتے اور آخر فنا ہوتے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا پیچ ہے اور اس لئے ”اے پیچ در فکر پیچ پیچ“ تو جہاں تک اس کا مشاہدہ ہے یہ نتیجہ بھی صحیح ہے، اس طرح اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ہی شے کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یعنی کسی شے کے جزو کو دیکھتے ہیں، کل نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کل کے احکام و آثار سے واقف ہیں، ہمیں ایک ذرہ کے بھی حقائق کا کلمہ علم نہیں۔

انسان طبعاً ”راز جو“ واقع ہوا ہے۔ ”راز جوئی“ کی عادت اوائل عمر میں نمایاں ہوتی ہے، بچے عموماً بڑے بوڑھوں سے چند و چہ و چوں دریافت

کرتے رہتے ہیں، بلکہ بعض اوقات بڑے بوڑھوں سے جواب بن نہیں آتا، وجہ راز جوئی یہ ہے کہ نو عمری میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے دنیا اور عجیب ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ جب اس ماحول کو جس میں ہماری پرورش ہوتی ہے عادتاً دیکھتے رہتے ہیں تو اس میں کوئی بات جاذبِ دل نہیں رہتی اور راز جوئی کا جذبہ بھی سرد پڑتا جاتا ہے۔ لیکن بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو راز جوئی کی طرف ہمیشہ مائل رہتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخر میں ”محقق“ کہلاتے ہیں انہی میں ایک بیدل بھی تھا، اس کے کلام میں ابتدائی تحریک تحقیق کا بھی مذکور ہے، چنانچہ دو مسلسل غزلوں کا یہی موضوع ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

صبح از چہ خرابات جنوں کرد بہارِ ش

کا فاق گرفتہ است بغمیازہ خمارِ ش

اس شعر میں دو مشاہدات کو یک جا بیان کیا گیا ہے، جب نیند کے ماتے صبح اُٹھتے ہیں تو انگڑائی لیتے ہیں اور بادہ شبانہ کا نشہ جب اُترتا ہے تو خمار کی وجہ سے بادہ خوار انگڑائی لیتا ہے، شاعرانہ تخیل یہ ہے کہ صبح رات بھر تو میخانہ جنوں میں متوالی رہی، یعنی یہ سیہ مست تھی، اب انگڑائی میں اس نے تمام آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ صبح کس خرابات جنوں میں رنگ ریاں مچاتی رہی کہ اس کی انگڑائی نے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ بیدل کے اکثر اشعار کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کا مفہوم نشر میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک ذہنی کیفیت ہے اور شعر کی خوبی بھی یہ ہے کہ نشر میں ادا نہ ہو سکے۔

دوسری غزل کے چند اشعار یہ ہیں:-

چنیں کشتہ حیرت کیستم من

کہ چون آتش از سوختن زیستم من

میں کس کا کشتہ حیرت ہوں کہ آگ کی طرح جل رہا ہوں مگر میری

زندگی بھی اس جلتے میں ہی ہے، آگ اگر نہ جلے مُردہ ہے، اور جب تک جلتی رہے زندہ ہے۔ میں کشتہ معیرت بھی ہوں، حیرت نتیجہ ہے لاعلمی کا، یعنی ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ کیا مشاہدہ کرتے ہیں اس لئے حیرت میں آ رہتے ہیں، باوجود اس امر کے کہ میں کشتہ معیرت ہوں مگر زندہ بھی ہوں اور میری زندگی آگ کی طرح ہے کہ جب تک مسلسل جلتا ہوں زندہ ہوں اگر ایک دم ٹھنڈا پڑ جاؤں تو خاکستر ہو کر رہ جاؤں گا، اگر یہ لفظ "حسرت" ہو تو معنی ایک ہی ہے۔

نہ شام نہ محزون نہ گردوں نہ خاکم

نہ نظم نہ مضمون نہ معنیتم من

ہر ایک شے ایک خاص حالت میں نظر آتی ہے۔ مگر میری عجیب حالت ہے کہ کسی ایک حالت کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ "نہ شام نہ محزون" نہ تو میں ایک ہی حالت شادی میں اور نہ ایک ہی حالت غم کی تصویر ہوں، بلاشبہ یہ تمام حالات مجھ پر وارد تو ہوتے ہیں مگر عارضی ہیں، میری فطرت کے نزدیک بیگانہ سے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ میں نہ آسمان ہوں اور نہ زمین اور نہ عبارت کا مضمون اور لفظ و معنی۔

اگر فانیم چہیست ایں شور ہستی

وگر باقیم از چہ فانیتم من

اگر میں فانی ہوں تو ہنگامہ ہستی کیا ہے، اور اگر میں باقی ہوں تو مر کر فانی کیوں ہوتا ہوں۔

غالب مرحوم نے بیدل کی دونوں غزلیات کی ترجمانی بھی خوب کی ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اسی غزل میں "ابر کیا ہے اور ہوا کیا ہے" وہی چہ و چوں دہرا ہے تحقیق

کی بنیاد ہے۔ شعر ہے کہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ لے خدا کیا ہے
غالب نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ موجود صرف "ذات واحد" ہے، اس لئے
ہستی میں یہ شور اور ہنگامہ کس لئے اور کس کا برپا کیا ہوا ہے؟ ایک سوال اٹھایا
ہے مگر جواب نہیں دیا، جواب مخاطب پر چھوڑ دیا ہے، ظاہر ہے کہ ہنگامہ میں
ایک سے زیادہ شخصیتوں کی شرکت واجب ہے، ایک سے زیادہ موجود ہی
نہیں۔ بیدل نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر میں فانی ہوں اور فانی سے شور ہستی کا
ظہور ناممکن ہے تو پھر یہ ہنگامہ آرائی کرنے والا کون ہے جو موجود ہونا چاہئے،
اگر میں موجود ہوں تو میرے ساتھ یہ فنا کا دم چھلا کیسے اور کیوں لگا ہوا ہے،
اس کا جواب اسی غزل میں دیتا ہے کہ

بنا زائے تخیل، ببال اے تو ہم
کہ ہستی گماں دارم و نیستم من،

یہ تخیل اور تو ہم کا کرشمہ ہے کہ گمان ہستی اپنے لئے کرتا ہوں مگر حقیقت
یہ ہے کہ "نیست" ہوں، غالب نے چہ و چند و چوں کا تخیل تو بیدل ہی سے
لیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ شیخ فضل اللہ المعروف قاضی شیخ جمال الدین جمال
دہلوی کے ایک مطلع کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔

لے از جمالت این ہمہ غوغا برائے چلیست

چوں جملہ حسن نئست تماشا برائے چلیست

شیخ جمال کی کبوتر نات تھی۔ دہلی میں عہدہ قضا پر عہد اکبری میں
ما مور تھے، ۹۴۲ھ میں وفات پائی، حاجی بھی تھے اور اپنے زمانہ کے
اکثر علماء و حکماء سے ملنے والے بھی تھے، چنانچہ ملا جلال دوانی صاحب خلاق
جذالی سے مراسم دوستانہ بھی تھے، آپ کا ایک شعر بہت مشہور نعت میں ہے۔

موسى زہوش رفت بیک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در شب

بیدل نے بھی ایک رباعی میں قاضی صاحب کے فتاویٰ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ”حق را قاضی جمال نتوان فہمید“ قاضی جمال نے مطلع میں اس سوال کا جواب کہ ”تماشا برائے چلیست“ اور ”غوغا برائے چلیست“ بظاہر لفظوں میں نہیں دیا مگر جواب مطلع میں اشارہ یہ ہے کہ ”برائے من و تو“ ہے بیدل کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہر کراہیجا میرسد بے اعتدالی می کند
شمع ہم در بزم مستان شیشہ خالی می کند
ایک شعر ہے۔

درس دانش ختم کنن کا ئیند دار سیم زور
زنگی مکروہ را ملا جمالی می کند
ملا جمال کبوتر کا رنگ رد سیاہ تھا اور شاہی ملازم شاہی خزانہ سے تنخواہ لیتے چاندی سے ہاتھ اور زر سے دل سیاہ ہوتا ہے۔
تلمبے شبہ پرست حق و باطل بودن
مردایں محکمہ آنست کہ قاضی نشود

نواب شکر اللہ خاں کا ذکر ”چهار عنصر“ کے تحت ہم کر چکے ہیں۔ ان ایام میں سخن فہمی اور سخن گوئی بھی قابلیت کا ایک معیار تھا۔ ہر ایک صاحب سیف صاحب قلم بھی تھا۔ عہد اکبری سے آخری تاجدار مغلیہ کے دور تک اکثر امراء و زرا بھی ادیب اور صاحب دیوان تھے، ”مائثر جمعی“ اور دیگر تذکروں میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے۔ شکر اللہ خان سپہ سالار بھی تھا اور ادیب بھی، تذکرہ مرآۃ الحیال امیر شیر علی خاں لودھی نے لکھا ہے اس میں بیدل اور ہم عصر شعرا کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک دن نواب شکر اللہ خاں کے ہاں مجلس شعر و سخن گرم تھی۔ ناصر علی سرہندی اور بیدل بھی موجود تھے۔ بیدل نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع ہے۔

بیدل

نہ شد آئینہ کیفیت ما ظاہر آرائی

نہاں مانیدم چوں معنی پچندیں لفظ پیدائی

مفہوم شعر تو یہ ہے کہ اگرچہ لفظوں کی صورت میں معنی کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن میں یا میری حقیقت کا اظہار کسی صورت میں نہ ہوا۔ ناصر علی نے کہا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ پیدا ہوا تو ابستہ معنی بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ معنی تابع لفظ سمجھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی لفظی حیثیت سے کچھ زیادہ نہیں لیکن ”من“ کی ماہیت کسی لفظ سے منکشف نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ”حقیقت انسان“ باوجود کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت پوشیدہ ہی رہی، ناصر علی نے خوب داد دی۔

شبنمی ”عرفاں“ میں بیدل کہتا ہے کہ جب میں نے تحقیق شروع کی تو آخر

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جان نیست

نہاں در ہر کف خاک کے جہان نیست

مجھے یقین ہو گیا کہ ہر ایک قطرہ میں جان ہے، اور ہر ایک ذرہ ایک

جہان ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ایں دل حیرت سرا از نقش قدر ہوا پر است

ذرہ از سامان بہر و قطرہ از دریا پر است

کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد

کدام ذرہ کہ طوفان آفتاب ندارد

ہمارے زمانہ کی علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک ذرہ میں

کامل نظام شمسی موجود ہے، اور ہر ایک قطرہ میں دریا موجزن ہے۔ بصرو

بعیترت سے نقوش ان اشیاء کے اور ان کے خالق ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، قلب انسانی ایک آئینہ ہے اور حیرت سرا ہے۔ نہ تو اشیاء آفاقی اور نہ ان کے نقوش یا تصورات ذہنی ہمارے پیدا کردہ ہیں، بیدل اکثر اشعار میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا وہی خالق کائنات ہے اور ایک ہی ہے۔

بہر حال معیار صداقت بھی صحیفہ کائنات ہے، لیکن بیدل ایک خاص بات بھی کہتا ہے اور یہی اس کی اپنی تحقیق ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق حرف آخر نہیں جیسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ محقق کی اپنی حد نظر ہے۔
ہر کس ایس جا از مقام و حال خود گوید خبر
از زبانم حرف او گر بشنوی باور ممکن

ہر ایک محقق کا نظریہ جسے وہ اپنی تحقیق سے تعبیر کرتا ہے خود اس کے حال اور مقام کا پتہ دیتا ہے کہ اس کے ذہن کی رسائی اس حد تک ہے۔ اسی طرح اگر میں یا کوئی اور کسی کی نسبت جو اس کا غیر ہے یہ کہے کہ وہ ایسا اور ایسا ہے تو باور نہ کر مطلب یہ ہے کہ نہ ذات معلوم کرنا محال ہے۔ ذات کی نسبت جو کچھ حکماء نے آج تک کہا ہے وہ ان کا اپنا نظریہ ہے اور بس۔ البتہ ہر ایک نظریہ کی بلندی اور پستی کا اندازہ اسی نظریہ کی بلندی اور پستی سے ہو سکتا ہے۔ ایک رباعی میں بوضاحت لکھا ہے کہ کسی شے کا سایہ خاک پر تار یک ہوتا ہے جو شخص سایہ اس حال میں دیکھ رہا ہے وہ اسے تار یک ہی کہے گا اور سچ کہتا ہے۔ دوسرا شخص اسی سایہ کو پانی میں مثال کی صورت میں دیکھتا ہے اگر وہ اسے مثال سے تعبیر کرتا ہے تو وہ بھی سچ کہتا ہے۔ دونوں کا مشاہدہ اور تحقیق ان کی اپنی حد نظر تک ہے۔ اصل شے سایہ اور خاک و آب و تار یکی و مثال سے باہر ہے اور ان سب سے بے نیاز ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر بیدل کہتا ہے کہ جس حد تک تزکیہ نفس

اور تصفیہ قلب ہو یہ سایہ یا "ظل" اسی حد تک صاف مشاہدہ ہوگا، اس سے بڑھ کر ہم تحقیق کر ہی نہیں سکتے، یعنی اپنی محسوسات معینہ مشخصہ کی صورتوں اور حقائق سے آگاہ ہو سکتے ہیں، اور یہ سب ظل ہی ہے۔ اس موضوع پر بیدل نے مختلف پیرایہ میں اکثر اشعار میں واضح تحقیق دی ہے۔

تنزیہ بے نیاز است از انقلاب تشبیہ

گو برہمن دور وزی محو صنم بردوں آ

تنزیہ تشبیہ کی مثل نہیں ہے تشبیہ خواہ سایہ ہو یا تمثال اس پر ہر آن تغیرات واقع ہوتے ہیں، اور کبھی ایک حال پر اس کا قیام نہیں، لیکن تنزیہ اس انقلاب سے پاک ہے۔ برہمن بت پرستی میں محو ہے تشبیہ اور اس کے انقلاب کا پجاری ہے، اگر وہ چاہتا ہے کہ حقیقت آشنا ہو تو اس تمثال پرستی کو ترک کرنا چاہئے اور اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے جس کی یہ تمثال ہے، یا جس نے یہ تمثال پیدا کی ہے۔

بغیر عکس ندانم دگر چہ خواہی دید

اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

آئینہ خواہ کتنا ہی صاف ہو اس میں تو صرف عکس ہی نظر آئے گا۔

اس لئے جمال یکتا یا حسن و عدت اسی حد تک ممکن ہے۔

پر تو خورشید جز در خاک نتوان یافتن

یک زمین آسمان از اصل نمود و دریم ما

آفتاب کا سایہ خاک ہی پر پڑتا ہے جو انتہائی کثیف ہے، اسی طرح

ہمارے جسد خاکی میں بھی ظل جلوہ فرما ہے، آفتاب تو آسمان میں اور سایہ

زمین پر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنی اصل سے اتنا ہی دور ہیں جتنا عرصہ یا

فاصلہ زمین و آسمان میں ہے۔

چہ ممکن است رود و ارج بندگی زنجیں

زمین فلک شود و آدمی حلا نہ شود

اگر یہ ممکن بھی ہو کہ زمین آسمان بن جائے پھر بھی داغ بندگی جو
ہماری پیشانی پر ازلی وابدی ہے مٹ نہیں سکتا اور یہ ممکن ہی نہیں کہ
آدمی خدا بن جائے۔

مگو ممکن ز حد خویش بگذشت نہ ہو واجب دے ممکن اس گشت

حسن یکتائی و آغوش دوئی وہم است وہم

تا تو از آئینہ می یابی اثر دیدار نیست

حسن یکتائی کو دوئی کی آغوش میں دیکھنا محض وہم محال اندیش ہے،
جب تک تو آئینہ میں اس کا عکس دیکھ رہا ہے یہ سمجھ کہ حسن یکتائی کا
دیدار نہیں ہو گا۔ لیکن

باید از ہستی بہ تمثالے قناعت کردنت

میںہماں خانہ آئینہ بیروں دراست

اس کے سوا چارہ نہیں کہ آئینہ ہستی میں اسی نخل اسی تمثال پر
قناعت کی جائے، خانہ آئینہ میں مہمان کی صورت تو جلوہ گر ہے مگر حقیقت
یہ ہے کہ مہمان خانہ آئینہ کے دروازہ سے باہر ہی ہے، اسی تخیل کو بیدل نے
ایک اور شعر میں بیان کرتے ہوئے ایک اور بات پیدا کی ہے۔

حسن یکتا چہ جنوں داشت کہ از رنگ توئی

خواست بر سنگ زند آئینہ بر بازو دست

اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے اس شعر کو سمجھنا چاہئے۔

کجا ست غیر جز اثبات ذات یکتائی

”توئی“ اور آئینہ وار دُمنی کہ از تو جداست

اگرچہ آئینہ میں تیرا عکس تو ہی ہے مگر تجھ سے جدا ہے، اس لئے تیرا غیر
اعتباری ہے، اس لئے اس کی نفی تیرے ذات کی یکتائی کا اثبات ہے،
اگرچہ تیرا عکس فی الحقیقت تیرا غیر نہیں لیکن اس لئے کہ تجھ سے جدا ہے اسے

غیر کہہ سکتے ہیں، اسی کی نفی سے غرض تیری یکتائی ثابت کرنا ہے،
 کائنات آئینہ ہے اور اس میں ذات کے اسما و صفات جو عکس ذات میں
 جلوہ فرما ہیں، ان کی نفی ”ذات بحت“ کا اثبات ہے، اب مناسب تو یہ
 تھا حسن یکتا کی غیرت اس آئینہ کو پتھر پر مار کر توڑ دیتی مگر میرے سر پہ
 مارا، اس میں تلمیح ہے، اور اشارہ آئیہ کریم کی طرف ہے، کہ ”امانت“ کو پہاڑوں
 پر پیش کیا گیا مگر سموات وغیرہ سب یہ بار امانت اٹھانے کی جرأت نہ
 کر سکے۔ آئینہ سنگ ہی ہے، یا جلا شدہ سنگ آئینہ ہے، اور پہاڑ یہی
 سنگ ہیں، مطلب یہ ہے کہ انسان عقلمند باشعور مخلوق ہے اور یہی
 ”علین“ و ”غیر“ میں تمیز کرتا ہے اس لئے ذات کی شخصیت اور اس کے
 عکس کو ایک دوسرے کا غیر یہی کہہ سکتا ہے۔ اس شعر کا لطف ”چہ جنوں
 داشت“ میں ہے۔ عقل کی نفی جنوں کا اثبات ہے، اور جنوں حسن یکتا
 نے ہمیں دیا ہے۔ بیدل نے اکثر اشعار میں عقل و جنوں پر جسے اصطلاح
 میں عشق سے موسوم کرتے ہیں لطیف بحث کی ہے۔ علامہ اقبال نے بیدل
 کے ایک شعر کی تشریح ”بانگ درا“ میں کی ہے شعر یہ ہے کہ
 باہر کمال اند کے آشفنگی خوش است
 ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

خرد ہر چند نقد کائنات است چہ بنجد پیش عشق کیمیا کار
 اگرچہ عقل کائنات کا سرمایہ ہے اور تمام کائنات میں یہی ایک شے
 قدر و قیمت کی ہے مگر عشق کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہیں، عشق کیمیا
 کار ہے۔ کائنات خاک ہے اس کو زرا اسی کیمیائی عشق سے بنا سکتے ہیں
 عقل ہر ایک شے کو ایک دوسرے کا غیر دکھاتی ہے، عشق کی نگہ میں
 کثرت محو ہو کر وحدت جلو نما ہوتی ہے۔

یہ بحث تو طویل ہے، بیدل نے اکثر اشعار میں مختلف پیرایہ میں یہی تخیل واضح کیا ہے، آئینہ و تمثال کی نسبت کہتا ہے۔

تمثال بغیر از اثر شخص چہ دارد
خوش باش کہ خود را تو نمودن ہنر اوست

یہ شعر نہایت لطیف ہے۔ ہر ایک انسان کو ”انا الموجود“ کا احساس ہے، حالانکہ بقول شیخ سعدیؒ

ایں مدعیان در طلبش بے خبر اند
کا ترا کہ خبر شد خبرش باز نیا مد

موجود تو ایک ذات واحد ہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنی موجودگی کا احساس اس اثر سے ہو رہا ہے جو وجود حقیقی کی تمثال نے ہم میں پیدا کر رکھا ہے۔ یعنی اس کی تمثال ہم ہیں اور یہ جلوہ صفات ہے۔ چونکہ وہ بالذات موجود ہے، اس لئے تمثال کو بھی ”انا الموجود“ کا دعویٰ ہے۔ ذات قائم اپنی ذات میں ہے اور حق مطلق ہے۔ ہم قائم بالحق ہیں۔ اسماء کا قیام مسملی سے اور صفات کا قیام موصوف سے ہے۔ اسی نظریہ کو آفتاب اور سایہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر سایہ یہ چاہے کہ آفتاب تک پہنچے تو ظاہر ہے کہ جہاں آفتاب جلوہ گر ہو گا سایہ محو ہو جائے گا۔ کثرت صفات میں ہے، ذات میں تعدد نہیں۔

صفات ہر چہ بود ذات را تعدد نیست

بفکر لالہ و گل خوں مخور بہار یکست

بہار تو ایک ہی ہے اس کی رنگینی لالہ و گل ہی میں مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے عالم کثرت کا قیام وحدت سے ہے، اگر کثرت کا اپنا وجود ذاتی بھی کوئی ہوتا ”افسوساً“ تو یہ نظم و نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پہوشگی بختِ زد و عالمِ بریدن است

دیدارِ دوست، ہستی خود را ندیدن است

پروازِ سایہ جز بسرِ بامِ مہر نیست

از خودِ رمیدن تو بختِ آرمیدن است

”دو عالم“ سے مراد ”دوئی“

نظر آئے دو عالم جس کو اک عالم یہاں اختہ

سمجھ لیجے بشرِ حول ہے وہ ساریِ خدائی کا

بیدل نے آفتاب اور سایہ کا مضمون مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

یہ شعر بھی لطیف ہے۔

جو ہستی مطلق ز مقید نتواں یافت

اشیا ز ہمہ یکساۓ خورشیدِ نقاب اند

سایہ دراصل وہی آفتاب ہے جس پر ایک نقاب پڑا ہے اس لئے

ہستی مطلق ہی ہے جو مقید میں مشابہ ہو سکتی ہے۔ ہستی مطلق خود تقیبات

سے پاک ہے وہ ازلی اور ابدی مطلق ہی ہے مطلق ہی رہے گی۔ لیکن اس

شعر میں بیدل نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ بطرحِ آفتاب کا سایہ اس خاکدان

پر پڑتا ہے اور لطیف شے کو ہم کثیف ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہستی

مطلق کا مشابہہ مقید ہی میں ممکن ہے۔ خواجہ حافض کا ارشاد ہے کہ

حجاب و پردہ ندارد نگار و لکش ما

تو خود حجابِ خودی عاقل از میاں برخیز

ہزار سایہ ہوں آفتاب پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ البتہ جہاں تک

افسانی مشابہہ کا تعلق ہے ”ذره ابرنا پدید کند“ ”اللہ نور السموات

والارض“ یہ نور چونکہ لطیف ہے ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن سموات اور ارض

میں مشابہہ کر سکتے ہیں سموات اور ارض خود تار یک ہیں لیکن اسی نور سے

ہمیں اشیاء کائنات نظر آتی ہیں ابصار اس نور کے درک سے عاجز ہیں، یہ نور خود ہمارے ادراک کو نہ صرف درک کرتا ہے بلکہ اسی نور سے ہم اشیاء کائنات اور اس نور کی موجودگی کا شعور رکھتے ہیں، اس کی مثال وہی ہے جو سورہ نور میں بیان کی گئی ہے۔ ایک تاریک مکان میں نور شمع مکان اور مکان کی ہر ایک شے کو روشن کر رہا ہے۔ لیکن ہم اشیاء کو تو دیکھتے ہیں اس نور شمع کو جو اشیاء پر پڑتا ہے نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اشیاء بذاتہ روشن ہیں، اب اگر شمع مکان میں نہ ہو تو ہماری آنکھوں میں بھی نور نہ ہوگا اور تمام دنیا جہاں تاریک ہوگی۔
در غلطی کہ باخود رنگی نہ بود مارا

بودیم آنچہ بودیم او و انمود مارا

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ”عرفت ربی بنور ربی“ میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے نور سے پہچانا، ہمیں نور راستہ بہر تائبہ نور شیدہ بیدل کا نظریہ معرفت ہم بیان کر چکے ہیں کہ مثل کو مثل ہی پہچان سکتا ہے، اس لئے اللہ کی معرفت اللہ ہی کو ہے، اللہ کا نور اللہ کا عین ہے، اور اسی نور سے اپنی معرفت ذاتی حاصل ہے، اور یہی نور انسان میں بھی اسے خود شناس بناتا ہے، اس لئے ”من عرفت نفسه فقد عرفت ربہ“ جو خود شناس ہے وہ حقیقت شناس ہے۔

علامہ محمود شبستری ”گلشن راز“ میں بھی یہی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ اگر سورج کو بہنہ آنکھ سے دیکھیں تو اس میں خیرگی اور تیرگی پیدا ہوگی لیکن اگر اس کا عکس پانی میں دیکھیں تو اگرچہ ہم آفتاب کو نہیں دیکھ رہے مگر ایک کیفیت ذہن میں پیدا ہوگی۔

اگرچہ بیدل دیگر صوفیاء محققین کی طرح ”وحدت الوجود“ کا نغمہ سنج ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے جس کا اسے خود اعتراف ہے اور جسے مولانا جامی

نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ
 سر وحدت منطق الطیر است جامی لب بربند
 مجز سیلما نے نشاید فہم ایں گفزار را
 یہ جانوروں کی بویاں کوئی سلیمان ہی ہو تو سمجھے، یہ مسئلہ علم فہم
 نہیں، بہر حال

دوسرا ہر دوسرا میں اور تو کوئی نہیں
 ہستی موبہوم میری یا خدا کی ذات ہے
 مزید بحث ہم بعض اشعار کی شرح کے تحت کرینگے۔ ان مسائل کو
 شرح و بسط سے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ بیدل کا کلام سمجھنے
 میں آسانی ہو، کیونکہ زیادہ تر یہی اس کے کلام کا موہو نوع ہے۔

احروز و فردا | بیدل کا نظریہ زمان و مکان کے بارہ میں یہ ہے کہ تمام
 کائنات ایک ”واقعہ واحدہ“ ہے اور ”حضرت علم
 الہی“ اس خارج معدوم ہے۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ اس گتھی کو ہمارے
 زمانہ کے حکماء نے بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور افلاطون سے لے کر
 آج تک کائنات کے بارہ میں جو کچھ نظریے پیش کئے گئے ہیں ان میں
 دو نظریے نمایاں ہیں، ایک تو یہ کہ کائنات مادی دنیا ہے، اور یہی قدیم
 ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات ایک
 ”قلب“ عظیم کے اندر موجود ہے جس کو ”خیال“ () سے موسوم
 کرتے ہیں اور جسے مادہ کہتے ہیں وہ صرف خیالی صورتیں ہیں، اول الذکر
 حکماء کو مادہ پرست اور مؤخر الذکر کو سوفسطائی خیال پرست ()

کہتے ہیں۔ بحث صرف قلب () اور مادہ () پر
 آرہی ہے۔ مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ مادہ ہی سے قلب کی پیدائش واقع
 ہوئی ہے، اور خیال پرست اس کے خلاف قلب کو مقدم کہتے ہیں، قلب

کا کام تصورات یا خیالات ہیں اور مادہ مکان و زمان ہی میں مشاہدہ ہوتا ہے، ان دونوں میں جو اختلاف عمل ہے اسے دیکھتے ہوئے ”ڈیکارٹ“ کے متبعین نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قلب کا جسم پیرا اور جسم کا قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر یہ صحیح ہو تو کائنات میں قلب اور جسم متوازی خطوط پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں جو کہیں نہیں ملتے، ”ڈیکارٹ“ کے نظریہ ”دوئی“ کو بنیز () وغیرہ نے مسترد کر دیا۔

آئیڈیل ازم () کے نزدیک مادہ حقیقی شے نہیں۔ بشپ ”بارکلی“ نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، کانٹ () (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) کا نظریہ یہ ہے کہ دو حقیقتیں موجود ہیں۔ مقدم حقیقت مادی ہے مثلاً شکل و صورت، وزن وغیرہ اور ثانوی حقیقت رنگ، نوائفہ وغیرہ، اول الذکر تو آفاق میں مادی دنیا کے اوصاف ہیں اور مؤخر الذکر احساسات یا تصورات ذہنی ہیں۔ اول الذکر جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان اور انسانی ذہن سے بے نیاز پہلے ہی موجود ہے۔ بارکلی (۱۷۸۵ء - ۱۷۵۳ء) اس نظریہ کو مسترد کرتا ہے۔ ہیگل (۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء) کا نظریہ کسی حد تک کانٹ کے مطابق ہے۔ لیکن وہ کانٹ کے نظریہ کثرت کو وحدت میں محو کرتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت موجود ہے، جسے وہ ”مطلق“ () کہتا ہے، یہ مطلق نہ صرف حقیقت مجردہ ہے بلکہ عالم صورت بھی یہی ہے۔ تمام عالم ایک وحدت ہے جو کثرت پر محیط ہے اور کثرت میں اختلاف اور تضاد سب موهوم ہے، یعنی ”دوئی“، غیر حقیقی ہے، اور یہ کہ عالم قلب ہی ہے۔

مگر ز عالم اضداد بگذری ورنہ

بہشت ہم بمقابل جہنمی دارد

نقش نیرنگ دو عالم رقم لوح دل است

ہمہ ازماست گرایں آئینہ برما بخشد ،

ہیگل کے نظریہ کے مطابق تمام اشیاء اور ان کی شکل و صورت وغیرہ میں اختلاف محض "نسبتی امور" ہیں۔ ہم اشیاء کا تقابل امثال و اختلاف و تضاد وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہی کچھ کسی شے کی نسبت ہمارا مبلغ علم ہے۔ لیکن یہ تمام امور غیر حقیقی ہیں، اور یہی کیفیت ہمارے تصورات اور عقائد کی بھی ہے جسے ہم "حق" کہتے ہیں اس کا تصور "کذب" کے تصور سے وابستہ ہے، جسے ہم حقیقی کہتے ہیں اس کی ضد غیر حقیقی بھی ہمارے پیش نظر ہوتی ہے، اگرچہ یہ دونوں ذہنی امور ہیں لیکن جسے ہم امر واقعہ سے تعبیر کرتے ہیں اس کی موجودگی واجب ہے، اور وہ قائم بالذات ہونا چاہئے نہ کہ اس کی بستی کا انحصار کسی دوسرے امر واقعہ پر ہو، اگر ایسی صورت ہو یعنی حقائق کی کثرت ہو اور سب قائم بالذات ہوں تو ہیگل کا نظریہ باطل ہوگا، مگر ہیگل اس نظریہ ہی کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم صرف "واقعہ واحد" ہے جسے وہ مطلق سے موسوم کرتا ہے، بیدل اور تمام تنویر محققین کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عالم واقعہ واحد ہے اور یہ کہ واقعات جو ہم مشاہدہ کرتے ہیں نسبتی امور ہیں اور اس واقعہ واحد سے وابستہ ہیں یعنی حق مطلق قائم بالذات ہے اور کائنات قائم بالحق ہے خود قائم بالذات نہیں، اس نظریہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے مسئلہ تجدد امثال کو پیش نظر رکھنا چاہئے جس پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے بحث کریں گے، اور اسی کے تحت زمان و مکان و امروز و فردا اور دنیا و عقبی وغیرہ مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت تو ہر ایک اہل نظر پر منکشف ہے کہ

تجدد امثال

کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے پر تغیرات

واقع ہوتے ہیں، اس انکشاف کے بعد محققین نے ان تغیرات کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ عالم میں قوانین فطرت آفرینش سے سرگرم عمل ہیں اور انہی سے نظام عالم قائم ہے۔ یہ قوانین خود نہیں بدلتے اور ناقابل تبدیل و تحویل ہیں لیکن تمام تغیرات انہی کے پیدا کردہ ہیں۔ ان تغیرات کی وجہ سے تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے ارتقائی مرحلے طے کرتی چلی آ رہی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تجدد امثال کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک شے کی امثال بدل رہی ہیں۔ خود یہ شے یا اس کی حقیقت یا ماہیت جو کچھ بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے نہیں بدلتی۔ ہر ایک شے کی صورت ہی بدلتی ہے، اس لئے ہر ایک شے تغیرات کے زیر اثر ”خلق جدید“ میں رونما ہوتی ہے۔ صورت نہ صرف ظاہری ہے بلکہ ذہنی بھی ہے یعنی قانون تجدد کائنات خارجی اور ذہنی دونوں صورتوں پر مؤثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علوم و فنون بھی بدلتے رہتے ہیں۔

”ہیریٹ سپنسر“ کہتا ہے کہ اوّل تو کسی ایک زمانہ میں بھی حکماء کا ایک نظریہ پر اتفاق کبھی نہیں ہوا اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی ہو تو واجب ہے کہ غافل سلف سے اختلاف کرے اگر ایسا نہ کرے گا تو ذہنی ارتقاء رک جائے گا۔ قومیں جو رجعت پسند ہوتی ہیں اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنا پسند کرتی ہیں جس کو اصطلاح میں تعادل کہتے ہیں ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور وہ دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔ اشد قرآن ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو نہ بدلے اور جب نہیں بدلتی تو اس کے برے دن آجاتے ہیں جو طالے سے نہیں ٹلتے“

۴۷۵-۴۸۰ ذہن

مشہور یونانی فلسفی ہرکلیطس (

از مسیح) کا نظریہ یہ تھا کہ ہر ایک شے متغیر اور متبدل ہو رہی ہے۔ ایک

دوسرے فلسفی پر مینا نڈر) ۵۰۰ قبل از مسیح کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ اجزاء پر تغیرات واقع ہوتے مشاہدہ ہو رہے ہیں مگر کائنات کلی جوں کی توں ہے۔ یعنی نہ تو ذرہ بھر بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے اور تغیرات محض فریب نظر ہیں، فریب نظر کی مثال ”زینو“ () نے یہ پیش کی ہے کہ فرض کرو ایک تیرکمان سے نکلا، ہدف تک اس کو کچھ عرصہ درکار ہے۔ اس عرصہ کے لمحات میں تیر کو پرواز کرتا ہوا تصور کرو ہر ایک لمحہ میں تیر کسی خاص مقام پر ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ وہیں ہے جہاں سے ہونا چاہئے تو وہ متحرک نہیں اس لئے حرکت محض فریب نظر ہے۔ اسی قسم کے سوسطائی دلائل بہت ہیں افلاطون نے اپنا نظریہ ”عالم مثال“ () انہی دو نظریوں پر قائم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں نظریے صحیح ہیں، اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ فرق صرف دونوں محققین کی حد نظر کا ہے۔ جہاں تک محسوسات کا تعلق ہے تغیرات بالبداهت ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ اور جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں دوسرا نظریہ بھی صحیح ہے کہ حقیقت مطلق ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔

ہمارے زمانہ میں ارتقا پر جو کچھ حکماء نے لکھا ہے اس سے تجدیدِ امثال کی قطعی تائیدی شہادت ملتی ہے، لیکن مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ کل کائنات ایک عظیم الشان مشین کی طرح ہے جس کے پُرزے اور ان کا عمل ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں اس لئے اس نظریہ کو میکینسٹک () کہتے ہیں کسی وقت کسی نے یا اتفاقاً کسی سبب سے اس میں حرکت پیدا کر دی یا پیدا ہو گئی۔ اور اب یہ کل اور اس کل کے پُرزے خود بخود سرگرم عمل ہیں یہ وہ نظریہ ہے جس کی پُر زور مخالفت ”برگسان“ () نے ہمارے زمانہ میں کی، مادہ پرست تو یہ کہتے ہیں کہ زندگی مادہ ہی کا خاصہ ہے۔ برگسان یہ کہتا ہے کہ مادہ زندگی

کی پیداوار ہے۔ برگسان نے حیاتیات () اور نفسیات () پر اپنے دلائل کی بنیاد استوار کی ہے۔

ہم نے ان حکماء کے نظریوں کا حوالہ اس لئے دیا ہے تاکہ بقول بیدل معلوم ہو کہ ”کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست“ ہمارے زمانہ میں فلسفہ یعنی نظری حکمت کے ساتھ سائنس یعنی علمی حکمت نے ایک انقلاب عظیم ذہن انسانی میں پیدا کیا اور مادہ اب صرف ایک قوت () اصل میں رہ گیا ہے۔ اور اس قوت کی حرارت کی کمی بیشی سے مختلف مادی صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ قوت بھی محدود ہے۔ اور اس کی تقسیم غیر مساوی سے تغیرات وغیرہ واقع ہو رہے ہیں اور یہ کہ اس قوت کا رجحان مساوی تقسیم کی طرف ہے۔ اور جب یہ اعتدال پر آجائے گی تو کائنات میں حرکت مفقود ہو جائے گی یعنی ایک قسم کا جمود مطلق واقعہ ہو گا۔ اسے کہتے ہیں :-

() حکماء اسلام میں سے غالباً سب سے پہلے محی الدین شیخ اکبر نے اصطلاح تجدد امثال قرآن کی بعض آیات سے اخذ کی (واذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلاً) (۲۹: ۲۰) نیز (انفعینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جدید) (۲۶: ۱۵) چنانچہ نصوص الحکم میں اپنی کتاب تجلیات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ میں نے کشف میں اکابر صوفیہ جنید بغدادی وغیرہ کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہ تھا، میں نے آیہ (واذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلاً) کی تفسیر کرتے ہوئے انھیں قانون تجدد امثال سے آگاہ کیا۔ شیخ اکبر یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف اس دنیوی زندگی میں بلکہ بعد ممات بھی زیر اثر تجدد امثال ارتقاء جاری ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج اہم ہیں۔

بیدل

(۱) جہان کبھی کہنہ و فرسودہ نہیں ہوتا ہر آن اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

نوی بیدل از سازا مکان زفت نشد کہنہ تجدید ایجاد با
در کار گہ تجدید یکست چمن سازیت
تقویم بہار ایں جا پارینہ نمی باشد
تجدید کے کارخانہ میں جو کچھ بھی بنتا ہے نیا ہی بنتا ہے اس چمن پر
ہمیشہ بہار کی رونق رہتی ہے۔

اے میوہ زرد و زرد رس کہنہ مشو
باغ طرب فی زرخار و خس کہنہ مشو
ہنگامہ آثار و تجدد گرم است

اے معنی تازہ پیش کس کہنہ مشو
میوہ پختہ ہو کر زرد پڑ جاتا ہے مگر پختگی سے مراد کہنگی نہیں اور نہ وہ خاؤ
خس میں بدلتا ہے اس کی حقیقت ہمیشہ تروتازہ ہے۔ تجدد کے زیر اثر وہ کبھی
کہنہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بظاہر کہنگی کے آثار محسوس ہوتے ہیں مگر تو خود باغ
طرب ہے اور ہمیشہ تروتازہ ہے۔

(۲) چونکہ عالم کی امثال بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے عالم ہر آن فنا ہوتا اور
ہر آن اس کا مثل ظہور میں آتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ہر آن خالق اور
مبدی اور بدیع اور مصور و غیر ہم ہے، (کل یوم ہونی شان)
(۳) تجدد میں ارتقاء لا محذور ہے۔ (اجو غیو مومنون)

زکار گاہ تجدد عیاں نہ شد بیدل
جز ایں قدر کہ کسے ایں جا بانہا نرسید
اے بے دل کار گاہ تجدد سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس جگہ
کوئی شخص انتہا کو نہ پہنچا۔

(۴) ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر ایک شے کا آخر اقل سے بہتر ہے۔
(الاخوة خیر و ابقی)

(۵) تجدد میں رجعت یعنی ہستی میں تکرار نہیں۔

تکرار مبنیٰ دیر اور اراق تجدد و تقویم نفس را خط پارینہ نباشد
جس طرح ہر ایک سانس ایک نیا ہے اور جو گزر گیا وہ دوبارہ نہیں
آتا، اسی سے رشتہ زندگی وابستہ ہے، اسی طرح دفتر ہستی کا جو ورق اٹ
گیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، وہ کبھی گردش کرتا ہوا دوبارہ رونما نہ ہو گا۔

نشست و برخاست نمی گردد از سپند مکرر
چہ ممکن است کہ نقش کسے دوبار نشیند

جس طرح سپند کا دانہ ایک دفعہ ہی بحر میں جل کر آواز دیتا ہے اور پھر
ہمیشہ کے لئے خاموش ہوتا ہے اسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی نقش دوبارہ ثبت
ہو سکے۔ ”برگسان“ نے لکھا ہے کہ فرض کرو آپ غیر متحرک ساکن شے کو دیکھ
رہے ہیں۔ یہ شے ایک ہی جگہ پڑی رہی اور آپ اسے ایک ہی جانب سے
ایک ہی زاویہ نگاہ سے اور ایک ہی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کا
تصور لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہے گا۔ میرا حافظہ بھی موجود ہے جو تذکرہ سے گزشتہ
تصویرات کو سامنے لارہا ہے، میری قلبی حالت جوں جوں جاوہ وقت بدلتی
گا مزین ہوتی جائے گی، ان تصویرات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ گو وہ
ایک دوسرے کے مشابہ اس حد تک ہوں کہ ان میں اقبیاز پیدا کرنا
مشکل ہے، مگر ہر ایک تصویر ایک دوسرے کا غیر ہے۔ ”برگسان“ کے
لفظوں میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم ”بلا توقف متغیر“ ہو رہے ہیں، خواہ یہ
اشیاء خارجی کے تصورات ہوں یا ہمارے قوی باطنی یا خواہشات یا
جذبات یا ارادہ وغیرہ ہو اور جسے حال سے موسوم کیا جاتا ہے وہ صرف
تغییرات کا دوسرا نام ہے۔ احساس ہو یا خیال یا ارادہ وغیرہ مسلسل معرض

تغیر میں ہے اور اگر یہ زور رک جائے تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی، اس لئے ایک حالت سے گزر کر دوسری حالت میں آنا یا ایک ہی حالت میں مسلسل رہنا ایک ہی بات ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں، بات صرف اتنی ہے جسے شیخ اکبر نے واضح کیا ہے کہ ہمیں تغیرات کا فوری احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ نہایت لطیف اور ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، مادی ہی وجہ ہے کہ ہم باوجود ان تغیرات کے یقین کرتے ہیں کہ ہم عمر کے ہر ایک دور میں ایک ہی ہیں۔

جب یہ حقیقت تسلیم ہے کہ :-

مکرر رونما ہوتا نہیں ہے کوئی ہستی میں

مثال اس آئینہ خانہ میں ممکن ہو تو پیدا کر

نقش آئینے میں پڑے اور مٹ گئے

اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا

(امیر مینائی)

تو اس کے نتائج پر جو بہت دور رس ہیں غور کرنا چاہئے۔ بیدل

اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ”بیدل“ دوبارہ نہیں ہوگا، ایک رباعی میں کہتا

ہے کہ ہزار کوثر و نسیم نثار کروں اگر بیدل دوبارہ ہو اس سے یہ غلط

فہمی پیدا نہ کرنی چاہئے کہ بیدل حیات بھرمات کا قائل نہیں، وہ خود

کہتا ہے کہ

صورت این انجمن گر محو شد پروا کراست

خانہ نقاش ما نقش دیگر خواہد نمود

اگر یہ انجمن جہاں ہم صورت دو چار بیٹھے ہیں درہم برہم ہو جائے

تو کیا پرواہ ہے وہی نقاش جس نے اس انجمن کا نقشہ کھینچا اور

نقش بنادے گا۔

پیکر خاکی مارا برہ سبیل فنا
یاد بربادی ازاں نیست کہ معمار ہست

میرے خاکی جسم کو سیلاب اگر بہا کر لے جائے اور ضرور لے جائے گا تو مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ میں معدوم ہو جاؤں گا۔ اس لئے کہ معمار موجود ہے۔ جس نے پہلے میرا خاکی جسد بنایا وہی جس صورت میں چاہے گا اسے تعمیر کرے گا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ بیدل دوبارہ پیدا نہ ہو گا خواہ کچھ اور ہو غور کرنا چاہئے کہ انسانی صورت میں پیدائش سے لے کر موت تک ہم کتنی صورتیں بدل چکے ہیں، موت کے بعد ہم ان میں سے کس پسندیدہ صورت میں رونما ہوں گے؟ بیدل نے مزید تشریح شہادت ارتقا میں کی ہے جس کا مذکور ثنوی "عرفان" کے تحت ہم کر چکے ہیں "طین" یعنی جمادات سے ترقی کرتے ہوئے ہم انسان بنے، اگر ارتقاء کا یہ سلسلہ جاری رہے اور جاری ہے تو ہمیں تو متوقع رکھنی چاہئے کہ بہتر صورت میں رونما ہوں گے۔ اس تحقیق کے ضمن میں وہ کسی شخصیت کی آمد ثانی کا بھی قائل نہیں، چنانچہ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ

باز آمدن مسیح و مہدی ایں جا از تجربہ مزاج اعیان دور است
مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ

اور انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے (اقبال)

اہل کتاب نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ اور عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح کے ساتھ مہدی کا بھی ظہور دوبارہ ہو گا تحقیق سے بہت بعید ہے۔ اس لئے کہ ہستی میں تکرار نہیں ہے۔ مہدی خلافت عباسیہ کے آٹھویں تاجدار محقق باللہ کے عہد میں "سامرا" (سرمن رائے) کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گئے تھے، اور ان کی آمد ثانی یا ظہور ثانی کا انتظار سنی اور شیعہ دونوں کو ہے۔ مہدی شیعہ کے بارہویں

امام غائب ہیں۔

انسان روزانہ اپنے ہم جنس انسانوں کو مرنا اور اسی طرح خاک میں ملنا دیکھ رہا ہے جس طرح دیگر حیوانات لیکن اس یقینی واقعہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی عمرا بد کا طالب ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ مرنا ایک روز ضرور ہے پھر بھی چاہتا ہے کہ میں نہیں تو میرا نام ہی یہی زندہ رہے۔

بہر کہ می نگرم طالب دوام و بقا ست

مدار خلق بضر محال می گذرد

میں ہر ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ یہی چاہتا ہے کہ دائمی زندگی ہو، بات یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی کا مدار ہی فکر محال پر ہے علاوہ ازیں خضر کی کہانی لوگوں کے اذہر ہے۔

تجدد پر فشاں وغرہ عمر ابد بیرون

نیاز خضر کن رہا ہے کہ در صخرے بنک فتد

جب یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک شے پر تغیرات واقع ہو رہے ہیں اور کسی شے کو کسی ایک حالت پر بقا نہیں تو ”عمر ابد“ کا خیال خام پختہ کرنا انتہائی بے بصیری ہے۔ مناسب ہے کہ اس ”ورق انیال“ کو جو بھنگ کے جنگل میں پیدا ہوتا ہے حضرت خضر کی تذکرہ کر دو یعنی اس طرح بے پر کی اڑانا بھنگڑوں ہی کی ذہنیت کے مناسب ہے۔ لفظ ”نیاز“ نے خاص لطف پیدا کر دیا ضعیف الاعتقاد خضر کے نام پر تذکرہ بنانا بھی دیتے ہیں۔

تا کے زخلق پردہ برو افکنی چو خضر

مردن بہ از خجالت بسیار زیستن

کب تک تو خلق سے چھپتا پھرے گا۔ خضر کی طرح چہرہ پر نقاب ڈالے گا۔ درازی عمر بھی شرمساری ہے اس سے بہتر تو مرنا ہی ہے، جو شخص شرمسار ہو وہ منہ چھپاتا پھرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسی ہی شرمندگی خضر

کو بھی لاحق ہے، یہ خیال غالب نے اس طرح ادا کیا۔

ہیں زندہ ہم کہ ہوئے رہشناس خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اس تحقیق کے تحت تبدیل قاضی جمال کے فتاوے کی نسبت بھی یہی کہتا

ہے کہ احکام شرعیہ حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات ہمیشہ بدلتے ہیں

خواہ ذہنی ہوں یا خارجی اس لئے ان کے مناسب احکام بھی بدلنے چاہئیں۔

نئے نئے حالات کے مناسب نئے احکام وضع ہونے چاہئیں یعنی ہمیں اپنی

ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب بدلنا چاہئے۔ حق را قاضی جمال نتوان

فہمید۔

بیدل کا دوسرا نظریہ تجدد امثال کے تحت یہ ہے کہ امروز و فردا اور دنیا

و عقبیٰ اور زمان و مکان سب اعتباری یا نسبی امور ہیں۔ اور غیر حقیقی ہیں۔

اصل میں کائنات واقعہ واحد ہے اور حال ہی حال موجود ہے یہ عرف

تغیرات ہیں جن کو ہم ماضی و مستقبل سے موسوم کرتے ہیں چندا شعار اس

موضوع پر ملاحظہ ہوں۔

نہ دی گذشت نہ فردا بہ پیش می آمد

تجدد من و اما تاقیامت آغاز است

غبار ماضی و مستقبل از حال تو می خیزد

در امروز است گم گراشکافی دی و فردا را

دامن حال سے گرد جھاڑیں تو کچھ تو ماضی اور کچھ مستقبل کی صورت

اختیار کرے گی، جسے تو کل گذشتہ اور آئندہ کہتا ہے دونوں حال ہی میں

پوشیدہ ہیں۔ جب تو آج کو کھول کر دیکھے گا تو دونوں ظاہر ہو جائیں گے،

اسی تخیل کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

غم مستقبل و ماضی است کا ترا حال می نامی

نقابے درمیان است از غبارش پیش و پس ایں جا

جب غبار ہمارے آگے چھپے اُڑ رہا ہوا اور ہم اس میں گھرے ہوں تو لاچار
اس خیال سے کہ یہ خاک دھول ہماری آنکھوں میں نہ پڑے یا منہ میں نہ جائے
ہم چہرہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ذکر ماضی اور فکر مستقبل کی ہے کہ دونوں
گرد و غبار ہیں جو ہمارے حال پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا حال بھی
غبار آلودہ ہو کر رہ گیا، ہماری عمر یعنی حال اسی ذکر ماضی و فکر مستقبل میں
گزر جاتا ہے اس لئے حال بھی ضائع ہو رہا ہے۔

بر فریب نیہ نقد خرمیہا با خقیم
ساغر امروز ما بدستی فردا شکست

کہتے ہیں کہ نو نقد نہ تیرا دودھار، مگر ہم اودھار جو متوقع ہے کہ کل
ملیگا اس طرح کھا کر بیٹھ رہے کہ جو نقد خری تھا وہ بھی ضائع ہو گیا اور
اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ کہتے کہ ”ساغر امروز“ ہاتھ میں تھا اور اسیں
بقدر استعداد یا ظرف بادہ خوشگوار بھی تھا لیکن بن پیسے فردا کا نشہ اتنا چڑھا
کہ ساغر امروز ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

جنوں بنجودی پیش برد سعی اہل
کہ کار عالم امروز نذر نسر دا کرد

دور از کار توقعات بھی مایخو لیا ہے کہ جو کام آج کا ہے اسے کل پُر اٹھا

رکھا۔

بفکر نیہ موبوم نقد نیز نمائد
میرس در غم مستقبل چہ حال گذشت

اودھار کی امید پر جو ایک امر موبوم تھا جو کچھ ہاتھ میں نقد تھا وہ بھی
نہ رہا فکر مستقبل کے بارہ میں کچھ نہ پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری یعنی حال اسی غم میں
گزر گیا۔ چونکہ ”حال“ ہی اصل شے ہے اس لئے

درہائے فردوس و ابود امروز از بے دماغی غفتم نسر دا

فردوس کے دروازے آج کھلے ہوئے ہیں لیکن ہماری بے دماغی کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں کل اس میں داخل ہوں گے۔

نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا

تو کز خود غافل صرف عدم کن دور بینی را

نشاط و بہار و بہشت و نگار جو آج یہاں موجود ہیں اگر ان سے چشم پوشی کی جائے تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے آپ سے غافل ہیں اور اس کا فائدہ نہیں اٹھاتے اور اُمید موهوم پر یہ بھی ضائع کر رہے ہیں، یہ دور بینی اسی وقت ممکن ہے جب نزدیک بینی نہ ہو اس لئے یہ سمجھ لو جس شے کی توقع ہے وہ محض موهوم و معدوم ہے۔

ز بس بردہ است افسون اہل از خود جہانے را

گرا ز امروز می برسی ز فردا گفتگو دار د

یہی دور از کار توقعات ہیں جس نے ایک دنیا کو موجودہ حالات سے غافل بنا رکھا ہے۔ اگر کسی سے امروز یعنی آج کے حالات دریافت کرو تو کل کی باتیں سنائے گا۔

بیدل کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ تم اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے اور اسی جگہ ایک عمر بسر کرنی ہے آخر اس کی بھی کچھ غرض و غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے، بلکہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی مہیا کر رکھا ہے۔ نشاط ایں جا، بہار ایں جا، بہشت ایں جا، نگار ایں جا، لیکن ہم نے اس جنت کو دوزخ بنا رکھا ہے۔

داغ نیرنگیم تاب آتش دیگر کراست

دوزخ امروز ما اندیشہ فردا بس است

یہ اندیشہ فردا جو ہمیں آج لاحق ہے ہمارے جلنے کے لئے یہی آگ کافی ہے، اس کے علاوہ اگر کوئی اور نار جہنم بھی ہو تو کون برداشت کر سکتا ہے۔

بیدل نے ”نکات“ اور ”چہار عنصر“ میں لکھا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی آسائش کا آپ دشمن ہے۔ اگر سفر میں ہے تو وطن کا خیال اور اگر وطن میں ہے تو سفر کی خواہش اسے چہین لینے نہیں دیتی۔

تلخ است عیش امروز از گفتگوئے فردا

درخانہ کہ ما ئیم ہمسایہ شور دارد

اسی طرح :-

دُنیا الم غفلت و عقبیٰ عنم اعمال

آسودگی از مادہ و جہاں فاصلہ دارد

دنیا میں غفلت کا اور اسی دنیا میں رہتے ہوئے عقبیٰ کا غم کھائے جاتا ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ جسے آسودگی کہتے ہیں وہ ہم سے اتنی دور ہے جتنا دو جہان کا فاصلہ نہ دنیا میں چہین ملا۔ اور نہ عقبیٰ میں آسودگی کی توقع ہے وہاں بھی اعمال کی سزا و جزا ایسی ہی ہے جیسی اس دنیا میں۔

تائیمیری رمزاں معنی مگر درد و روشنت

کا شنائی زندگی از عافیت بیگانہ است

جب تک تو مکر اس زندگی کو خیر یا د نہیں کہتا تب تک یہ راز تجھ پر منکشف نہ ہو گا کہ اس زندگی سے آشنائی عافیت سے بیگانگی ہے۔

فلسفہ آزار بھی بیدل اسی تخیل سے اخذ کرتا ہے کہ

چہ اوج سپہرو چہ زیر زیں ہر جا توئی جلے آرام نیست
ذوق کہتا ہے کہ

خواہ پھرتا ہے فلک یا خواہ پھرتی ہے زیں

پر ہمارے واسطیوں منزلِ راحت نہیں

مطلبہ گروہ از ہستی ہمیں آزار بود

ورنہ در کج عدم آسودگی سیار بود

”عدم“ نام ہے بے شعوری کا، بے علمی کا، بے حسی کا، ورنہ جسے عدم حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا تصور ایسا ہی ”محال“ ہے جیسے خود ”محال“ کا۔ یعنی انسانی ذہن میں عدم اور محال کا تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان عدم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ ہر کچھ بھی انسان کے ذہن میں آئے خواہ وہ محض وہم ہی کیوں نہ ہو ”مکن“ ہے اور اگر مناسب اسباب کا علم ہو تو خارج میں اس کا ظہور بھی ممکن ہے۔ پیدائش سے پیشتر ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کیا تھے، اب ہمیں اس امر کا شعور و علم و احساس ہے کہ ہم ہیں۔ لیکن اس شعور مستی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ثابت ہے کہ جسے کامل آسودگی کہتے ہیں وہ اسی بے شعوری میں تھی شعور مستی شعور آزار ہی ہے جو بالبداهت ثابت شدہ واقعہ ہے۔

راحت دریں قلمرو از آثار ہوش نیست

خوابیدہ است اگر کسے آرام داشتہ است

امروز و فردا اور دنیا و عقبیٰ اور بہشت و دوزخ ایسا موضوع ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے چونکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ یہ صرف تغیرات ہیں جن کو ہم دی و فردا سے موسوم کرتے ہیں ورنہ حال اصل شے ہے، اور کائنات واقعہ واحدہ ہے۔ یہ تغیرات یا تجدد امثال ہے اور اسی میں ہم مسلسل ارتقاء مشاہدہ کر رہے ہیں جس کی انتہا نہیں، کائنات کھنونا نہیں کہ بچوں کا دل بہلانے کے لئے بنا اور جب چاہا تو ٹپھوڑ کر رکھ دیا۔ یہی کائنات بیشمار تغیرات کے بعد ہم موجودہ صورت میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور یہی ارض و سموات قانون تجدد امثال کے تحت ”غیر السموات والارض“ بدل کر ہو جائیں گے۔ ایک رباعی میں کہتا ہے کہ آفاق میں نظر کر ”ہر روز قیامت است و ہر شب مردن“ اس لئے وہ اس عقیدہ کا مضحکہ اڑاتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قیامت وہ وقت ہے جب کل

کائنات فنا ہو جائے گی اور ایک ذات حق تعالیٰ کے سوا جیسی کہ وہ ازل ہی ہے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور صنعت کاملہ سے بہت بعید ہے کہ ایک شے بنائے اور اسے پھر معدوم کر دے، پھر ایسی شے ”عبث“ ہوگی ”باطل“ ہوگی لیکن ”ربنا ما خلقت هذا باطلا“ ”باطل از باطل بروید حق ز حق“ ذات باری تعالیٰ حق ہے وہ حق پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ باطل پیدا نہیں فرماتا، ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ باطل نہ تو کچھ پیدا کر سکتا ہے اور نہ پیدا شدہ کو دہرا سکتا ہے، (مایبیدی الباطل و مایعیدہ ۲۲: ۱۲) اللہ تعالیٰ نے کائنات خلق فرمائی تو یہ باطل نہیں اور اگر باطل ہوتی تو اس کی پیدائش ایک دفعہ ہی پیدا ہو کر ختم ہو جاتی، لیکن مشاہدہ ہو رہا ہے کہ یہ پیدائش تجد و امثال کے تحت ہر آن نئی صورت میں رونما ہوتی ہے۔

اسی تجد و امثال میں ”خلق جدید“ اور ”قیامت“ کا راز مضمر ہے۔ ایک رباعی میں بیدل کہتا ہے کہ لوگوں کا بھی عجیب حال ہے کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور ماسوائے جو کچھ ہے باطل ہے۔
آئینہ خلق طرفہ جو ہر دارد

صورت دگر است و عرض دیگر دارد

می گویند او حق است و ما باطل محض

از باطل حرف حق کہ باور دارد

جب ہم باطل ہیں تو ہمارا قول بھی باطل ہے۔ اس لئے ہمارا یہ دعوئے کہ حق تعالیٰ کی ذات حق ہے قول باطل ہے، حق ہی حق پر شاہد ہے۔

مجاز اندیشیت فہم حقیقت را نمی شاید
محال است این کہ حق از عالم باطل شود پیدا

مجاز کا تصور حقیقت شناسی کے مناسب نہیں ہے، یہ ناممکن ہے کہ عالم باطل سے حق کا ظہور ہو، حق کا ظہور حق سے ہی ہوگا۔

چہ امکان است گرد غیر ازیں منزل شود پیدا

ہماں لیلی شود بے پردہ تا محمل شود پیدا

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس منزل و حدت پر غیر ناقہ سوار ہو اور ”غبار غیریت“ اُڑ رہا ہو اگر محمل نظر آ رہا ہے تو یہ سمجھو کہ وہی لیلی بے پردہ ہے، یعنی ذات ہی جلوہ صفات میں رونما ہو رہی ہے۔

برون لفظ محال است جلوہ معنی

ہماں ز کسوت اسما طلب مسئلی را

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم حقیقت مجروحہ یا لیلی کو بے پردہ نہیں دیکھ سکتے، یہ حسن صفات یا اسماء ہے یا استعارہ میں ”محمل“ ہے اسی میں لیلی بھی نظر آ رہی ہے، جیسے الفاظ کی صورت میں معنی۔

ندارد حسن یکتائی ز جیب غیر جو شیدن

حق از حق جلوہ گر شد باطل از باطل بڑا بد

یہ تشریح ذہن نشین کرنے کے بعد ماضی و حال و مستقبل اور دنیا و

عقبیٰ اور دوزخ و بہشت پر بیدل کا نظریہ ملاحظہ ہو۔

ہوس چوں نار سا شد نہ نقد حال می گردد

اہل را رشتہ کو تہ ساز و عقبیٰ گیر دنیا را

محض ہوس، آرزو، تمنائے تودعا حاصل نہیں ہوتا، اور کبھی نہیں ہوتا اس لئے جب ہماری آرزو نار سار ہی یعنی مقصد حاصل نہ ہو تو یہ کہہ کر دل کو طفل تسلی دی کہ دنیا میں نہیں تو عقبیٰ میں حاصل ہوگا۔ نقد حال بھی اودھار بن گیا۔ اگر تم نقد حال سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اسی دنیا کو عقبیٰ فرض کر لو۔ اور عاقبت کی اُمید پر اودھار کھا کر نہ بیٹھو۔

خلق در خاک انتظار صبح محشر می کشند،
زندگی با مردگان در گور با ہم رفتا است

خلق مرکز بھی قبر میں صبح محشر کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے جو
لوگ مر گئے وہ زندگی کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ انتظار کسی شے کا
زندگی کے ساتھ ہوتا ہے، حالانکہ موت و حیات دو متضاد امور ہیں
اور اجتماع اضداد محال ہے۔

در کفن باقیست احرام قیامت بستنت
گر تو بنشتی نخواہد رفتنت از پانشت

کفن اور احرام میں مشابہت ہے، عرفات کے میدان میں حج کی
تہذیب پر ایک ہی چادر میں ہر ایک شخص ملبوس ہوتا ہے، اسی طرح کفن
کی صورت ہے، مگر انسان قبر میں آسودہ رہتا ہے، مگر آسودگی کہاں
یہ کفن جس میں کہ تو پٹا ہوا ہے گویا احرام ہے حج قیامت کا، تو خواہ بجائے
خود آرام سے بیٹھ گیا ہے مگر یہ فتنہ قیامت کہاں چین سے تجھے بیٹھنے دے گا

تا درین محفل تامل بر بساط حال ریخت

ساغر ماضی بگردش رنگ استقبال ریخت

ورنہ ایں جا حال کو مستقبل و ماضی کلام

تقلیل و ہی است کز مینائی قیل و قال ریخت

اس محفل ہستی میں تذکرہ و تفکر ہی کا کرشمہ ہے کہ حالات جو ہم پر گزر
چکے ہیں یا مشاہدہ کر چکے ہیں وہ ماضی سے موسوم کرتے ہیں یہی حالات و
واقعات ہیں جن کا نشہ ساغر ماضی میں ہے اسی پیما نہ ماضی کی گردش سے
نشہ مستقبل پیدا ہوتا ہے، یعنی حال یا واقعہ ایک ہی ہے، نشہ بادہ ایک
ہی ہے۔ مگر ایک دو گردش میں نام مختلف ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس بزم
ہستی میں حال اور ماضی اور مستقبل کہاں ہیں، محض نسبتی امور ہیں مینائی

قیل و قال سے قتل و ہم کا شور بلند ہو رہا ہے۔ یعنی فہم و تفہیم اور کہنے سننے میں یہ باتیں آرہی ہیں۔ ورنہ زمان و مکان سب موبہوم باتیں ہیں۔

در عدم نازتہ نتواں بسوی ہستی یافتن
فرصت آن جارفست ایں باطرح ماہ سال غرت

غور کرنا چاہئے کہ سال میں جو فرصت ہمیں میسر ہے وہ تو ماضی میں معدوم اور مستقبل میں موبہوم ہو کر رہ گئی۔ اس لئے ہستی جو فرصت ہی کا دوسرا نام ہے عدم میں چلی گئی اسے تلاش کرنا ہو تو عدم ہی میں ملے گی، لیکن ہم اسے ماہ و سال میں ماپ رہے ہیں جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے ایک اور بات بھی پیدا کی ہے کہ جسے وجود حقیقی کہتے ہیں وہ اس بریم ہستی میں نہیں، تو عدم باش وجود ایں جانیت، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں اور مزید تشریح مناسب مقام پر کی جائے گی۔

کلفت فردا ہماں دی شمر آزار باش

آنچہ بتفصیل آن منظرے مجلیست

اس شعر میں بھی یہی واضح کیا گیا ہے کہ جسے تو ”فردا“ سمجھ رہا ہے وہ دراصل ”دی“ ہی ہے یعنی کل جو آنے والا ہے یا گزر چکا ہے ایک ہی شے ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جو گذر چکا وہ تو مفصل مشاہدہ کر چکا ہے اسی کا اجمال ”فردا“ ہے جس کلفت کا تو مفصل تجزیہ کر چکا ہے اب اس غلط فہمی میں نہ الجھ کہ وہی پھر آئندہ رونما ہوگی اس لئے خوش رہنا چاہئے، کہ رسیدہ بود دبائے وے بنجیر گذشت، لیکن تجھے جو کل کا غم کھائے جاتا ہے یہ محض وہم ہے۔

پیش ازاں کز وہم دی آئینہ زمکاری کند

در نظر بارو شن است امروز فردائیکہ نیست

اس سے پیشتر کہ گزرے ہوئے کل کا وہم تیرے آئینہ خاطر کو مکدر

کرے، اسی آئینہ دیدہ و دل میں آج وہ حالات تجھ پر روشن ہیں جو ”دی“ یعنی ماضی میں محو ہو رہے ہیں، اور جوں جوں تجھ پر حال میں منکشف ہو رہے ہیں یہ سمجھ کہ تجھ پر فردا روشن ہو رہا ہے جو ماضی میں محو ہو گیا۔ اس لئے قطع نظر ”دی فردا“ تجھے تو صرف حال ہی کا شعور ہے، اور جو حالات تجھ پر وارد ہو رہے ہیں وہ ”فردا“ سے آکر ”دی“ میں گم ہو جاتے ہیں، اس لئے ”فردا“ یعنی کل جو آنے والا ہے یہ سمجھ کہ حال میں محو ہو گیا اور اب فردا نیست ہے، خواہ امروز شدن آنچہ بفکرت فردا است۔

ہر جلوہ کہ در پیش است گردش بقفا دریا

فردائی ایں عالم بے دینہ نمی باشد

ہر ایک جلوہ جو تیرے روبرو ہے یا پیش آنے والا ہے یہ سمجھ کہ گردش کرتا ہوا تیرے پیچھے چلا جائے گا یعنی فردا ”دی“ ہو جائے گا۔ اس عالم ہستی میں کوئی ”فردا“ بغیر ”دی“ نہیں بلکہ فردا ہی دی ہے۔

ہر کجا رفتم ز فتم نیم گام از خود بروں

صد قیامت رفت و امروز مرا فردا کرد

زمان و مکان، ماضی و مستقبل، غرض جو کچھ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے، ہماری ”خودی“ کے ساتھ ہی ہو رہا ہے، اور یہ خودی (کہیں ایک آدھ قدم نہ گئی نہ آئی۔ فردا حال اور حال ماضی میں بدلتا رہا اور ہم ویسے کے ویسے اپنی جگہ پر رہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے کہ جسے فردا کہتے ہیں اس کا تصور تو محال ہے، ہم ”ماضی“ پر اسے قیاس کرتے ہیں جو گزشتہ ”حال“ ہے، لیکن جسے فردا خیال کرتے ہیں وہ حال ہی میں رونما ہوتا ہے تو اس کا شعور ہوتا ہے۔ اس لئے ”خواہ امروز شدن آنچہ بفکرت فردا است“

ہر چہ آنجا است چو آنجا رسی ایں جاگرد
چہ خیال است کہ امروز تو فردا گرد

امروز فردا کا نظریہ بیدل واضح کر چکا ہے، چونکہ امروز ہمیشہ امروز ہی رہے گا، اس لئے عقبی جب وہ سامنے ہو تو دنیا ہی ہوگی۔ اس لئے بیدل کہتا ہے کہ دنیا ہو یا عقبی دونوں کا تصور ہمارے ہی ذہن سے وابستہ ہے، ہم نہ ہوں تو یہ بھی نہیں۔

۲ نسوی خویشت چہ عقبی و چہ دنیا پیچ نیست
بگذر از خود تا نگلے پیش ہیں پیدا شود

بے کشمکش نیست چہ دنیا و چہ عقبی
آہ از دل آزاد کہ خود را بچھا بست
دنیا ہو یا عقبی دونوں سے وابستگی ایک الجھن ہی ہے، آزادی
اس طرح حاصل نہیں ہو سکتی کہ ہم ان سے الجھے رہیں۔
چہ دام است دنیا چہ نام است عقبی
تو معماری این خانہ بے گماں را

دنیا کے دھندوں میں تو ہم پھنسے ہوئے ہیں، اور عقبی کے نام کی
رٹ لگا رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ”از ماست کہ بر ماست“ اس خانہ و ہم
و گماں کے معمار ہم ہی ہیں، یہ سب ہمارے ہی تصورات ہیں، مقام تحقیق
بھی یہی دنیا ہے۔

ہر چہ وارد محفل تحقیق امروز است و بس
خاک بر فرق دو عالم دی و فردا کردہ اند

ایں ساز فتنہ کہ تو محشر شنیدہ زیر و بم تو گرنہ بود غلغلیش نیست
یہ شور و محشر تو ساز فتنہ سے سن رہا ہے اگر تیری ہی مدد ہم اور پیچم سر نہ
ہوں تو اس کا غل بھی خاموش ہو جائے گا۔ یہ امر کہ بہشت کی نعمتیں اسی
دنیا کی نعمتوں کے تصورات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے ماضی کے تصورات مستقبل ہیں۔

بیدل

انتظار صبحِ محشر عالمی را خاک کرد

عمر یافت وہمیں امروز و فردا می رود

بہشت و کوثر از حرص و ہوس لبریزی باشد

بقیٰ ہم رسیدم جز ہمیں دنیا نشد پیدا

ہم نے بقیٰ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہی حرص و ہوس دنیوی ہے

جس سے بہشت معمور ہے اور کوثر پر ہے۔

حرص و ہوس می برد بر سیم و زر دارد نظر

زاہد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نداشت

جہاں حرص و ہوس سرگرم عمل بوداں سیم و زر پر ہی نظر ہوگی، زاہد

جو ترک دنیا اس اُمید پکرتا ہے کہ بہشت میں حور و قصور ہیں تو ظاہر ہے کہ

وہ دنیا ہی کا طالب ہے۔

در مقامیکہ بود ترک و طلب امکانے

رو بدنیاست ہماں گرچہ زد دنیا گردد

جہاں کسی شے کا ترک یا طلب کرنا ممکن ہو تو خواہ ہم دنیا ترک کر کے

بہشت طلب کریں ہمارے مد نظر دنیا ہی ہے اگرچہ ہم اپنے زعم میں اسے ترک

کر رہے ہیں، لیکن بہشت کے نام پر طلب کر رہے ہیں۔ یہ کائناتِ عالم امکانا

ہے ترک و طلب دونوں امور امکانی ہیں اس لئے ہم اس عالم امکانا

ت میں ممکنات ہی کا تصور کر سکتے ہیں خواہ اسے دنیا یا عقبنی کے نام سے تعبیر

کریں۔

آں را کہ تو عقبنی شمی عقبنی نیست

یعنی جائے تقرب مولے نیست

وصف جنتِ شنیدہ عبرت گیر

ہر جازر و گوہر نیست جز دنیا نیست

جسے تو عقبتی سمجھ رہا ہے وہ عقبتی نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا مقام نہیں، توجہت کی نعمتوں کا بیان تو سننا ہے۔ عبرت حاصل کر جہاں زرد گو ہر ہو وہ دنیا کے سوا اور کوئی جگہ نہیں۔ اس رباعی میں لفظ ”عبرت“ کے معنی گذر جانا، عبور کرنا جب حافظہ کی مدد سے ہم گذشتہ واقعات کو دیدہ تصور کے سامنے لاتے ہیں تو اسے اصطلاح میں ”تذکر“ کہتے ہیں۔ یعنی کسی واقعہ گذشتہ کی یاد، جب اس سے گذر کر تفکر کی طرف آرہے ہوں، تو اسے ”عبرت“ سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی تذکر سے عبور کر کے تفکر کی طرف آنا رباعی میں دونوں معنی ہیں کہ اگر تو تقرب الہی چاہتا ہے تو عقبتی کا جو تصور تیرے ذہن میں ہے اس سے گذر جا اور یہ کہ غور کرنا چاہئے کہ یہ تصور عقبتی دنیا کی نعمتیں ہی ہیں اس لئے دنیا طلبی ہی ہے۔

بیاتاً دی کنیم امروزہ فردائے قیامت را

کہ چشم خیرہ بیناں تنگ دیدار غوش رحمت را

زمین تا آسمان اشار عام، آشکاکہ نو میدی

برویم از در باز کرم این گرد تہمت را

تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ظہور میں آئی ہے۔ اور الرحمن

کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ مخلوق کو وہ کچھ دے۔ یہ جو اس کی زندگی کے قیام کے مناسب اور ضروری ہے۔ اور یہ سب کچھ بلا عمل منجانب مخلوق دیا اور دے رہا ہے البتہ ”الرحیم“ اعمال کا معاوضہ بھی دیتا ہے مان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ ان اعمال کی جزا دے گا جو ہم دنیا میں کر چکے ہیں ”میں غنی ہوتا تو کب وعدہ فردا کرتا“ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت عام سے جو تمام کائنات پر وسیع اور محیط ہے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آج نہیں کل معاوضہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے یہ خود خیر و سرتنگ چشم ہیں

بیدل

انہوں نے اللہ کی رحمت کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم ”فردائی قیامت“ کو گزرے ہوئے کل میں محو کر دیں۔ اور یہ تہمت جو اللہ کے کرم کے دروازہ کو غبار آلود کر رہی ہے اس پر جھاڑو پھیر دیں۔

نومیدیم ستم کش خلد و حیم نیست
آسودہ ام خواب عدم میں فسانہ ہا

امرا کو عموماً نیند کی شکایت رہتی ہے اور کم خوابی کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ تن آسانی کے دلدادہ محنت و مشقت سے جی چرتے ہیں۔ آرام سے جس شخص کی گز رہے وہ آخر بے آرام ہی ہوتا ہے، مزدور دن بھر کی محنت کے بعد بیٹھی نیند سوتا ہے۔ امراء نے خواب آور تدبیر یہ نکالی کہ فسانہ سُنتے اور ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ”افسانہ گو“ جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ فسانہ سُنتے سُنتے امراء کو نیند آجاتی۔ اس لئے فارسی اور اردو علم ادب میں فسانہ اور خواب کو ایک دوسرے سے نسبت دی گئی۔ مطلب شعر یہ ہے کہ میں بہشت اور دوزخ کے فسانے سُنتا سُنتا خواب عدم میں آسودہ ہوں۔

عالے راسرگزشت زنگان از کار برد

ہر کجا افسانہ باشد پوچ کس بیدار نیست

ایک دنیا کو گزرے ہوئے لوگوں کے قصوں نے بیکار بنا رکھا ہے۔ بات یہ ہے جہاں کہیں افسانہ گوئی ہے وہاں کوئی شخص بیدار نہیں ہوتا۔ فسانہ ہے ہی خواب آور، شعر محولہ بالا میں یہ اشارہ ہے کہ بہشت اور دوزخ کی کہانیاں ہی ایسی خواب آور ہیں کہ میں فسانے سُنتے سُنتے خواب عدم میں نہایت آسودہ ہوں۔ اس لئے میری نومیدی خلد و حیم اور اُمید و بیم سے بے نیاز ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

آنسو می خوف ورجا خلد یقین پیدا کنید
 ورنہ ایمانیکہ مشہور است جز اعراف نیست
 اُمید و بیم جہاں ہو وہ یقین کا بہشت نہیں، بہشت اطمینان قلب
 کا نام ہے، اس لئے یقین یا ایمان جو مشہور ہے وہ ”اعراف“ میں ہے یعنی
 اُمید و بیم کے درمیان، اور یہ خلد یقین ہے اعراف کے معنی معرفت کا
 مقام۔

بلعیکہ اُمید و بیم اثر آمادہ بیم ست
 گز خود ہمہ فردوس بود ننگِ جحیم ست
 ”امید و بیم“ دو متضاد ممکن امور ہیں۔ ایک کا تصور دوسرے کی
 تصدیق ہے۔ اس لئے جس دل میں اُمید ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ”بیم“
 کا اثر قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے خواہ وہ سراسر فردوس ہو ننگ
 و دوزخ ہے۔

غالب دیر نہا غیر جنونت کہ کرد
 آنچہ تو خواندی بہشت خانہ بے آدمی است
 اگر تجھے صحرا نور دی کا شوق دامن گیر ہے تو ظاہر ہے کہ تیرے سر پر
 وحشت سوار ہے جسے تو بہشت سے موسوم کر رہا ہے ”خانہ بے آدمی“ ہے۔
 اگر آدم کے رہنے کی جگہ مناسب ہوتی تو آج وہاں آدم ہوتا مگر روایت
 یہ ہے کہ وہاں سے نکل آیا اور اب یہ خانہ بے آدمی ویرانہ ہے اگر اب
 بھی تجھے اس کی طلب ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ ”ظلم و جہول“
 کا مخاطب تو ہی ہے۔

پتہ دانا نزد تیشہ بیائے آرام
 از بہشت آنکہ بروں آمدہ آدم نیست

یہ تو ظاہر ہے کہ بہشت و خانہ بے آدمی ہے اور اگر یہ جائے آرام
آسائش ہوتی تو یہ کہاں کی عقلندی ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر
کلباڑی مارے اور آرام چھوڑ کر تکلیف برداشت کرے۔ اس لئے معلوم
ہوا کہ جس نے بہشت چھوڑا وہ آدمی نہ تھا۔ کیونکہ آدمی کی واحد امتیازی
خوبی یہی عقل ہے وہ کوئی ظلوم و جہول ہی ہو گا جس کو بہشت ملی اور
ترک کی۔

عافیت و دراست از نقش بنائی محرمی
خون بود رنگے کز و تصویر انساں می شود
در خیال آباد راحت آگہی نامحرم است
جلوہ نماید بہشت آنجا کہ جنس آدم است
یہی تخیل اس شعر میں بھی ہے کہ:-

راحت دریں قلم و از آثار ہوش نیست
خوابیدہ است اگر کسے آرام داشت است

یہ ظاہر ہے کہ ہوش و حواس کے ساتھ جسے راحت کہتے ہیں وہ میسر
نہیں، جو سویا ہوا ہے وہی آرام میں ہے۔ یعنی غفلت میں ہی راحت ہے۔
اہل عقل و ہوش کے لئے آرام و آسائش نہیں بہشت جائے راحت ہے
اور یہ معلوم ہی ہے کہ اس قیام راحت میں آدم کا قیام نہیں۔ اس لئے
یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جہاں آرام ہے وہاں بہشت نہیں۔ آدم تو طبعاً مقصد
اور خونریز واقع ہوا ہے اس سے یہ کب توقع ہو سکتی ہے کہ راحت و آرام
آسائش سے روشناس ہو، شکست عافیت آہنگ گردید بہر جاساز
آدم آفریدند۔

اے فضول وہم عقبی آدم از جنت چہ دید
 عبرت است آنجا کہ صاحب خانہ بہاں می شود
 تجھے عالم اوہام میں عقبی اور بہشت کے حور و قصور کے نظارے دکھائی
 دیتے ہیں۔ اتنا تو سمجھنا چاہئے کہ ہر امجد آدم نے جنت میں کیا دیکھا اور
 کیا پایا وہ بہشت سے بے آبرو ہو کر نکلے۔ ایسی جگہ جہاں صاحب خانہ خود
 بہاں کی حیثیت رکھتا ہو جائے عبرت ہے نہ جائے قیام۔
 دلت بعشورہ عقبی خوش است، ازین قافل
 کہ ہر کجا توئی آنجا بغیر دنیا نیست
 دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا تو ہے کہ عقبی بھی ہے لیکن تو یہ
 حقیقت نہیں سمجھ سکتا کہ جہاں تو ہے وہاں دنیا کے سوا اور کوئی مقام
 نہیں۔

بیرون ساخته است ازین عرصہ پہنچ کس
 واماندہ نیست اینکه نوگوئی فلاں گذشت

زین خاکداں کہ دامن دلہا گرفتہ است
 خلقی ز خویش رفت و بجائے دگر نرفت
 اس زمین نے ہمارے دلوں کو کچھ ایسا الجھا رکھا ہے کہ لوگ اپنے
 آپ سے گزر رہے ہیں یعنی مر رہے ہیں مگر کسی دوسری جگہ جانے کا نام
 نہیں لیتے۔ یعنی اس کرۂ ارض سے کوئی آج تک باہر نہیں گیا، جسے ہم
 کہتے ہیں گزر گیا وہ کسی اور جگہ نہیں گیا، اسی جگہ برا جا رہا ہے۔
 درختے کہ وعدہ نعمت شنیدہ آدم کجاست اکثر سکنش احمق ماند

وہ جنت جس کا وعدہ نعمت تو سن چکا ہے وہاں آدم کہاں ہے
جو صاحب عقل و شعور ہے وہاں تو اکثر احمقوں کا ڈیرا ہے یہ اشارہ
حدیث شریف ”اکثر اهل الجنة بلہم“ کی طرف ہے۔
گویند بہشت جگے خوبست آنجا ہم اگر دماغ باشد
(۶) تجدد اشغال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ عالم ہر آن بدلتا ہے، چونکہ
ہستی میں تکرار نہیں اور کسی شے کو ایک حالت پر قیام نہیں اس مشاہدہ
کی ”فرصت“ بھی نہیں رہتی، جب ہم ایک شے کو دیکھتے ہیں تو اس کے
کی جھپک میں یہ شے ہزاروں رنگ بدل چکی ہے۔ اس لئے بیدل
فرصت کا رونما کرتا ہے کہ ہے۔

ریمیدہ است چو ترغس وریں تماشا گاہ
ہزار چشم ویکے را نصیب دیدن نیست
علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس تحقیق کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔
ہزاروں سال ترغس اپنی بے نوری پہ رہتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وریں پیدا
لیکن بیدل کچھ اور بات کہتا ہے کہ ہمیں باوجود تور بصر و بصیرت
اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی شے کو آنکھ بھر کر دیکھ سکیں، اس لئے
کہتا ہے کہ

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش
لے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش
میں یہ نہیں کہتا کہ تو گھائے میں رہے یا فائدہ کی فکر میں وقت
فرصت ضائع کرے جو کچھ تو نے کرنا ہے کر گذر، کیونکہ یہ وقت فرصت

جو تجھے میسر ہے پھر نہیں ملے گا۔

بزم تجدد یا مست ایں با فرصت تحقیق کو
من منی دارم کہ تا دایم رسم او می شود

اس بزم تجدد امثال میں فرصت تحقیق میسر نہیں، میں جانتا ہوں کہ
”ایں ہوں“ جب ”انانیت“ () کی تحقیق کئے اس کے قریب
جاتا ہوں تو ”انانیت“ اتنے عرصہ میں ”اوی شود“ میرا تصور ”خودی“
محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کسی اور کا تصور جگہ لے لیتا ہے۔

ز عرض شبہ تہی نیست نسخہ تحقیق
تو آنچہ کردہ از خویش انتخاب شکاست

کسی شے کی تحقیق تو اس وقت تک ہو سکتی ہے جب ہم اس شے کو
جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر یہ گر گٹ کی طرح رنگ بدلے تو تحقیق مشکل
ہے۔ اس لئے جب ہم اس شے کو جیسی کہ ہے مشاہدہ کریں مگر جب یہ گر گٹ
کی طرح رنگ بدلے تو تحقیق مشکل ہے۔ اس لئے جسے ہم تحقیق کہتے ہیں وہ
در اصل ”شبہ“ ہے۔ اس شعر میں لفظ ”شبہ“ نہایت موزوں واقع ہوا ہے
”شبہ“ اور ”شبہ“ اور ”مشابہت“ دو اشیا میں ہوتی ہے، چونکہ تجدد میں امثال
بدل رہی ہیں اس لئے ہر ایک مثل پہلی اور دوسری کی شبہ ہے اور
امثال میں مشابہت ہے۔ ہم ایک مثل کو دوسری مثل پر قیاس کرتے ہیں
اور اسے تحقیق سے موسوم کرتے ہیں۔

تا تجدد جلوہ دار شبہ معنی بجا مست

کس چہ فہمید زیں عبار تہا یکے مانوس نیست

تا دم زنی چو آئینہ گردانده است رنگ

ابن کارگاہ جلوہ چہ مقدار نازکست

آئینہ میں "تمثال" ہی مشاہدہ ہوتی ہے۔ ایک سانس کے وقفہ میں یہ تمثال بھی اپنا رنگ بدل چکتی ہے۔ اس شعر کی لطافت اس حقیقت میں ہے کہ اگر دم آئینہ پر پھونکیں تو اس کی سطح پر ایک تہ بخارات کی جم جائیگی، جو ہمارے سانس کیساتھ پیدا ہوتے ہیں بلکہ سانس ہی بخارات میں۔ اس حالت میں آئینہ مگر رہو جائے گا اور عکس بھی مدہم پڑ جائے گا۔ "دم زدن" محاورہ ہے۔ اردو میں بھی ہم "دم مارنا" کہتے ہیں۔ جو دراصل فارسی ہی کا ترجمہ ہے۔ ہم محاورہ میں کہتے ہیں کہ "کس کو دم مارنے کی مجال ہے" یعنی کس کی جرأت ہے کہ بول سکے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ "کارگاہ جلوہ" اتنا لطیف ہے کہ آئینہ کی طرح تجھے اس کے سامنے سانس لینے کی فرصت نہیں تو نے سانس لیا اور اس کا رنگ بدل گیا۔

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانہ نعیرت

مرزہ برہم مزین تانگنی رنگ تماشا را

نیز:-

چشمیکہ کشائی بہ تامل بکشا تا از مرزہ رنگ جلوہ پا بخورد

ذرا احتیاط کے ساتھ آنکھ کھول ایسا نہ ہو کہ رنگ جلوہ کو مرزہ کی

ٹھوکر لگے۔ کتنا نازک خیال ہے!

نگہ ہر مورد، چو شبنم، ز شرم باید آب گردد

اگر بداند کہ بے محابا جلوہ گاہ کہ می خراشد

نگاہ ہر طرف بے لگام پھر رہی ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ کس کے

جلوہ گاہ میں بے ادب خرام کر رہی ہے تو شہنم کی طرح ماہے شرم کے پانی پانی ہو جاتی۔ ارشاد قرآن بھی یہی ہے کہ ”کثیری آیات ہیں جن پر یہ غافل یونہی گزر جاتے ہیں۔“

بستہ احرام صد عقبیٰ اہل اماچہ سود
فرصت گزشتہ ات پیش گزشتہ ہا گزشتہ

تو نے سینکڑوں عقبیٰ کی توقعات کا احرام باندھا ہوا ہے لیکن کیا فائدہ، تیری فرصت کے لمحات جو ابھی گزرنے باقی تھے ان دوراؤں کا تو توقعات کی انجمن میں گزرنے سے پہلے ہی گزر گئے، ”احرام“ حج کی تقریب پر باندھا جاتا ہے، اور یہ ایک ہی چادر ہوتی ہے، اور کفن کی بھی ایک چادر ہوتی ہے، تو نے احرام کفن اس توقع پر باندھا کہ عقبیٰ کا حج نصیب ہو گا مگر وہ تو نہ ہوا اور حج عقبیٰ کے ایام گزر گئے تو نے فرصت کا وقت احرام باندھنے میں ضائع ہی کر دیا۔ یعنی تو عقبیٰ میں کبھی نہ پہنچے گا۔

بہرہ واریسی از خود گزشتنی دارد
بہوش باش کہ امروز رفت فردا نیست

تو جس چیز کے پاس پہنچنا چاہتا ہے وہ تو خود گزر رہی ہے، سیل طرح فردا تو کبھی نہ دیکھے گا۔ ابستہ اس توقع میں ”امروز“ کی فرصت بھی تو ہاتھ سے کھو دے گا۔ امروز تو گیا مگر فردا بھی اسی طرح امروز بن کر گزر جائیگا۔

شاید بعض حضرات کے دل میں یہ دوسوسہ ہو کہ بیدل بھی
انتباہ | ”دہریہ“ ہے کہ عقبیٰ اور حشر و نشر و بہشت و دوزخ کا منکر ہے۔ بیدل منکر نہیں۔ لیکن ان اصطلاحات کی جو قرآن میں مذکور ہیں

اپنے فہم کے مطابق تاویل کرتا ہے، یہ ایک فقہی مسئلہ ہے کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا منکر کافر ہے۔ لیکن جو تاویل کرتا ہے وہ منکر نہیں، البتہ اس کا مطلب وہ وہ سمجھتا ہے جو عام عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے بیدل صحیح کہتا ہے کہ ہر ایک محقق کی تحقیق اس کی اپنی حدِ نظر ہے، بات بھی یہی ہے کہ ہر کس و ناکس غزالی اور رازی، بوعلی سینا اور فارابی نہیں، ذہنی درجات بلند و پست ہوتے ہیں۔ قرآن ”بلاغ“ اور ”بلغ“ کلام ہے جو ہر ایک زمانہ کے ذہن بلند و پست تک رسا ہے۔ بیدل کا جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں حیات بعدِ ممات پر ایمان ہے، وہ زندگی ایک واقعہ واحدہ یا ایک مسلسل واقعہ سمجھتا ہے۔ تہجد و امثال کے تحت جو کچھ تغیر مشاہدہ ہو رہے ہیں یا ہونگے وہی دنیا و عقبی وغیرہ سے تعبیر ہوتے ہیں اس لئے یہ ایک لفظی بحث ہے، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ نظریہ میں بہت اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر بھی پڑتا ہے، عقائد کا اختلاف صرف ”فروع“ میں ہے۔ اصول میں نہ اختلاف ہے اور نہ مسلمانوں کے کسی فرقہ میں ایسا اختلاف ہے۔ ہم بیدل کے مذہب پر بحث کر چکے ہیں، اس کے مطالعہ کے بعد کوئی شخص محض اختلاف عقائد کی وجہ سے بیدل کو خارج اسلام نہیں کہے گا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر یہ بھی واضح کیا جائے کہ جسے ہم عقبی سے موسوم کرتے ہیں اس کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف موجودہ حالات پر قیاس کر سکتے ہیں اور قرآن میں بھی اسی طرح سمجھایا گیا ہے کہ فرض کرو وہاں دودھ ہو گا مگر اس کا رنگ اور ذائقہ نہیں بدلے گا۔ اس مثال سے ایک کیفیت تو ذہن میں آتی ہے کہ وہ عالم کیسا ہو گا۔ لیکن جو شے ہمارے محسوسات سے بالاتر یا باہر ہے اس کا

تصور ہم نہیں کر سکتے۔

اس میں کچھ قباحت نہیں کہ ہم بحوالہ آیات قرآن واضح کریں کہ یہ دنیوی زندگی بھی جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتی ہے اگر ہم اسے اپنے اعمال سے جہنم نہ بنائیں۔ اور یہ کہ جس جنت کا وعدہ اصحاب رسول کریمؐ اور اہل ایمان سے کیا گیا تھا اس کا ایک حصہ دنیوی جنت بھی تھی اور ہے، اگرچہ آخرت کی نعمت بدرجہا بہتر ہے۔ الفاظ جنت اور فردوس اور عدن اور بحرین عموماً آیات قرآن میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے علماء نے بھی ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہی سمجھے کہ ان سے مراد عقی کے مقامات ہیں جہاں ہر ایک قسم کی نعمت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جنت کا ذکر ہے وہاں انہار جاری ہیں اور باغات ہیں اور مساکن طیبہ ہیں اس سے مراد ارضی جنت ملک شام ہے اور یہی الفاظ توراۃ میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور اسی ارضی جنت کا وعدہ ذریت ابراہیم بنی اسرائیل دینی اسماعیل سے کیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کو تو یہ صرف ملک شام ہی ملا۔ بنی اسماعیل کو مصر کی فراوانی، عراق اور ایران کی دولت و ثروت بھی ملی۔ لفظ فردوس عربی نہیں، پارسی ہے۔ اور پارسیوں کی مقدس کتاب ”ژند اوستا“ کے حصہ ”وینداد“ میں یہ لفظ ”پریز بدہ“ استعمال ہوا ہے۔ مراد شاہان فارس کے خیابان ہیں، جب یہ لفظ یونان میں گیا تو یونانی زبان میں ”پیراڈاش“ ہو گیا۔ عبرانی اور عربی میں ”فردوس“ ہوا۔ ”عدن“ بھی عربی لفظ نہیں۔ یہ ”سمری“ زبان کا لفظ ہے اور سمیری قوم عراق میں آباد تھی۔ اس لفظ کا مفہوم وہ سبزہ زار ہے جو دریا کے کناروں پر ہوتا ہے۔ ”بحرین“ عرب کا انتہائی جنوب مشرقی کونہ ہے،

یہ ایک جزیرہ ہے۔ اس کا مذکور سورہ "رحمن" میں ہے، یہاں دو دریا یا بحر کا اجتماع اب بھی ہے، اوپر کی سطح پر آب شور ہے اور دو تین گز نیچے آبِ فرات یعنی آبِ شیریں ہے۔ جزیرہ کے لوگ غوطہ لگا کر میٹھے پانی سے مشکیزے بسر لیتے اور یہی پانی پینے کے کام آتا۔ جزیرہ میں جب سے "پٹرول" دریافت ہوا تو چاہات بھی احداث کئے گئے، اس سے پیشتر لوگ میٹھا پانی بحر ہی سے نکالتے، بعض اوقات میٹھا پانی سطح پر بھی آجاتا ہے۔ "جمع البحرين" موتیوں کی برآمد کے لئے بھی مشہور ہے۔ یہاں کے موتی نہایت خوشنما آبدار ہوتے ہیں۔ قرآن میں ان الفاظ کا استعمال بطور پیش گوئی استعمال ہوا ہے کہ یہ مقامات جس کی زبانوں کے یہ الفاظ ہیں اہل ایمان کو عطا ہونگے۔ اور ہوئے۔ اور اب بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں مگر ہشتاف میں رہتے ہوئے جہنمی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس تحقیق کی تائید میں آیات قرآن میں ارشاد ہے کہ

قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة۔

ہم نے فرمایا کہ اے آدم تو اور تیری زوجہ اس جنت میں رہو۔

ظاہر ہے کہ اس ارشاد الہی کا خطاب آدم خاکی اور اس کی زوجہ کو ہے۔ اس لئے یہ جنت جہاں آدم اور اس کی زوجہ کی سکونت تھی۔ مادی جنت ہی ہو سکتی ہے، اور مادی کائنات سے باہر متصور نہیں ہو سکتی، زمین کی پیداوار ہی کا مذکور قرآن میں ہے کہ وجعلنا فیہا جنت من نخیل واعناب وفجونا فیہا من العیون لیاکلوا من ثمرة۔ (۲: ۲۳) توراۃ میں بھی انہی ارضی نعمتوں کا مذکور ہے جو بنی اسرائیل کو ارضی شام میں ملیں (مثنائی باب ۸) میں انہی چشموں اور ندیوں

اور وادیوں اور پہاڑوں اور گندم اور جو اور انگور اور انجیر اور انار اور زیتون اور شہد اور ان کی فراوانی کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ ”تجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوگی“ (فیہا ما یثاؤن) جس قوم سے یہ ارضی جنت ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے چھین گئی ان کی نسبت ارشاد ہے کہ۔

کم ترکوا من جنت و حیون و ذروع و مقام کریم
و نعمة کا نوا فکھین۔ (۱۲: ۲۵)

کتنے باغات اور چشے انھوں نے چھوٹے اور نلکے کھیت اور نفیس مقام اور نعمتیں جن میں وہ خوش و خرم تھے، ایسا ہی ہوا اور ہم نے یہی کچھ دوسری قوم کو میراث میں دیدیا۔
آدم کو اسی دنیا میں پیدا کیا گیا اور اسی دنیا میں اس نے رہنا ہے اور رہتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ جس غرض کے لئے اسے یہاں رکھا گیا ہے وہ پوری ہو۔ کیا اچھا شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ
تو کا بزمیں را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی
اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ کو مخاطب فرماتا ہے کہ
یا ایہما النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة
فادخلی فی عبدی، و ادخلی جنتی۔ (۱۲: ۲۰)
اے الطینان یا فہ نفس انسانی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ
تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پس میرے بندوں میں
داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو۔

ظاہر ہے کہ مقام راحت اور امن الطینان ”قلب“ ہی ہے۔ اگر یہ نہ

ہو تو سب نعمتیں بد مزہ ہیں۔ اہل جنت وہ ہیں کہ ”لا خوف علیہم ولا
 هم یحزنون“ جنہیں نہ کسی بات کا خوف نہ دھرد کا اور نہ محزون و غم،
 غرض بالکل مطمئن ہیں۔ آسودگی پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے کہ حالت یہ ہے کہ
 دنیا الم غفلت و عقبی غم اعمال آسودگی از مادہاں فاصلہ دارد

خاطرت چور جمع شد از ہر دو عالم فارغی

قطرہ دارے جوں گہریں بحرے پایاں برآ

جب تجھے ”اطمینان قلب“ حاصل ہو گیا تو دونوں جہانوں سے
 بے نیاز ہو گیا۔ بحر قطروں کا مجموعہ ہے یعنی اس عالم اثرات سے تو اسی
 حالت میں باہر آ سکتا ہے جب گوہر کی طرح اپنے آپ میں جمع ہو کر یہ جمعیت
 دل حاصل کر کے بحر سے باہر آ سکتا ہے، بلکہ بحر میں رہتے ہوئے بھی اس سے
 جدا ہے اور موج حوادث سے نہ تجھے کچھ خوف ہے نہ غم۔

لیکن بیدل کے نظریے ”بہشت“ میں کچھ اور بات بھی ہے۔ یہ کائنات
 خواہ ”درد سر“ ہو یا ”درد جگر“ بہشت کی بہت بڑی نعمت یہی ”درد
 دل“ ہے۔

گویند بہشت است ہاں راحت جاوید

جائیکہ بداعی نہ طید دل چہ مقام است

کہتے ہیں کہ بہشت دائمی راحت کا مقام ہے ایسی جگہ جہاں داغ
 سے دل میں طیش پیدا نہ ہو وہ کیسا مقام ہو سکتا ہے۔ ایک مطلع ہے کہ

مرد عا از ہستی مایس ہمیں آزاد بود

ور نہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

دائمی راحت ”عدم“ کے مترادف ہے، زندگی تو جود و جہد میں

ہے جو اسی کردہ ارض پر ہے۔

زمین گہری بزمگ سایہ باید منظم دیدن
چہ خواہی دید اگر درخانہ خورشید خوانند
اس لئے بہشت راحت جاوید ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔
درد عشق و مرثیہ راحت زہے فکر محال

ایں خبر یارب کنایں بے خبر آؤدہ است
درد عشق ہوا و عاشق کو راحت کی خوشخبری سنائی جائے یہ تو فکر محال
ہے، وہ کون بہ بوہ خبر لایا ہے۔

نہ در تقویٰ ہم خوشست اما تکلف بر طرف
درد دل را بندہ ام در دوسرے درکار نیست
جاننا ہوں نواب غایت زہد پر طبیعت اور حس نہیں آتی
(غالب)

اس کائنات کو "مادی" کہو جیسے کہ مادہ پرست کہتے ہیں، یا خیالی
صورتیں کہو جیسے کہ "ایڈیٹسٹ" کہتے ہیں، حقیقت پرست کے نزدیک یہ
صرف فکری بحث ہے اور محققین کی اپنی حد نظر ہے۔ اور صداقت سے غمالی
نہیں مثال یا عکس یا سایہ یا ظل ایک ہی معنی ہیں، چونکہ مثال آئینہ میں
رو نما ہوتی ہے اس لئے "آئینہ" پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہے وہ آج تک کسی
شاعر نے اس شرح و بسط سے نہیں لکھا۔

خورشید ز ظلمت کردہ سایہ بروں است

تما کے زحدوث آئینہ سازید قدم را
حادث وہ شے ہے جو پیدا شدہ ہو یہ کائنات حادث اور مخلوق ہے

اس میں اگر ”قدیم“ کی نل یا سایہ بھی مشاہدہ ہو تو ظاہر ہے کہ آفتاب حقیقت جو قدیم ہے آئینہ کائنات میں پر تو لگن ہو تو یہ عکس تو آفتاب نہیں ہے آفتاب آئینہ اور عکس سے باہر اور مجدا ہے۔ یعنی حادث قدیم نہیں ہو سکتا۔

ہمہ بشوخی مثال چشم باختم ایم
وگر نہ حسن بردن از کنار آئینہ است

بغیر عکس نہ انجم و گر چہ خواہی دید

اگر در آئینہ بینی جمال یکتارا

میں نہیں جانتا کہ تو اگر آئینہ میں ذات یکتا کا حسن مشاہدہ کرے
تو عکس کے سوا اور کیا دیکھے گا، اور وہ عکس سے باہر اور مجدا ہے۔

دخولت دل از تو تسلی نتوان یافت

جز اینکه در آئینہ توانی مثال است

”خلوت“ وہ یکسوئی ہے جہاں دوسرا نہ ہو۔ گوشہ دل میں بھی
خلوت کا مقام نہیں کہ اطمینان سے ہم تجھے دیکھ سکیں یعنی آئینہ دل کو
کثرت کے نقوش محو کرنے کے بعد بھی وہ خلوت حاصل نہ ہوئی کہ جلوہ
وحدت رونما ہوتا۔ اس آئینہ میں اگر کچھ دیکھنا ممکن ہو تو وہ ”مثال“
تھی نہ کہ خود حقیقت۔

کس دل کو دعوت ہے کہ حقیقت پرست ہے

آئینہ بھی اگر ہے تو صورت پرست ہے

”تا بجے نازی بحسن عاریت ما من آئینہ داری بیش نیست

تو کب تک ایسے حسن پر ناز کرتا ہے گا جو عاریت ہے، ہم تم نو

صرف آئینہ دار ہیں جس میں عکس ایک حقیقت کا پڑا ہے جو ہم سے باہر
اور جدا ہے۔ اس آئینہ میں ہم نے حق کا عکس ماریت لیا ہوئے یا دیا گیا ہو
دلت مقابل و آنگاہ عرض یکتائی
ثبوت وحدت و آئینہ خانہ و العجبیت

(۷) تجدد و امثال کا ایک اہم دور رس نتیجہ یہ ہے کہ ہم صرف
”امثال“ محسوس کر رہے ہیں، ”حقیقت“ کی طرف یہ امثال ضرور
اشارہ کرتی ہیں اور ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ”ہست“
پیش بینان بارگاہ الست پیش ازین رہنبرہ اندکہ ہست
(سعدیؒ)

”امثال“ محض صورتیں ہیں اور ہر آن بدلتی ہیں۔ اس لئے اگر انھیں
موہوم کہا جائے تو کچھ قباحت نہیں، ”حقیقت واحدہ“ ہے اور وہی
تمام صورتوں میں رونما ہو رہی ہے۔ انسان بے کسوت عبارت معنی
شناس نہیں ہو سکتا اور اسما کے پردہ ہی میں مسمی کی ہستی کا احساس
ممکن ہے اگرچہ ہم اس کی ”کنہ“ کو نہیں پہنچ سکتے۔ بیدل ایک ربائی میں
کہتا ہے کہ:-

آں جلوہ بے نشاں کہ نے رنگ و نہ بوست

پیدائی و پنہائی او حرف گوست

پنہاں زانسانکہ آنچہ اندیشی نیست

پیدا چندانکہ ہرچہ بینی ہمہ اوست

چونکہ حقیقت بذاتہ صورتوں سے معطر ہے اور ہم اسے کسی صورت سے
مشخص و معین نہیں کر سکتے اس لئے لاندہ رکہ الالبصار و هویدرک

الابصار، دھوا لطیف الخبیر۔ (۱۰: ۷) مولانا روئی بھی یہی کہتے ہیں کہ ”آنچہ در اندیشہ ناید آن خداست“ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ”پیدا چند آنکہ ہر چہ بینی ہمہ اوست“ جب وہی اوّل اور وہی آخر اور وہی ظاہر اور وہی باطن ہے، تو اوّل و آخر و ظاہر و باطن کے علاوہ اور کیا ہے جہاں اس کے غیر کی گنجائش ہو۔

سوا نسخہ تحقیق بیدل دقتے دارد

دو عالم جلوہ باید خواندن ہے رنگ فہمید

دو عالم یعنی ”دنی“ سے مراد عالم کثرت ہے اور کثرت اختلاف لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کثرت اور اختلاف اور اس کی رنگینی غرض سب کچھ ایک جلوہ ذات احد ہے جو خود بیرنگ ہے۔

عالم ہمہ یک جلوہ ذات احد است

ایں جانہ ہیولی نہ صورت جسد است

کثرت آثار چشم واکردن است

ایں صفر جو محو شد ہماں یک عذا است

بیدل کے شاعرانہ تخیل نے ایک سادہ امر واقعہ میں بھی ایک لطف

پیدا کر دیا ہے۔ آنکھ کی صورت بھی صفر کے مشابہ ہے، ایک پر صفر زیادہ کرتے جاؤ تو دس اور سو اور ہزار آلا تعداد ہو جائیں گے۔ جب ہم آنکھ کھولتے ہیں تو چونکہ آنکھ خود صفر ہے یہ صفر بھی ہم ہر طرف مشاہدہ کرتے ہیں اور یہی وحدت کو کثرت میں دکھا رہا ہے۔ اب آنکھ بند کرلو تو یہ صفر سب محو ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت ہمارے حواس محسوس کر رہے ہیں۔

چشم بند و گوش بند و لب بند
گر نہ بینی نور حق بر ما نهند
مدعا دل بود اگر نیرنگ امکان نختند
بہر ایں یک قطرہ خون صد رنگ طوفاں نختند

سیرول ”بیدل“ نے جو کچھ ”تجدد امثال“ پر لکھا ہے وہ بیان حقائق ہے اور تصویر کے دونوں کُسخ اس نے پیش کر دیئے ہیں۔ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، تصویر کے خط و خال نمایاں نہیں ہو سکتے اگر روشن طرف کے ساتھ سایہ نہ ہو۔ تصوف میں ایک فریق کی نظر اسی سایہ پر رہتی ہے، ان کے کلام میں فرسودگی اور مایوسی نمایاں ہے، بقول علامہ اقبال یہ فرسودگی غالب کے کلام میں بھی ہے، لیکن بیدل طبیعت میں ایک حرارت اور حرکت پیدا کرتا ہے، وہ فلسفہ آزار بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ منشا ہے اور ”لیس للانسان الا ما سعی“ اور سعی اور آزار لازم و ملزوم ہیں۔

مدعا از مستی مایس ہمیں آزار بود
ور نہ در کنج عدم آسود کی بسیار بود
جب ہماری زندگی اسی شے کا تقاضہ کرتی ہے تو اس تقاضہ کو پورا کرنا چاہئے، سکون و راحت تو عدم ہی کے مناسب ہے اس لئے اگر تم اس کے طالب ہو تو ”موت کی تمنا کرو“ بیدل تو اس بہشت کو بھی پسند نہیں کرتا جسے بے خبر لوگ مقامِ راحت کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جائیکہ بذاغی نہ طید دل چہ مقام است
اور اکثر اشعار میں اشارہ کرتا ہے کہ گمراہی کے مناسب راحت طلبی

ہوتی تو وہ بہشت کو چھوڑتا ہی کیوں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے راحت کہتے ہیں وہ آدم کی فطرت کے نامناسب ہے۔ ”جلوہ نما یہ بہشت آنجا کہ جنس آدم است۔“ اور صاف صاف لفظوں میں تلخ حقیقت بیان کرتا ہے کہ:-

عافیت دور است از نقش بنائے محرمی

خوں بود رنگے کزو تصویر انساں می شود

اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ اگر ان تلخ حقائق کی تلخی محسوس کرتے ہوئے انسان مایوس ہو کر بیٹھ رہے تو بیدل اسے ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

برو و عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

لے بہارستی از قدر تو دہوشیار باش

تمام کائنات کی متفقہ کوشش نے بے شمار دوروں میں سے گزر کر آخر کربہ ارض پیدا کیا۔ اور اس خاکدان کے بے شمار طبقات کا آخری ارتقائی نہبور انسان بنا۔ اس اہتمام کے بعد انسان کی تخلیق بجائے خود ایک مقصد تھا، جیسے ایک نخل ثمرور کا مقصد اس کا پھل ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شاخیں اور پتے غرض ہر ایک شے کا رآبدا اور مفید بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فطرت کوئی شے ناکارہ اور باطل پیدا نہیں کرتی یہ انسان پر جو کچھ بیدل نے لکھا ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ سر و دست یہ حقائق جو بیدل بیان کرتا ہے ہمارے سامنے ہیں کہ جسے ”تحقیق“ کہتے ہیں وہ بھی ”شبہ“ سے خالی نہیں۔

زعرض شبہ تہی نیست نسخہ تحقیق

تو آنچہ کردہ از خویش انتخاب شکست

اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ”تا تجد جلوہ دارد شبہ معنی

جاست، ”یہ تجد و امثال ہی کا کرشمہ ہے کہ ہمیں ”امثال“ یا شبہ کے بعد شبیہ نظر آتی ہے اور ایک دوسری کی غیر ہے۔ اس حالت میں کوئی شخص دعوے نہیں کر سکتا کہ وہ محقق ہے، کسی شے کی نسبت صحیح حکم ہم اسی حالت میں لگا سکتے ہیں جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو لیکن اس شے کی تصویریں یکے بعد دیگرے ایک دوسری سے مختلف ہماری آنکھوں کے سامنے سرعت سے گزر رہی ہوں تو تحقیق کی کونسی صورت ہے۔

بزم تجد و یاست ایں جا فرصت تحقیق کو

من منی دارم کہ تاوامیرسی اومی شود

جب ہمیں تحقیق کی فرصت ہی نصیب نہ ہو تو تحقیق ممکن نہیں۔ لیکن بیدل کہتا ہے کہ تحقیق کی ایک صورت ہے اور وہ ”سیر دل“ ہے، اس کو اصطلاح میں ”سیر النفسی“ بھی کہتے ہیں۔

زریں کار گاہ تمثال یا دل قناعت اولست

از ہر گلے کہ خواہی آئینہ رنگ دارد

اس عالم صورت یا تمثال میں مناسب یہی ہے کہ دل ہی پر قناعت کرے، امثال سرعت سے بدل رہی ہیں اور ان میں تکرار اور رجعت نہیں اس لئے ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس پر ہمارا قبضہ تصرف ممکن ہو۔ لیکن جو کچھ آفاق میں ہے اس کا عکس ہو ہو ہمارے آئینہ دل پر پڑتا ہے اور اس میں محفوظ ہو جاتا ہے، باغ میں پھول کی رنگینی پر بھی تجد و امثال اثر انداز ہے اور یہ ہر خطہ بدل رہی ہے۔ مگر دل میں ہر ایک رنگ اور رنگینی محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں گلگشت چمن چھوڑ کر سیر دل ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

ستم است اگر ہوسست کشد کہ بسیر ہوسمن در آ
 تو ز غنیمت کم نہ دیدہ در دل کشا بچمن در آ
 کتنی ستم ظریفی ہے اگر تجھے ہوا و ہوس سیر گلشن کی ترغیب دے تو خود
 غنیمت سے کم شگفتہ نہیں ہے دل کا دروازہ کھول کر چمن میں داخل ہو جا،
 تیرا دل خود ایک گلستان جہاں ہے۔

پے نافہ ہائے رمیدہ بولمپسند ز حمت جستجو
 بخیال حلقہ زلف او گرہ نور و بختن در آ
 نافہ یا بھولوں کی خوشبو تو فضا میں پریشان ہو رہی ہے۔ تو اس کے پیچھے
 دوڑ دھوپ کب تک کرتا رہیگا، اور کہاں تک کرے گا۔ وہ تو ہاتھ آنے
 سے رہی، اسی مطلوب حقیقی کی زلف کے پیچ و خم کے تصور میں محو ہو جا اور
 ختم میں داخل ہو جا جس کی فضا نافوں کی خوشبو سے بھر رہی ہے یا جو ہر ایک
 خوشبو کا سرچشمہ ہے۔ اس شعر میں رعایت لفظی اور معنوی کی اعلیٰ مثال ہے۔
 نافہ غزالہ کو "رمیدہ"، کہنا لفظاً اور معناً صحیح ہے کہ ہرن بھی "رم" کرتا ہے۔
 اور نافہ کی خوشبو بھی پراگندہ اور منتشر ہوتی ہے۔ زلف میں بھی گڑیں، پیچ
 اور خم ہوتے ہیں اور تذکر و تفکر میں سرزبانو کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے تو
 یہ بھی گھرہ کی شکل ہے، مطلب یہ ہے تو سیر دل میں اتنا انہماک اور استغراق
 پیدا کر کہ بیرونی دنیا و مافیہا سے غافل ہو جا، بیرونی دنیا عالم کثرت ہے
 اور کثرت میں پریشانی ہے۔ عالم دل میں خلوت ہے اور سکون اور
 راحت ہے اور مطمئن ہو کر جستجو حقیقت کر وہ اسی دل میں ہے تجھ کو بیرونی
 دنیا میں نہیں ملے گی۔

ز سروش نعل کبریا ہمہ وقت میرسد ایں ندا
 کہ بخلوت ادب و وفا ز در پروں نشدن در آ
 الہام کہہ کبریائی سے تجھے ہر وقت یہ آواز آرہی ہے کہ خلوت دل

وہ مکان ہے کہ اس کے باہر تو تیری نگاہ بے محابا ادھر ادھر دوڑتی رہیگی۔ تو اس مکان کے اندر ہی رہ اور اندر ہی اندر اس میں داخل ہو۔ داخلہ ہمیشہ کسی جگہ باہر سے ہوتا ہے اور مکان یا مقام ہی منزل گاہ ہے اس لئے تو مکان دل میں داخل ہو جا۔ اور پھر باہر نکلنے کا نام نہ لے۔ اگر تحقیق مطلوب ہے تو پہلے ”خلوت“ پیدا کرو۔

ہر سخن سنجے کہ خواہد صید مغنیہا کند
چوں زباں می باید اول خلوتے پیدا کند

گفتگو تو زبان ہی سے ہوتی ہے۔ مگر زبان تو محض ایک آہِ حرفِ صوت ہے۔ خیال اور الفاظ بیک وقت دل ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے اس لئے سخن کو اگر یہ چاہتا ہے کہ معانی کا شکار کرے تو جس طرح شکاری تنہا گھات میں بیٹھتے ہیں اور جس طرح زبان منہ میں خلوت نشین ہے پہلے خاموشی سے دل پر نظر کرے اور دیکھے کہ کیا کیا معانی اس پر الہام کردہ حریف و صوت سے منکشف ہوتے ہیں ”چوں جمع شد معانی گوئے بیاں توں زد“ خلوت کے بغیر جمعیت دل حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب تک یہ نہ ہو خیالات پریشاں اور پرہگندہ ہی رہیں گے اس لئے

دل جمع گن از کش مکش دہر بروں آ

کیں بجز در آغوش گہر رنجت کراں را

بحرِ بانی کے قطروں کا ہی مجموعہ ہے۔ مگر جو تہوج اس میں پیدا ہوتا رہتا ہے وہ قطروں کو پرہگندہ ہی رکھتا ہے۔ اس لئے کسی قطرہ کو جمعیت حاصل نہیں۔ موتی بھی قطرہٴ آب ہی ہے مگر جمعیت حاصل ہے۔ اور خلوت بھی اور بحرِ بے پایاں اور طوفان موج افزا میں امن و راحت میں رہتا ہے، اس بحرِ عالم میں بھی کش مکش اضطراب امواج کی

طرح ہے۔ اگر تجھے گہر کی طرح جمعیت حاصل ہو تو اس بحر سے باہر نکل کر
 بھی جمعیت ہاتھ سے نہ دیگا۔ اور ہمیشہ کنارِ عافیت سے ہمکنار رہے گا۔
 ”بے نیاز از بحر گرد و قطرہ چون گوہر شود“
 نینر:-

خاطرت گرج شدا ز ہر دو عالم فارغی
 قطرہ دارے چوں گہر زیں بحرے پایاں برآ
 ز سیر عالم دل غافلیم ورنہ جباب

سرے اگر بگریباں فرو برد ریاست

جباب اور دل کی شکل و صورت بھی ملتی جلتی ہے، ہم بیرونی دنیا میں
 اسی طرح بھٹک رہے ہیں جس طرح پانی کا بلبلا سطحِ بحر پر موجوں کے
 ساتھ بہ رہا ہو۔ اگر ہمارا دل، یہ جباب ذرا گریبان میں مٹھ ڈالے تو اسے
 فوراً معلوم ہو جائے گا کہ میں تو دریا ہوں۔ یہ دعویٰ انا الموجود، اور یہ
 سر بلندی، اور ہوائے غرور جو جباب کے سر میں سمائی ہوئی ہے اسی وقت
 تک ہے جب تک وہ اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا اور
 جب دیکھے گا تو ہوا نکل جائے گی اور وہ دریا میں جو اس کی اصل ہے محو
 ہو جائے گا۔ جباب اگر سر بلندی کے خیال میں محو نہ ہو اور ذرا جھک کر
 اپنے نیچے نظر کرے تو اس کو اپنی حقیقت جو دریا ہے معلوم ہو جائے گی، یہاں تو
 عجز و رکاوٹ ہے اور ہندگی سے سب کچھ ملتا ہے۔

بیارگاہ نیاز دار و فروتنی ناز سر بلندی

بخاک روزے دوریشگی کن دگر بیاں و شجر و پل

بروں دل نتوان یافت ہر چہ خواہی یافت

کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست

یہ لاجواب شعر ہے۔ جو کچھ بھی تو چاہتا ہے وہ مجھے دل ہی میں ملے گا۔

دل سے باہر ہرگز نہیں مل سکتا۔ تبد و امثال کے تحت ہم بیدل کے نظریے تحقیق پر بحث کر چکے ہیں نظریہ یہ ہے کہ جب ہم کائنات پر نظر کرتے ہیں تو اسے عالم صورت یا تمثال پاتے ہیں جس کو محسوسات کہتے ہیں اور ہم صورتوں کے سوا کچھ اور محسوس کر ہی نہیں سکتے، یہی عالم تمثال ہمارے آئینہ دل میں بھی منعکس ہو رہا ہے۔ اس لئے اب اہل دل جو اہل ذکر و فکر محققین ہوتے ہیں بیرونی دنیا میں سرگرداں نہیں ہوتے۔ اسی دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور استغراق کے بعد گوہر مقصود یعنی حقائق اشیاء معلوم کر لیتے ہیں، مشہور ہے کہ گنج خرابہ ہی میں مدفون ہوتا ہے، معذری کہتا ہے کہ :-

کیمیا گر بہ غصہ مردہ و رنج ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج
سُن کا گنج گرا نمانیہ تجھے مل جاتا (اقبال)
تو نے فرما دیا نہ کھودا کبھی دیرانہ دل

ویسے بھی تمام معذیات اور قیمتی جواہرات زیر زمین ہی ہوتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ کونسا خزانہ ہے جسے تو اپنے آپ سے باہر ڈھونڈ رہا ہے وہ تو تیرے ہی دل خراب میں ہے۔ اور یہیں ملے گا۔
”تدبیر“ کہتے ہیں کھودنے کو اسی کرید سے اسی تدبیر و تفکر سے تجھے حقیقت کا علم ہو گا۔

”جمیعت دل“، بخودی، انہماک اور استغراق سے حاصل ہوتی ہے۔
یعنی جب ہم بیرونی دنیا سے غافل ہو کر اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ لگائیں تو گوہر حقیقت پالیتے ہیں۔

ہزار جلوہ در آغوش بخودی محو است

جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب

یہاں خواب سے مراد انہماک و استغراق ہے جو توجہ کامل سے

ماصل ہوتا ہے جس سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اسی کا نام بین خودی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے، جو حضرات نفسیات سے واقف ہیں وہ شعور اور تحت الشعور اور لاشعور کی اصطلاحات سے واقف ہیں حقیقت عالم لاشعور میں ہے۔ لوگ تو شعور کے طالب ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اور وہاں پریشانی اور سرگردانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو خواب طلب، تو تحت الشعور بلکہ لاشعور طلب کر۔ ایک رباعی میں لکھتا ہے کہ:-

اشیاء عرض خیال دیدن بود دست

اسما ہمہ افسانہ شنیدن بود دست

ایں جملہ ز خود بروں دویدن بود است

انسان گشتن بخود رسیدن بود است

فلسفہ خودی اور بین خودی کو بیدل نے اس ایک رباعی میں بیان کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی خیال اور مادہ پرست فلسفیوں کا نظریہ بھی پیش کر دیا ہے کہ کائنات محسوسات میں سمع و بصر ہی اشیاء کا دیکھنا اور ان کو اسماء سے تعبیر کرنا ہے، جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ نمثال ہی ہیں، ہر حال محسوسات جو کچھ بھی ہیں انسان سے خارج ہیں موجود ہیں، اور انہی میں دوڑ دھوپ اپنے آپ سے باہر ہے۔ اور جو کچھ خارج میں موجود ہے وہ انسان سے علاحدہ اشیاء ہیں۔ انسان گشتن بخود رسیدن بود است خود شناسی خدا شناسی اور حقیقت رسی ہے۔

جمعیت حواس در آغوش بین خود لیست

از ہوش بہرہ نیست کسے را کہ مست نیست

عام خیال تو یہ ہے کہ جو مست اور بین خود ہو وہ بے ہوش ہوتا ہے مگر بیدل نے شاعرانہ صنعت یہ پیدا کی ہے کہ اعضاء کو جمع کر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ بے ہوش وہ ہے جو مست نہیں کیونکہ بین خودی میں جمیع حواس ممکن ہے۔

اور بخودی اور مستی ایک ہی بات ہے۔
 ان تمام محولہ بالا اشعار کا منہوم یہ ہے کہ بیرونی دنیا میں تجد و امثال
 سرگرم عمل ہے اور زمان و مکان کی قید بھی ہے۔ اور امثال کے بدلنے اور
 دیگر امور متعلقہ کی وجہ سے ہمیں فرصت تحقیق ہی نہیں ملتی تو تحقیق کی کونسی
 صورت ہے؟ یہ عالم دل ہے جہاں ہر ایک واقعہ جو بیرونی دنیا میں وقت
 گذشت ہو چکا ہے اب پھر واپس نہیں آسکتا اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا
 نہیں ویسا ہی من و عن موجود اور محفوظ ہے۔ حافظہ کی مدد سے ہم اسے
 پھر حال میں لاسکتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ مستقبل میں واقع ہونے
 والا ہے اسے بھی حال میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے زمان و مکان صرف خارجی
 دنیا میں ہے دل میں یہ محو ہو جاتے ہیں۔ تذکرے زمانہ ماضی اور تفکر سے مستقبل
 کو ہم حال میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

بظاہر حضرت انسان کو آب گل سمجھتے ہیں
 مگر اہل نظر ہستی کا اس کو دل سمجھتے ہیں
 مہ عا دل بود اگر نیرنگ امکاں ریختند
 بہر اس یک قطرہ خوں رنگ طوقاں ریختند
 قیامت ے دماز پردہ خاک کے کہ انسان شد (غالب)
 عارف رومی کا بھی یہی ارشاد ہے کہ:-

اے برادر تو ہمیں اندیشہ مابقی تو استخوان و ریشہ
 ”زمان“ کیا ہے؟ واقعات یا حالات کو یکے بعد دیگرے مشاہدہ کرنا
 مکان کیا ہے؟ حالات کو کسی خاص مقام میں دیکھنا۔ چونکہ زمان مکان
 بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہم غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ”حال“ بدل
 رہا ہے جو مکان و زمان سے علاحدہ نہیں دیکھ سکتے۔ حالانکہ ہم ہر حال میں
 حال ہی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماضی معدوم اور مستقبل موہوم امور ہیں،

حال ہی معلوم ہے۔

”تجدد امثال“ پر ہم بیدل کے نقطہ نظر سے مختصر مگر فہم و تفہیم کے لئے کافی بحث کر چکے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ”دل“ ہی ہے جس کی سیر ہماری تخلیق کا منشا ہے، بیدل اکثر اشعار میں اسی پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ باہر ہے تو اس سے اور وہ تجھ سے بے تعلق نہ بھی ہو پھر بھی یہ سمجھ لے کہ تیرا دل یا قلب یا ذہن بیرونی دنیا سے افضل ٹھے ہے۔ اس لئے تو مسجد ملائک ہے اور تمام کائنات تیرے ہی لئے مسخر ہو چکی ہے۔

انسان کہ فلک باست سرافکنندہ او
در حیرت او گم است دانشدہ او
دارد غایتی کہ در خارج و ذہن
ہر چیز کہ آفریدہ شد بشدہ او

تیرا راز پانہ سکے ملک تیرا بار اٹھانہ سکے فلک
کوئی پہنچا تیری نہ گرد تک وہ ہیں دور تر تک تازہ میں
یہ سماک سماک کا فاصلہ تیری اک نگاہ نے طے کیا

جسے تو سمجھتا ہے دور تر ہے قریب راو دراز میں
انسان کی بلندی مرتبہ پر بیدل نے جو کچھ لکھا ہے کوئی
خودی کیا لکھے گا اور اس کے ضمن میں خودی اور بخودی پر
جو ممکنانہ بحث کی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ سر دست
ہمارا مقصد اتنا ہی ہے کہ قارئین کرام بیدل سے روشناس ہوں۔ اگر خدا
نے توفیق عطا فرمائی تو تفصیلی بحث بھی کی جائے گی۔ خودی سے مراد
خود شناسی ہے، انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا صحیح مقام کائنات

میں کیا ہے، اور یہ کہ اس مقام کا تقاضہ اور مطالبہ کیا ہے؟ جب یہ راز اس پر منکشف ہو گیا تو وہ سمجھ جائے گا کہ تمام کائنات اس کے سامنے جھکتی ہے، وہ صحیح معنی میں ”خلیفہ فی الارض“ ہے۔

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی و بخودی ایک خاص مقصد کا حامل ہے۔ اور بلاشبہ قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، بیدل نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے علامہ اقبال کی نظر بھی اس پر ہے اور علامہ کے اکثر اشعار میں بیدل کا تخیل کار فرما ہے۔

بیدل کہتا ہے :-

بیدل بحصول رزق آمادہ بسر سگ چاکر سگ گشت خربند و خیر
از مخترعات کارگا و امکاں ایں تنگ شعور نیست جز صنع بشر
طبقہ حیوانات میں حاکمی اور محکومی صرف عالم انسانی میں مشاہدہ
ہوتی ہے۔ انسان تمام طبقہ میں باشعور حیوان ہے، امکانات میں سے
جو امر ممکن ہے وہ اسی تنگ شعور انسان کی اختراع ”حکومت“ ہے،
کہ اپنے ہی ہم جنس انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ اور حاکم و محکوم کا
اعتیاز پیدا کر رکھا ہے۔ بیدل اس چاکری اور بندگی کے اسباب کی
تشخیص بھی کرتا ہے، کہ یہ احتیاج رزق ہی ہے، اور کثرت رزق کی
طلب اور اس کے لئے زراعت و زرمی کی ہوس، بیدل اس کی مذمت کرتا ہے۔

امروز قدر ہر کس مقدار مال جاہ است

آدم نمی توان گفت آن را کہ خرب نباشد

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج ہر ایک شخص کی قدر و منزلت مال و جاہ کی مناسبت کے ساتھ ہے، یہ بار دنیا جو اہل مال و دولت نے اپنی
پشت پر اٹھایا ہوا ہے گاؤں و خہری کا کام ہے۔

فلک تکلیف جاہست گرد ہر حال حماقت زن
 کہ غیر از گناہ و توند کشیدن بار دنیا را
 مشہور ہے کہ کرۂ ارض گائے کے سینگوں پر ہے۔ اس لئے اگر آسمان
 نے تجھے دنیوی جاہ کے لائق سمجھا ہے تو یہ سمجھ تجھے آدمی نہیں بلکہ پشو سمجھا
 کیونکہ گائے ہی دنیا کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

در ہمہ حال آدمی شخص ملک سیرت است
 یک بجاہ اندکے ناز خرمی می کند
 آدمی تو فطرۃً نیک ہی ہے اور بہر حال فرشتہ سیرت ہے مگر مال و
 جاہ کے ساتھ دولتیاں بھی جھاڑتا ہے یہ خرمی مال و جاہ ہی کا کرشمہ ہے۔

کمال خواجگی در این صوفۃ الطلس است اینجا
 اگر این است عزت آدمی آں بہ کہ خر گردد
 اگر صوف و الطلس اور دیبا و حریر سے آدمی کی عزت ہے تو بہتر ہے
 آدمی گدھا بن جائے، جس پر زریں پالان ہو۔

بے زریں متعین جو ہر انسانی نیست
 آدم آست کہ مال و حشمش خسر نکند
 اگر کوئی شخص بے زر ہو تو محض بے زریں کوئی عیب نہیں، کیونکہ
 زر معیار شرافت انسانی نہیں ہے، عموماً اہل علم بے زر ہی ہوتے ہیں،
 لیکن یہ ممکن ہے کہ آدمی جاہ و حشمت کے ساتھ گدھا ہو اس لئے آدمی وہ
 ہے جسے جاہ و حشم گدھا نہ بنائے، اگر بدولت برسی مست نگوی مردی
 بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ

آخر ز فقر بر سر دنیا زدیم پا
 خلقے بجاہ تکیہ زدو ما زدیم پا
 میں نے فقر کے ساتھ دنیا کو ٹھکرایا، لوگ تو جاہ و حشمت پر

تکیہ لگائے بیٹھے ہیں میں نے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ اس لئے

ہمتے گرہست، پائے برسر دنیا زنید

ہمچوں گردوں خیمہ در عالم بالا زنید

اگر کچھ ہمت ہے تو دنیا کو ٹھکرا دو

آسماں کی طرح عالم بالا میں خیمہ گاڑ دو

کسی مقصد کے حصول کے لئے کچھ مناسب وسائل اور بالواسطہ
لوازمات اور محرکات ہوتے ہیں اور ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے "خود شناسی"
ممکن نہیں جب تک "آزادی نصیب نہ ہو، اور آزادی حاصل نہیں
ہوتی جب تک پراگندہ روزی ہو، اور "رزق کریم" میسر نہیں ہوتا جب تک
احتیاج اغیار کی دستگیری پر مجبور کر رہا ہو، جو شخص اپنے ہی نفس میں
زیوں ہو اور بوجہ احتیاج ذلت محسوس کر رہا ہو وہ عارف حق نہیں
ہو سکتا۔ اس موضوع پر مزید بحث ہم بیدل کی اخلاقی شاعری کے
تحت کریں گے۔ سر دست دیکھنا یہ ہے کہ دنیا طلبی کس حد تک خود شناسی
کی سید راہ ہے؟ جس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں بھی "حیوۃ الدنیا دزین تھا" کی مذمت کی گئی
ہے۔ دنیا کیا ہے جو نزدیک تر ہو، "ادنیٰ" شے نزدیک تر ہوتی ہے
اور عجلت اور سہولت سے ہاتھ آجاتی ہے۔ اس کے لئے زیادہ جدوجہد کی
ضرورت نہیں ہوتی اور جو شے دور تر ہو اس کے لئے سعی بھی زیادہ کرنی
پڑتی ہے۔ مگر طبائع انسانی عجلت اور سہولت پسند واقع ہوئی ہیں۔
ادنیٰ شے دنیوی مفاد ہے جو محسوس اور نزدیک ہے۔ اور یہ ادنیٰ حیوانی
زندگی کے مناسب ہے۔ اور اس میں انسان بہائم سے بڑھ کر نہیں۔
یہی خورد و نوش اور پوشش اور آرام و آسائش انسان بھی چاہتا ہے،
اور اس کے اسباب بھی نزدیک ہی موجود ہیں۔ جس سے دیگر حیوانات

بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی زندگی ”حیوۃ الآخرہ“ ہے، بیدل نے اسی ادنیٰ حیوانی زندگی کی مذمت کی ہے اور اہل دولت و ثروت کو گاؤں و خرو سے تشبیہ دی ہے۔ یہ فاضل ہے کہ اگر کوئی گاؤں و خرو ہی بننا پسند کرے تو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اور اس اعلیٰ مقام سے واقف نہ ہو گا جو حضرت انسان کا ہے۔ چونکہ اکثریت گاؤں و خرو ہی ہے اور اہل علم و ہنر اقلیت میں ہیں۔ اس لئے جو لوگ خود شناس ہیں ان کو فقر و فاقہ ہی میں زندگی اس وقت تک بسر کرنی پڑتی ہے جب تک نظام معاشرت و معاشیات میں انقلاب پیدا نہ ہو اور ان کو پیدا کرنا چاہئے۔ گاؤں و خرو اس کی اجازت نہیں دیں گے مگر ان کی کوشش ضرور بار آور ہوگی۔ اہل علم ہمیشہ عسرت ہی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ خواجہ کی شکایت بجا ہے کہ

فلک بمردم سفلہ دہد نہ مام مراد

تو اہل دانش و فضل عین گناہست بس

اہل علم توکل پیشہ ہیں۔ لیکن توکل کا وہ مفہوم نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے، اور افسردہ دل ہو کر مایوسی کی تصویر بنے رہے۔ بیدل کہتا ہے کہ:-

فسردن گر ہمہ گو ہر بود بے آبرو باشد

بکن جہد آفتد رکز خاک برداری توکل را

اگر افسردگی سرتاپا گوہر بھی ہو پھر بھی بے آبرو ہے تجھے اتنی کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ توکل کو خاک مذلت میں نہ ملنے دے۔

دل از خمار طلب خون کن و شراب طلب

جگر بتشنہ بی واکذار و آب طلب

مباش ہچو گہر مردہ ریگ این دریا

نظر بلند کن و ہمت جباب طلب

زعافیت نتوان مژدہ کشایش یافت
بدل شکستے اگر ہست فتح یاب طلب
مترس از زخم ناسورائے جراحت دل
بزلف یار بزن دست و مشکتاب طلب

طلب کا احساس ایک فطری امر ہے۔ طالب ایسے مطلوب کو طلب کرتا ہے جو غائب ہو اگر مطلوب حاضر ہو تو طلب مفقود ہوتی ہے۔ پانی کی طلب پیاسا کرتا ہے، جسے پیاس ہی نہ ہو پانی طلب نہیں کرے گا جب پانی ہاتھ آئے اور پی لیا اور پیاس بجھ گئی تو طلب غائب اور مطلوب حاضر ہو گا۔ افسردگی اسی حالت میں ہوتی ہے جب جدوجہد کی طاقت نہ ہو۔۔۔۔۔ اور طاقت ہو اور عمل میں نہ آئے، اس لئے ادنیٰ حیوانی زندگی کے اسباب کی طلب جلدی ہی افسردگی پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ محدود ہے، لیکن اعلیٰ زندگی کی کوشش کا اجر غیر ممنون ہے۔ اس کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ بیدل اس لئے بہشت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا کہ وہ مقام عافیت ہے۔

گویند بہشت است ہماں راحت جاوید
جانیکہ بداغے نہ طید دل چہ مقام است
بیدل کہتا ہے کہ انسان خود شناس ہو نہیں سکتا اگر افسردہ ہو۔
بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو زاشک آنہمہ کم نہ، قدے نہ آبلہ پا طلب
زمراد عالم آب و گل، بدرجنوں زین و اگسل
اثر اجابت منفعل ز شکست و ست و عاطل
طلب تو بس بودایں قدر کہ زمعنی تو بیری اثر
بخودت اگر نرسد نظر بنیال چوچ و خدا طلب

چہ خوش آنکہ ترک سبب کنی، بقیں رسی و طرب کنی
 ز حقیقت آنچه طلب کنی بطریق بیدل مایط
 ان اشعار میں بیدل بلند سہتی اس درجہ تک واضح کرتا ہے کہ اسباب
 کی تلاش تکمیل مقصد کے لئے کم بہتی ہے۔

اگر از نام خضر آگاہ باشی ہمہ گر منزلے در راہ باشی
 خضر کا کام تو منزل کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور خضر کی ضرورت
 اسی وقت تک ہے جب مالک منزل سے دور ابھی راستہ میں ہے۔ جب
 منزل پر پہنچ گیا تو خضر کی ضرورت یا طلب ختم ہو گئی۔ خضر ایک سبب
 ہے یا وسیلہ ہے اور مقصد منزل ہے، اگر تو منزل پر پہنچ کر بھی خضر کو یاد
 کر رہا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے تو ابھی راہ میں ہے۔ ان اشعار میں بیدل ترک
 اسباب کی تلقین نہیں کرتا۔ اسباب کی طلب تو بہر حال رہے گی مگر
 بیدل یہ کہتا ہے کہ اسباب کی تلاش اپنے وجود سے خارج میں نہ کر اگر
 تجھے عافیت مطلوب ہے یعنی جس منزل پر تو پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے
 نہ تو کسی رہنما کو تلاش کر اور نہ عصا کا سہارا لے۔ یہ سب خارجی اسباب ہیں
 اور ان کی احتیاج کا احساس تجھے آخر افسردہ بنا کر رکھ دیگا۔ البستہ آنسو
 تیرا ہے اور تیری ہی آنکہ سے ٹپکتا ہے اور مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو
 مارے اسرنج و غم کے آنکھوں سے گرتا ہے، رونا اسی بات کا ہے کہ
 جو مقصد تو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے اسباب تیرے ہی وجود میں
 موجود ہیں بہر حال آنسو ایک قطرہ آب ہے، حقیر شے سہی، تو کیا اس سے
 بھی گیا گزرا ہے۔ منزل تک سفر طے کرنا قدم کے بغیر ممکن نہیں تیرا
 آنسو ”آبلہ پا“ ہے۔ ”آبلہ پا“ وہ شخصیت ہے جس کے پاؤں میں چھالے
 ہوں اور چھالے سفر سے ہی پڑتے ہیں، تیرا آنسو سراپا ”آبلہ پا“ ہے۔
 تو قدم اسی سے طلب کر کہ بے دست و پا رواں ہے۔ یعنی خارج اسباب سے

قطع نظر کر، اسباب اور محرکات وغیرہ سب تیرے ہی وجود میں موجود ہیں۔ اس عالم آب و گل کو عالم اسباب کہتے ہیں تو اس سے قطع تعلق کر، جنوں کا دروازہ کھٹکھٹا۔ دعائیں مانگنا تو ان کا کام ہے جو مایوس افسردہ خاطر ہوں۔ جب ان کی اپنی کوشش سے مقصد حاصل نہیں ہوتا تو غیر کے آگے دست سوال دراز کرتے ہیں: ”لیس للانسان الا ما سئى“، ہمت مردانہ کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش نہ چھوڑے۔ عالم اسباب انسان سے خارج ہے۔ اس کے آگے دست دعا دراز نہ کر، اگر تو چاہتا ہے کہ تیری دعا قبول ہو تو دست دعا کو توڑ دے اثر اجابت منفعل، وہ اثر جو قبولیت پر موثر ہے خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ لوگوں نے ایام جاہلیت میں اسی عالم آب و گل کو اپنا حاجت روا سمجھ رکھا تھا اور جل دیوتا اور انٹی وغیرہ کے حضور پراثر تھا کرتے تھے، یہ سب ہماری ہی خدمت پر مامور ہیں۔ اس شعر میں بیدل نے لطیف بات یہ پیدا کی ہے کہ عالم اسباب میں سرگردانی اور مقصد کے لئے اسباب کی تلاش عقل کا کام ہے تو جنوں کا دروازہ کھٹکھٹا اور عقل حیلہ گر کے فریب میں آکر عالم اسباب میں پریشان نہ ہو۔ اس موضوع پر مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ تیری طلب کی انتہا تو اتنی ہے کہ عالم صورت میں حقیقت آشنا ہو اور یہ حقیقت تجھے سیر دل یا نفسی ہی میں مشاہدہ ہوگی۔ اگر تو خود شناس نہیں ہے تو پھر عالم خیال میں خدا کو طلب کر، اسی کے ہم معنی یہ شعر بھی ہے کہ۔

حبیب ہر بوج طرب گاہ حضور دریا ست

فکر خود کن گرت اندیشہ رب باید کرد

گم گشتہ تحقیق خود آوارہ وہم است

مارا بگذارید بدر طلب ما

لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نسبت عجب ابلہ فریب باتیں اختراع کی ہیں۔ بعض تو یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہماری دُعاؤں قبول ہوتی ہیں، ایسے مستجاب الدعوات مرجع جہلا ہیں۔ ان کی دُعا کیا ہے حکم ہے اور خدا کو ماننا پڑتا ہے، حضرت ابراہیم کی دُعا باپ کے حق میں قبول نہیں ہوئی۔ نوح کی بیٹے کے حق میں رد ہوئی ہے۔

آخری شعر میں بیدل کی تلقین یہ ہے کہ ترک سبب کن، سبب کو مسبب الاسباب نہ سمجھ۔ تو یقین یعنی ایمان کے درجہ پر پہنچ جائے گا۔ اگر تو اس حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو طلب بھی اُس طریق سے کر جس طرح بیدل کر رہا ہے۔ گذشتہ از سر مطلب تمام شد مطلب، اس تشریح کے بعد اب اشعار محولہ بالا کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

دل از خمار طلب خو کن و شراب طلب الخ

یعنی پہلے احساس طلب ہونا چاہئے، اور طلب کو مطلوب سے کچھ مناسبت بھی ہونی چاہئے۔ پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے رنج خمار شراب ہی سے رفع ہوتا ہے۔ طلب مثل خمار اور تشنہ لبی ہے۔ جب اس کا احساس ہوگا تو بقدر شدت خود بخود ایک تحریک حصول مطلوب کے لئے پیدا ہو جائے گی۔ لیکن احساس طلب باہر سے نہیں آتا، ہمارے ہی وجود میں ہے، اس کی تسکین بھی ہم ہی محسوس کرتے ہیں۔ گہر کی طرح قعر دریا کی ریت میں مردہ کی طرح مدفون نہ ہوا اپنی نظر بلند رکھ، حباب کی ہمت دیکھ کہ سطح دریا پر پھر رہا ہے، ”فتح باب“ در مراد کا کھلنا، اگر دروازہ کھلا ہو تو ہم مکان میں بے تکلف داخل ہو سکتے ہیں عاقبت یعنی آرام طلبی سے کشائش کا ممکن نہیں۔ اگر تیرا دل شکستہ ہے تو سمجھ دروازہ مراد کھلا ہے، اگر بند ہوتا تو توڑنا ہی پڑتا کہتے ہیں کہ زخموں کا علاج مومیائی سے ہوتا ہے اور یہ مشک سے تیار ہوتی ہے

مشک کو زیتون کے تیل میں ملا کر زخم پر لگاتے ہیں تو مندمل ہو جاتا ہے۔ جراحت دل یعنی دل کا زخم اگر ناسور کی صورت اختیار کر لے تو گھبرانا نہ چاہئے۔ یار کی زلف تک دست درازی کر اور وہاں سے مشک ناب طلب کر ان اشعار میں بھی بیدل افسردگی اور مایوسی کی مذمت کرتا ہے کہ ہمت مردانہ کے مناسب نہیں۔

ہمت بلند دار کز اسباب اعتبار

بے عزتیت آنچہ نیاید بکار مرد

”اسباب اعتبار“ ہر ایک شے کسی اسم سے تعبیر ہوتی ہے اس لئے کائنات کی اشیاء ”اعتبارات“ ہیں، کوئی شے مقبر نہیں ہو سکتی جب تک میز اور کسی نام سے موسوم نہ ہو۔ کائنات میں ہر ایک شے کا آمد ہے مگر ”بے عزتی“ ایک ایسی شے ہے جو مردوں کے کسی مصرف کی چیز نہیں۔ یعنی ہمت مردانہ کبھی بے عزتی گوارا نہیں کرتی۔ بیدل کہتا ہے کہ۔

بہ کہ بروز حشر باز کنی پیش کریم

ورنہ زکم ہمتیت غدر گناہ خواستن

تو نے قیامت کے دن کریم کے حضور پیش ہونا ہے۔

بجناب کرم افسون و رعب پیش مبر

بے گناہی گنجے نیست کہ آنجا بخشد

بخشش تو گناہ کی ہے۔ بے گناہی ایسی شے نہیں کہ کریم کے حضور پیش کی جائے۔

ز ساز مجد رحمت ہمیں نواست بلند

کہ اے عدم صفات کاش کے گناہ کنید

در گاہ رحمت سے یہ آواز بلند آہنگی سے آہری ہے کہ ”ولا تقنطوا

من رحمت اللہ“ انسان کیا ہے ”لم یکن شی مذکوراً“ عدم تھا،

اور عدم میں محو ہو جائے گا۔ اگر اس سے گناہ بھی سرزد ہو تو غنیمت ہے بلکہ
اعجاز ہے۔

ماجر اکم کن زنیروز بدو نیکم میرس
من عدم بودم عدم چیزیکہ بود آورده است
از چمن تا انجن جوش بہار رحمت است
دیدہ ہر جا بازی گرد دود چار رحمت است
کودمانے آنکہ ما از تا خدا منت کشیم
کشتی بیدست و پائے ہا کنار رحمت است
احسان تا خدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں (ذوق)
خواہ ظلمت کن تصور خواہ نور آگاہ باش
ہرچہ اندیشی نہاں و آشکار رحمت است
قدر دان غفلت خود گر نباشی جرم کیست
آنچہ عصیاں خواندہ آئینہ دار رحمت است
وحشی دشت معاصی را دور زوئے سر دہید
تا کجا خواہد رسید آخر شکار رحمت است

حقیقت بھی یہی ہے کہ واجب ہے انسان غلطی کرے اور گناہ اور غلطی
ایک ہی بات ہے اگر غلطی نہ کرے گا تو بہائم سے بہتر ہو گا کیونکہ بہائم غلطی
نہیں کرتے یا خدا بن جائے گا کیونکہ ذات باری ہر ایک عیب سے
پاک ہے انسان تو خدا ہو نہیں سکتا۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین
زمین فلک شود و آدمی خدا نشود
البتہ بہائم سے بدتر ہو سکتا ہے، غلطی اس لئے واجب ہے کہ

انسانی ذہنی ارتقاء اسی میں ہے انسان کبھی کامل نہیں ہو سکتا وہ صرف ذات الہی ہے۔ آفرینش سے انسان غلطی کرتا رہا ہے اور ترقی بھی کرتا آ رہا ہے، بہائم غلطی نہیں کرتے اور ایک ہی حالت میں آفرینش سے ہیں۔ بقول بیدل ”بے مصلحت نیست ظہور شیطان“ یہ ممکن ہے کہ انسان بہائم کی طرح غلطی نہ کرتا، گناہ نہ کرتا، مگر وہ انسان نہ ہوتا، گاؤں خرب ہوتا۔ لیکن غلطی ہو یا گناہ اراداً کرنا انسانیت کے شرف کو بڑے لگانا ہے۔ سہواً ہو تو اس کا ازالہ کرنا چاہئے اور یہی ذہنی ترقی کا مطالبہ اور تقاضہ ہے۔ بہر حال غلطی انسانی امتیازی خوبی ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی جس کا تعلق بالواسطہ ”نودی“ سے ہے۔ عموماً اہل تصوف پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور کسی حد تک بجا بھی ہے کہ تصوف افسردگی سکھاتا ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ تصوف نتیجہ بیکاری ہے۔ اگر کوئی اور کام کرنے کا ہوتا تو اس طرف توجہ ہی کون کرتا۔ اور ناداری کا نتیجہ افسردگی ہے۔

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد

غافلان نام فضولی را تصوف کردہ اند

لیکن ایک بات ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہئے اور اس ضمنی بحث میں ہم نے اسی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اہل علم کو مجبوراً فقر و فاقہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ علم سے کنارہ کش ہوں اور اہل دنیا کی طرح بہائم کی زندگی بسر کریں، ورنہ اس کے سوا جیسے کہ حالات ہیں چارہ نہیں کہ بُری بھلی زندگی جیسی بھی ہے بسر کریں، لیکن ان حالات میں خود داری یا وضع داری کو خوش اسلوبی سے نبھانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے اکثر اہل علم نے امر کی سرپرستی قبول کی۔ اس کی مذمت بیدل کرتا ہے۔ چہار عنصر کے تحت ہم بیدل کا نظریہ مدح و ذم بیان کر چکے ہیں کہ حقیقت بھی

یہی ہے کہ جب حکومت اہل علم کی سرپرست ہو تو وہ اہل علم کی قوت فکریہ کو خرید لیتی ہے۔ تمام نامور شعرا بادشاہوں اور امرا کے مداح ہی گذرے ہیں۔ یہ دریلوزہ گری خود داری کے منافی ہے۔

کاش مدح و ذم سے ناواقف رہیں اہل سخن
آبرو کو بچتے ہیں بے خبر گو برف سدش
آبرو کے بارہ میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

بے تامل میتواں طے کرد صد دریائے فوں
یک میتواں از سر یک قطرہ آب رو گذشت

آنچہ نتواں داو مجرور دست محبوباں دل است

و آنچہ نتواں ریخت جز در پائے خواباں آبرو است
جب لوگوں نے دیکھا کہ اکثر صوفیہ کرام گوشہ نشین فقر و فاقہ میں بسر کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف ناداری اور افسردگی سکھاتا ہے اور جب ان کے کلام میں مسئلہ فنا، مطالعہ کیا تو اکثر اہل علم نے بھی ٹھوکر کھائی، خود خانقاہ کے پیروں کے حالات بھی اس کی تائید میں تھے اور ہیں اس لئے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ صوفی اور ہندو سادھو اور مسیحی رہبان ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں۔ ترک دنیا صرف ایک ڈھونگ ہے، بقول ”گبن“ ترک دنیا سے دنیا زیادہ ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں، صوفیہ کرام محققین ہیں اور تحقیق کا مطالبہ ہے کہ یک سوئی ہوتا کہ کامل توجہ مطلوب و مقصود میں مرکوز ہو۔ اس کے لئے ایک عمر چاہئے، حافظ کہتا ہے۔

سحر گرہ رہوے در سز مینے ہمیں گفت ایں معنہ باقرینے
کہ لے صوفی شراب آنکہ بود فنا کہ در شیشہ بماند از بعینے

ایک سالک نے یہ بات استعارہ میں اپنے اصحاب سے کہی کہ شراب اس وقت صاف ہوتی جب اس میں ”درد“ تا پلھٹ کا شائبہ تک نہ ہو، جب وہ شیشہ میں چالیس سال رہتی ہے۔ چالیس سال عمر کا بہترین حصہ بلکہ منتہائے عروج ہے، آج کل تو جوانی پچیس حد میں سال پر ختم ہو جاتی ہے مگر سلف صالحین اس کو لڑکپن کا زمانہ سمجھتے تھے، اور جوانی کی اشد قوت اور بلوغ چالیس قرار دیتے تھے، اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ”ہر کسے را بہر کارے ساختند“ اور جس کام کا کوئی اہل فطرت ہوتا ہے اس کام کی اُلفت اس کے دل میں ہوتی ہے، یہ کہنا چاہئے کہ ہر ایک کام خواہ صنعت و حرفت ہو یا کچھ اور ایک فطری مناسبت ہر ایک طبیعت سے رکھتا ہے اور ہر ایک شخص پیدا نشی اس کام کا اہل ہوتا ہے جو اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اگر وہ اس کام میں لگ جائے اور حالات بھی سازگار ہوں تو اس میں ”اختراع“ اور ”ایجاد“ بھی کرتا ہے اور مستند اُستاد مانا جاتا ہے، ”سورہ نازعات“ میں یہی بیان ہے، لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوں تو بیدل کہتا ہے کہ۔

اے بسا روشن دے کز بے نیاز یہاں شوق

چوں فروغ ہر بر خاک سیاہ افتادہ است

اکثر اہل دل ایسے بھی ہیں کہ آسمانِ رفعت پر آفتاب کی طرح جلوہ افروز ہیں مگر ان کے فیض کی شعاعیں خاکِ سیاہ پر پڑ رہی ہیں، انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی ان کی مرع کرتا ہے یا دم، اور یہ کہ ان کے نور کا اکتساب نا اہل کرتا ہے یا اہل۔

اے بسا آئینہ کز کسوت ز نگارِ رش

یوسف ستائے بخلوت گاہ چاہ افتادہ است

کئی آئینے ایسے ہیں کہ اپنے لباس کی رنگینی کی وجہ سے حسنِ یوسف کو

جلوہ دیتے ہیں مگر یہی سبب ان کے کنوئیں میں گرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ تنہا ہوتے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا۔

معنی اقبال فقر از غفلاں پوشیدہ اند

وردہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است

غافل لوگ کیا جانیں کہ خاک نشیں فقرا کی گود ڈھلی میں کیا لال چھپے ہوئے ہیں۔

یہ امر کہ جو ہر ذاتی اور وصف اضافی میں کیا فرق ہے؛ بیدل بتاتا ہے کہ۔

بھوشنم از تامل دیدہ گر وا کنی

برگ برگ ایں چمن جز لوح استعداد نیست

اگر تو شبنم کی طرح آنکھ کھول کر دیکھے تو تجھے صاف نظر آئے گا کہ اس باغ کا پتہ پتہ ”لوح استعداد“ ہے، شبنم ہر ایک پتہ پر پڑتی ہے اور اسے ہر ایک پتہ کا حال معلوم ہے کہ کس قابلیت کا مالک ہے۔

جو ہر ذاتی است موزونی نہ کسب عارضی

گل بسعی پر نشانہا چو سرو آزاد نیست

جسے موزونی کہتے ہیں اور یہی حسن و خوبی پیدا کرتی ہے، وہ جو ہر ذاتی ہے، فطری قابلیت ہے، کسی اور عارضی نہیں، یعنی کسب و اكتساب سے حاصل نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو عارضی چند روزہ ہوتی ہے، گل اپنی وضع میں گل ہے مگر ناممکن ہے کہ خواہ کتنی سعی کرے سرو کی طرح بلند و بالا ہو، اور سرو گل نہیں بن سکتا۔

باغبان گر خوں خورد ابرو برو بر خاک ریز

نیست گل غیر از گل و شمشاد جز شمشاد نیست

باغبان خواہ خون پسینہ ایک کر دے اور ابر اپنی آبروشی میں ملا دے۔

یعنی دن رات برقرار ہے، دونوں کی متفقہ انتہائی کوشش بھی پھول کو شمشاد اور شمشاد کو پھول نہیں بنا سکتی۔

ہم قدر صافی است آئینہ تمثال آشنا

فہم ذاتی گر نباشد بیچ کس آشنا و نیست

آئینہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی صاف اشیاء کا عکس اس میں ظاہر ہوگا۔ آئینہ میں فطری قابلیت ہے کہ تمثال نما ہو، خارجی تاثرات کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس کی سطح مکدر ہو، اور اس کی فطری قابلیت کا اظہار نہ ہو۔ مگر جب بھی یہ کدورت رفع ہوئی وہ تمثال نما خود بخود ہوگا۔ اسی طرح جسے مجاہدہ اور ریاضت کہتے ہیں وہ عارضی کدورت کا آئینہ دل سے رفع کرنا ہے، مجاہدہ حائقہ اور ریاضت شاقہ آئینہ میں وہ قابلیت پیدا نہیں کر سکتی جو اس میں فطری جوہر ہے، اس لئے اگر فہم ذاتی نہ ہو تو کوئی شخص مستند مدبر اور اپنے فن کا استاد نہیں مانا جائے گا۔

موجہا یکسر بہ تنغی شوخی خود بسمل اند

دل طیش فرماست ایں جا حاجت ارشاد نیست

امواج دریا میں اضطراب ذاتی ہے اور شوخی میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ موج کی صورت اور شکل بھی تلوار سے ملتی جلتی ہے اور تلوار بھی آبدار ہوتی ہے۔ موجوں کی تلواریں ایک دوسرے کو گھائل لپیٹا کر رہی ہیں، اسی طرح جہاں دل ہے وہاں طیش ہے اس کے لئے کسی بیرونی تحریک یا ارشاد کی ضرورت نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فطری قابلیت مقدم ہے اس کے بعد مناسب اسباب جو اس قابلیت کو ظاہر کریں، اور ایک دانہ میں قابلیت تو ہے کہ وہ شجر بن جائے اور پھول اور پھل لئے مگر اس کے لئے قابل زمین اور آبیاری کی ضرورت ہے جو خورد و نوش کا سامان ہیا کرے۔ اگر مناسب

اسباب مہیا نہ ہوں تو فطری قابلیت اور استعداد کا ظہور نہ ہوگا۔ پہلے
 () کہتا ہے کہ ”انسان خود فطرت () کی ایک
 صنعت () ہے، اس لئے انسانی فن یا آرٹ خود فطرت کی صنعت
 ہے، انسان غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ آرٹ کا موجودہ خود ہے حالانکہ
 فی الحقیقت فطرت ہے، بیدل بھی یہی کہتا ہے کہ ”خود را بتو خود نمودن
 ہنر اوست“ یعنی یہ فطرت ہی ہے جو تجھ میں کار فرما ہے اور تجھ میں اپنی
 صنعت کا مشاہدہ کر رہی ہے، اور یہ بھی اس کا ہنر ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ
 ”میں ہوں“ ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ اگر تو خود شناس ہے
 تو فی الحقیقت تو ہی ہے، تیرا غیر نہیں ہے، یہ وہم ہے کہ تو نے نوٹ اپنا غیر
 سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے کہ تیری نظر کثرت پر ہے جو خارجی اسباب ہیں اور
 تو اسی عالم اوہام میں سرگرداں ہے، حالانکہ اگر تو نہ ہو تو سب کچھ بچ ہے
 اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیرونی کائنات بھی تیرے
 قلب میں موجود ہے۔ ”ظاہرا میں جا باطن است و باطن میں جا ظاہر است“
 لیکن تیرے قلب میں ایک قابلیت ہے جو بیرونی دنیا میں نہیں۔ اس لئے
 تیرے قلب کو خارجی کائنات پر ایک گونہ فعالیت حاصل ہے۔ اسباب خارجی
 محدود ہیں اور تیرے قلب کی قوتوں کا عمل غیر محدود ہے اس لئے اگر تو بلندی
 فہم وغیرہ چاہتا ہے تو اسی قلب کی سیر کر۔ جتنا کسی کا فہم بلند ہوگا اتنا ہی
 اللہ کا جو اصل مقصد ہے قرب حاصل کرتا جائے گا۔ اور جتنا پست ہوگا
 اتنا ہی اس کا خدا پست ہوگا۔ اصل مقصد ہمیشہ ہمارے فہم سے بالاتر
 رہے گا۔ اگر ہم اس کی سطح پر پہنچ جائیں تو ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ اور یہ
 ناممکن ہے۔ یہ سلسلہ تجد و امثال اور ارتقاء ہمیشہ جاری رہے گا۔
 اگرچہ نہ ہو تو نظام عالم بھی قائم نہ رہے گا۔ اور موت و حیات کا
 تصور بھی محو ہو جائے گا۔

”خودی“ پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ہماری معرفت سے بے نیاز ہے۔ منشاء حق یہ ہے کہ انسان خود شناس ہو۔ مثنوی عرفان میں ”من عرف نفسه فقد عرف دہ“ کے تحت اس نے یہی بحث کی ہے، لیکن خودی کے اعلیٰ مقام پر انسان پہنچ نہیں سکتا جنک پہلے شمشیر ”لا الہ“ سے تمام ماسویٰ کو فنا نہ کرے یعنی ”وحدت“ کا صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کثرت خارجہ کے تصورات کا اس کے دل پر ہجوم نہ ہو۔ اس لئے اسے سب سے پہلے ”از خود تہی“ ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

درد سر جهان در خور دانش است و بس

نیست بکسب عافیت غیر جنوں مفید ما

عقل اور عشق ایسا موضوع ہے جس پر حکماء نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے بحث کی ہے لیکن اس حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی محرک عقل نہیں جذبات ہیں۔ اگرچہ بیدل عقل و عشق کے اصطلاحی فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں کا دائرہ عمل و اثر بھی واضح کرتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ عشق ”عقلِ نچتہ“ کا دوسرا نام ہے۔

نیست تدبیر و دراع در دسر کار کمی

بے تیزاں عقل کامل راجوں نامید اند

یعنی عالم اسباب خارجی میں سرگردانی عقل دور اندیش کی وجہ سے ہے اور اس درد سے نجات کی صورت جنوں پیدا کرتا ہے۔ حقیقت میں تلاش مقصد میں جو کشش درکار ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہی ”دردِ سر“ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مقصد سے ہمیں دل بستگی نہ ہو۔ جب اس سے کامل اُلفت ہوگی تو یہ ذوق و شوق میں

بدل جائے گا۔ یہی احساس ہے جس کی شدت اصطلاح میں ”جنون“ سے موسوم ہے۔ یہی وہ لوہے جو دل کو لگی ہوئی ہوتی ہے، اور اسی دھن میں انسان اس مقصد کے سوا دنیا و مافیہا بلکہ اپنے آپ سے غافل ہوتا ہے صرف مقصد ہی مرکز توجہ ہوتا ہے اس میں انہماک اور استغراق کا نام جنون ہے اٹھتے بیٹھتے پہلوؤں پر اسی کا ذکر اور اسی میں فکر، اسی کو جنون کہتے ہیں۔ کفار مکہ آنحضرتؐ پر بھی یہی پھبتی جمائے کہ اس کو جنون ہے۔

”دادی ایمن“ میں حضرت موسیٰ سے سوال ہوا کہ اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا؟ جواب دیا کہ ”عصا“ اس سے میرے ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ راعی رمایا کو اسی لاثمی سے ہانکتا ہے۔ میری زندگی کا سہارا ہے، فرمایا کہ ہاتھ سے پھینک دے۔ جب پھینک دیا تو دیکھا کہ یہ سانپ ہے، بھاگنے لگے تو ارشاد ہوا کہ مت ڈر، اسے پکڑے یہ اپنی اصل سیرت میں تیرے ہاتھ میں کام کرے گا۔ یہ آیات ”تشابہات“ قرآن میں صحف موسیٰ کی ہیں، تاویل جو قرآنی حکمت میں کی گئی ہے یہ ہے کہ عصا و یضیا دو ”برہان“ تشبیہی و تنزیہی تھے جو موسیٰ کو عطا ہوئے۔ عقل کا عمل ”تشبیہ“ میں ہے۔ ید بیضا نور حق ہے۔ یہ تنزیہ ہے۔ آفتاب کو آفتاب کے نور سے دیکھنا ہے تشبیہ میں اشیاء کی معرفت مماثلت اور مشابہت سے دریافت کرنا ہے۔ یہ عصائے کور ہے۔

چوں یقین منحرف افتاد دلائل بالید

راستی رفت کہ منون عصایم کردند

کور ماورزا کو تشبیہ سے خواہ کتنا سمجھانے کی کوشش کرو کہ آفتاب ایسا اور ایسا ہے وہ ہرگز دیدہ بینا کی طرح آفتاب کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ استدلال عقلیہ کی نسبت علامہ محمود شبستری گلشن راز میں کہتے ہیں کہ رہ دور و دراز است ایں رہا کن چو موسیٰ اندرین ترک عصا کن

عارفِ رومی کا ارشاد ہے کہ ”ایں عصا چہ بود قیاسات و دلیل“۔ اور یہ کہ ”آفتاب آمد دلیلِ آفتاب“۔ آفتاب کی روشنی باندھ ہے اس لئے از عصا و وز عصا کش فارغ است“۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل ایک آلہ کار ہے۔ اگرہ نفس امارہ بالسوء کے ہاتھ میں ہو تو خطرناک سانپ ہے، توراۃ کتابِ پیدائش میں لکھا ہے کہ شیطان نے آدم و حوا کو سانپ کی شکل میں فریب دیا جو مخلوقات میں سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور اگرید بیضا قبضۂ تصرف میں ہو تو سبحان اللہ، اس سے وہ کام نکلتے ہیں جن کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے ہم

مشابہ کر رہے ہیں اہل ہوا و ہوس اس سے کیا کام لیتے ہیں، اور علماء و صلحاء اس کی خبیثوں کو کس طرح جلوہ دیتے ہیں۔ غالباً خواجہ حافظ نے بیدل کی نسبت ہی ارشاد فرمایا ہے کہ:-

بیدلے درہمہ احوالِ خدا با او باد

اونیدیش و از دور خدا رami کرد

دیدش خرم و خداں قدح باؤ بدست

واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جامِ جہاں میں بتو کے داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینامی کرد

آں ہمہ شعبہ ہا عقل کہ می کرد آں جا

سامری پیش عصا وید بیضامی کرد

یہ تمام اختراعات و ایجادات جو مادی دنیا میں ظاہر ہو رہی ہیں اہل علم و فضل عقل ہی سے کر رہے ہیں، اور اہل ہوا و ہوس ان سے وہ کام لے رہے ہیں جو محض شیطنت ہے۔ بیدل عقل کی نفی نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ

باہر کمال اند کے آشفنگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباح
اس شعر پر علامہ اقبال مرحوم نے تفسیر کی ہے جو تبرکاً درج ذیل
کی جاتی ہے، یہ اس شعر کی شرح بھی ہے۔

تعلیم پر فلسفہ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
”محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی

اس دور میں ہے شیشہ عقاید کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنوں غلام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا ہے مرشد کامل نے راز فاش
باہر کمال اند کے آشفنگی خوش است

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباح

علامہ اقبال مرحوم کے اشعار کا یہ مطلب ہے، فلسفہ مغرب (یورپ اور
امریکہ) ایسی ہستی کا منکر ہے جو محسوس نہ ہو، اس لئے وہ ہستی جسے مذاہب
واجب الوجود تسلیم کرتے ہیں اور جو برتر از قیاس و گمان دوہم ہے مغربی
فلسفیوں کے نزدیک محض توہم ہے، ایک بت ہے جو اہل مذاہب نے
تراشا ہے اور اس کی نادیدہ پوجا کرتے ہیں حقیقت میں یہ موجود نہیں،
اگر ہے تو ان لوگوں کے دوہم میں ہے۔ علوم جدیدہ کی بنیاد محسوسات پر
ہے۔ اہل مذاہب کے وہ عقاید جو مابعد الطبیقہ پر مبنی ہیں وہ اب علوم جدیدہ

نے غلط قرار دئے ہیں، مگر فلسفہ زندگی کا نظریہ کچھ اور ہے اور یہ راز ہستی مجھے شہد کامل بیدل نے بتایا ہے کہ محض عقل سے ہستی کی غمتی نہیں سلجھ سکتی۔ اسے سلجھانے والا وہ ہے جسے اصطلاح میں عشق یا "جنون" کہتے ہیں جو عقل کی ضد ہے۔ بیدل تو عشق کو عقل کا مل کہتا ہے، یہ عقل خام ہے جو قیاسات وغیرہ ہیں۔

بیدل کو اس سے انکار نہیں کہ جو کچھ مادہ پرست فلسفی کہتے ہیں وہ ان کی اپنی حد نظر ہے جسے وہ تحقیق سے موسوم کرتے ہیں، "مثنوی عرفان" میں وہ کہتا ہے کہ مادہ پرست آخر کسی ہستی کے قائل تو ہیں خواہ یہ مادہ ہی ہو، مگر وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ محسوسات ہی ہیں۔

بیدل یہ کہتا ہے کہ کائنات کو جس نظر سے دیکھو گے تمہیں وہی کچھ محسوس ہوگی، اگر یہ کہو گے کہ مادہ کے سوا اور کچھ نہیں جیسا پیر فلسفہ مغربی کہہ رہا ہے تو یہ ان کا اپنا قصور ہے، اس میں تھوڑی سی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کا انکار کرتے ہیں جو انہیں جو اس ظاہری سے محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی موجودگی کا علم نہیں، عدم علم علم عدم نہیں ہے۔ امکانات اکثر پوشیدہ ہیں وہ اسی وقت محسوس اور معقول کہے جاسکتے ہیں جب منکشف ہوں ایک شخص کو ان کی موجودگی کا علم نہیں تو یہ کوئی وقیع دلیل اس دعویٰ کی نہیں کہ یہ فی الحقیقت موجود ہی نہیں۔ ایک شے جو محسوس ہو ضرور نہیں کہ خارج میں موجود ہو، ہمارے تو ہمت کا عکس بھی ہو سکتی ہے۔ تمام ذہنی امور خارج میں موجود نہیں ہوتے، اس لئے کسی شے کی صداقت کا معیار ہمارے پاس عقل ہے محسوسات اگر معقول نہیں تو وہ تو ہمت ہیں۔ بقول امام غزالی محسوسات کی غلطی عقل ہی دفع کرتی ہے، مگر وہ خود بھی غلطی سے پاک نہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو ذہنی ارتقاء ہی نہ ہوتا جیسے بہائم کی حالت ہے انسان کی بھی ہوتی وہ غلطی نہیں کرتے مگر ترقی بھی نہیں کرتے۔

کسی شے کی موجودگی کا احساس یا انکشاف کئی طریق سے ہوتا ہے، حسیات اور عقلیات کا منکر تو پیر فلسفہ مغربی بھی نہیں، لیکن یہ کافی نہیں۔ ہمارا دل کبھی کسی زمانہ میں اس سے مطمئن نہ تھا اور نہ ہوگا، ہر ایک زمانہ میں حکماء کو ایک ایسے وجود کی جستجو رہی ہے جسے واجب الوجود یا حقیقہ الحقائق کہتے ہیں، اور اس پریشان کن "کثرت" میں "وحدت" کی تلاش کرتے رہے ہیں، اور یہ مسلم ہے جسے "علم" کہتے ہیں وہ کثرت کو وحدت میں مشاہدہ کرنا ہے، جزو کو کل میں دیکھنا ہے، فروع کی اصل دریافت کرنا ہے، یہ حواس اور بقول علامہ اقبال "عقل خام سے ممکن نہیں، بقول بیدل "عقل کامل" سے ہستی کی گتھی سلجھ سکتی ہے جسے وہ جنوں" سے تعبیر کرتا ہے۔

غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہئے، ارشاد قرآن ہے کہ جب اہل ذکر و فکر کائنات میں نظر کرتے ہیں تو اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "دینا ما خلقت هذا باطلا" اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کائنات باطل، عبث، بے نتیجہ پیدا نہیں کی، بیدل کہتا ہے کہ

گر بین و گر اقتباس دریافت در انجمن حواس دریافت
بر دامن جسم پاک حقیر دوز حق را بہیں لباس دریافت

حسیات ہوں یا عقلیات یا وجدانیات اسی کسوت مادی میں ان کا انکشاف ہو رہا ہے، اس لئے بیدل کو مادہ پرست کہو یا کچھ اور اس کا سب سے اتفاق ہے بشرطیکہ وہ اس انجمن حواس صحیحہ سے باہر نہ جائیں۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں محض صورتیں ہیں جن کو علامہ اقبال "پیکر" سے تعبیر کرتا ہے، ان پر جو حقائق منکشف ہوتے ہیں وہ عقلاً ہوتے ہیں لیکن یہ نظام حیات و عقلیات اجزاء فردہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اگر اسے "حق" نہ تسلیم کیا جائے اور تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک

اس کا مشاہدہ نہ ہو، اور یہ چشم عقل کامل یا ”جنون“ ہی سے ممکن ہے، مگر اس مقام پر استدلال عقلیہ بیکار ہے جیسا کہ انکشاف حقائق اشیاء میں حواس ظاہری معطل ہیں۔

بات یہ ہے کہ مادی دنیا میں عقل خوب کام کی چیز ہے لیکن اس سے کام خوش اسلوبی سے لینا اہل دل کا کام ہے، لیکن ایسے امور بھی ہیں جن کو ”مابعد الطبیعہ“ کہتے ہیں۔ وہاں عقل ناکارہ ہے۔ وہاں یقین اور ایمان اور وجدان کام آتا ہے یعنی ”تشبیہات“ میں عقل اور تنزیہات میں عشق کار فرما ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو استدلال عقلیہ سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، جب دیکھا کہ اس سے کام نہ چلا تو فرمایا:-

هَلْ لَكَ الْإِلٰهَ اِلَّا اَنْ تَزْكٰى وَ اَهْدٰىكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى

(۳:۳۰)

کیا تجھے اس کی خواہش ہے کہ تیرا تزکیہ نفس ہو اور میں تجھے تیرے پروردگار کی طرف راستہ بتاؤں اور تو اس سے ڈرے۔

فرعون نے انکار کیا اور ہدایت سے محروم رہا۔ بیدل یقین کی نسبت لکھتا ہے کہ خواہ ”ہوس“ ہی ہو مگر کسب یقین سے عشق کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

دل مائل تحقیق مگر دید و گرنہ

از کسب یقین عشق تو اں کرد ہوس را

یعنی تحقیق یقین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں استدلال عقلیہ ہی سے کام لیا جاتا ہے چشم بینا نہ ہو تو عصا ہی سہی، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ ”یقین خفہ در ہر بردہ ظن“ تمام اوہام اور ظنیات کی تہ میں یقین ہی موجود ہے جو اصل حقیقت ہے۔ ”ڈیکارٹ“ نے جب ہر ایک شے کو

جو خارج میں ہے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تو دیکھنے والے پر شبہ نہ کر سکا جو صاحب یقین ہے۔

از نقش تو دار دخل آئینہ تحقیق

ہر جا اثر وہم و گماں رفت یقین ماند

آئینہ تو بذاتہ بے صورت اور بیرنگ ہے۔ جب ہم اس میں نظر کریں گے تو ہمارا نقش اس میں ظاہر ہو گا۔ اسی طرح آئینہ تحقیق میں ہم اپنے اوام و ظنیات کا اثر یا نقش دیکھتے ہیں اگر یہ نقش محو ہو تو آئینہ تحقیق جیسا کہ ہے ویسا ہی ہے۔ ہم کسی شے کو چشم یقین کے ساتھ نہیں دیکھتے اپنے ہی تو بہت دقیقاً سات و ظنیات کا مشاہدہ کرتے ہیں یقین اس شے کو اس کی اصلی صورت پر مشاہدہ کرنا ہے۔

تغافل زن بہ ہستی صقل فطرت نیست بس

صفائی آئینہ گرد عا باشد مبیں خود را

پھو عکس کہ برد سادگی از آئینہ ما

ہر کہ در طبع تو جا کرد توفتی او ماند

یہ تو حقیقت ہے کہ آئینہ جو سادہ ہے جب کسی شے کا عکس قبول کرے گا تو اس کی سادگی نہ رہے گی۔ آئینہ نہیں بلکہ وہی عکس نظر آئے گا۔ اسی طرح آئینہ دل پر اگر نقش غیر ہو گا۔ تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ”توفتی و او ماند“ تیری ”فردیت“ تیری ”خود“ مفقود ہو گئی۔ بیدل پہلے شعر میں اس سے بھی بلند فکر کا اظہار کرتا ہے کہ تو بھی آئینہ فطرت میں اپنے آپ کو نہ دیکھ، تو ہستی سے اتنا غافل ہو جا کہ تیرا نقش بھی اس آئینہ فطرت میں نظر نہ آئے۔ فطرت جو اصل شے ہے باقی رہ جائے گی۔

نفسیات کے اس مسئلہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ کسی غلط تصور کو اگر ہم حقیقت ثابتہ یقین کریں تو اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے، وہ

بھی اسے ”حق“ ہی یقین کریں گے۔ اس موضوع پر فاضل ”لیبان“ نے روح اجتماع کے تحت متفقانہ بحث کی ہے۔ اگر ہم ”سراب“ کو عالم آب یقین کریں تو ضرور اس کے پیچھے دوڑیں گے اور دوسرے بھی ہمارا اتباع کریں گے۔ یہ مفہوم ہے بیدل کے شعر محول بالا کا کہ ”از کسب یقین عشق توں کرد ہوس را“ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ:-

متاب از عشق رو گر چہ مجاز نیست
کہ این بہر حقیقت کار ساز نیست (جامی)

اس شعر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عشق کی نوعیت تو ایک ہی ہے۔ البتہ معشوق مجازی و حقیقی ہو سکتا ہے، اور کسی وقت مجاز سے حقیقت کی طرف بھی متوجہ ہو سکتا ہے بہر حال عشق کی موجودگی مقدم ہے۔ جب احساس طلب ہی نہ ہو تو طالب اور مطلوب بھی نہ ہوں گے۔

علامہ اقبال مرحوم بیدل کا فلسفہ خودی اور بیخودی مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے عملی فائدہ اٹھانا چاہا اور حالاتِ حاضرہ پر اس کا اطلاق کیا۔ ہمارے زمانہ میں برطانوی امپیریلزم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کا علامہ ذہنیت مسلط ہو چکی تھی۔ علامہ نے پہلے تو ہندوستانیوں کو وطن کا واسطہ دلایا اور وطن کا راگ الاپتے ہوئے کہا کہ ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“ لیکن جب دو قوموں کا نظریہ ذہن میں صاف صاف میسر نہ ہو سکا تو اور یہ بھی واقعات نے سمجھنے پر مجبور کیا کہ کفر و ایمان میں ربط ناممکن ہے تو وطن کو خیر باد کہا۔ اس وقت اسلام کی ہمہ گیری اور عالمگیری کا صحیح تصور بھی مشاہدہ ہو رہا تھا کہ اسلام وطن اور قومیت سے بالاتر ہے جو نسلی امتیازات اور اختلافِ الوان و لسان کی پیداوار نہیں ہے اس لئے کہنا پڑا کہ:-

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

بیدل

علامہ اقبال اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے، محدود وطن سے نکل کر وسیع تر وطن کو ارض کو وطن قرار دیا، مگر وطن کا تصور ذہن سے محو نہ ہوا۔ وہ اب "ملت" کے شیدائی تھے، شعور خودی ملت ہی سے وابستہ تھا کہ یہ دیگر مل میں جذب نہ ہوا اور شعور بخودی یہ تھا کہ ہر ایک فرد ملت ملت سے وابستہ رہ کر ہی اور ملت میں اپنی انفرادی خودی کو محو کر کے اپنا شعور۔ ملت یا خودی برقرار رکھ سکتا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
بیدل کا نظریہ خودی و بخودی اس سے اعلیٰ وارفع ہے۔ علامہ اقبال پر ماحول کا اثر پڑا۔ لیکن بیدل کا ماحول ایک اسلامی حکومت تھی۔ بیدل مذہب و ملت سے بھی آزاد ہے۔

در مشرب زن از قید مذاہب بگریز
ما فیت نیست دران بریم کہ سازش جنگ است

مے کشی کر دیم و آسودیم از تشویش و ہم
گرد چنریں مذہب از یک جرعه مشرب نیست

موج ایں دریا مکلف پرور گرداب نیست
طینت آزاد بیرون تاز و ہم مذہب است

حسد تاکے، تعصب چند، اگر درد دے داری
نیا ز زاهدان بے خبر کن درد دینی را
ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ مشرب آزاد گان یہ ہے کہ مذاہب

کی قید سے آزاد ہیں۔ مذاہب کیا ہیں؟ جنگ و جدل کا ساز و سامان -
علامہ اقبال نے کیا اچھا کہا ہے کہ

سچ کہدوں لے برہمن گر تو بُرا نہ مانے

تیرے صنم کدہ کے بُت ہو گئے پُڑنے

آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

خدا پرستی اور بشری شخصیت پرستی میں فرق یہ ہے کہ خدا پرستوں میں
کبھی جنگ و جدل نہیں ہوتا۔ آں حضرتؐ کی صحیح حدیث ہے کہ آپؐ نے
فرمایا کہ میں تم کو ایک بات بتاؤں کہ تم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار
نہ رہو، وہ ہے یا خدا، جب ہم یہ سمجھ لیں گے۔ ہم سب کا خدا ایک ہے
اور ہم سب اس کے بندے ہیں اور اللہ فساد اور مفسدین کو پسند نہیں
فرماتا اور یہ کہ حسب ارشاد قرآن اللہ کی طرف رجوع کریں تو ہمارے
سب اختلافات مٹ جائیں گے۔ یہ اصل مذاہب، اصل دین، اصل
ملت ہے۔ شخصیت پرستی بُت پرستی ہے جب ان کو ”ادبا با مَن دون اللہ“
بنایا جائے تو ان خداؤں کی کثرت ایک دوسرے سے دست و گریبان
رہے گی، اور تاریخ مذاہب میں یہ امر واقعہ ثابت شدہ ہے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

(حافظ)

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مذاہب سب کم و بیش انسانی اختراع ہیں لیکن اسلام دین اللہ
ہے، ”لہ اسلام من فی السموات والارض“ یہ کل کائنات کا دین
الفطرت ہے۔ کائنات میں عالم انسانیت بھی شامل ہے۔

مشرک آزادگان اس قید مذاہب سے باہر نکلنا ہے بدین اللہ
میں کوئی الجھن نہیں، بھول بھلیاں نہیں، یہ وہ دریا ہے جس میں بھنور

نہیں کہ خطرہ ہو، اہل دیں ملاحوف علیہم ولاہم یحزنون، طینت آزاد بیروں تازو ہم مذہب است مذہب اوہام کا گرداب ہیں۔ اس کے چکر میں جو آیا بمشکل اس سے باہر نکل سکتا ہے، مذہب کے نام پر اہل مذہب میں تعصب اور حسد اور کینہ، ایک دوسرے کا انکار اور اختلاف اور تفرقہ اور جنگ و جدل غرض ہر ایک یہودگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ بر خود غلطی سمجھتے ہیں کہ یہ فتنہ و فساد جو مذہب کے نام پر برپا کر رہے ہیں درد دینی کا تقاضہ ہے۔ اور کارِ ثواب ہے۔ یہ سب کچھ شخصیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ میرا مذہب عشق ہے۔ بغیر عشق نہ انیم ہیج آئینی گزیدہ ایم چور وادہ سوختن مذہب اور یہ کہ :-

از تعصب جا ہلاں دین ہدی را دشمن اند

حاقبت در جنگ ایں کوراں عصا خواہ شکست

جہاں مذہب ہیں وہاں دینی (حکومت ہے اور ارباب حکومت پادری، پنڈت اور ملا ہیں اور یہی دراصل دنیوی (حکومت ہے، بہر حال ایک بیکار جماعت بر سر اقتدار حاکم اور عوام محکوم، آزادی فکر ختم، اس کے ساتھ ذہنی ارتقا مفقود، نتیجہ ظاہر ہے۔ اپنی خود ساختہ حکومت کے قیام کے لئے جنگ و جدل۔ اسلام نے ہر ایک حکومت خواہ دینی ہو یا دنیوی جس کے نام پر چالاک آدمی اپنا آلوسیدہ کرتے ہیں مٹا دی۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کا بندہ غیر اللہ کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ غیر اللہ کا بندہ مشرک ہے اور شرک کا تقاضہ فتنہ و فساد، ملک خدا اور بندگان خدا میں پیدا کرنا ہے۔

غرض اسلام مشرب آزادگان ہے وطن اور قومیت اور مذہب

اور ہر ایک قید رسوم مذموم جو اہل غرض کی اختراع ہے اور مایہ تشویش ریش اور رجبہ و دستار اور سجدہ و زنا و جہمی تقدس کے آثار میں بیدل کے نزدیک مردود ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ریش | بیدل نے شہنشاہ دین پناہ اور نگ زیب عالمگیر کا عہد شروع سے آخر تک پایا "اکبر" جس کو عالمگیر "جدا کفر" کہتا تھا تراش ریش پسند فرماتا تھا، عالمگیر نے اسے بھی ایک اہم شرعی مسئلہ قیاس کیا جس کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اس لئے داڑھی بڑھانے کا امر فرمایا، بیدل کہتا ہے کہ

دی بادشہ تراش ریش خوش بو امروز شہے دگر در منع کشود
در دیدہ اعتبار از حکم دو شاہ جز لیشم نبود کہ کاہید و فرود
ایک غزل ریش پر ہے۔

ایں قدر ریش چہ معنی دارد غیر تشویش چہ معنی دارد
اتنی لمبی داڑھی کی غرض غیر تشویش اور کیا ہو سکتی ہے
آدمی خرس چہ ظلم است آخر مرو حق میش چہ معنی دارد
اتنے لمبے بال خرس اور گو سپند ہی کے ہوتے ہیں، آدمی کے چہرہ پر
زیب نہیں دیتے مرو حق بکری بن جائے تو نہ معلوم اس کا کیا فائدہ ہے۔

یک نحو دکھ و وہ من دستار ایں کم و بیش چہ معنی دارد
خوبصورتی موزونی کا نام ہے، چنا بھر تو سر ہوا اور اس پر پورا کپڑے
کا تھان پگڑی جو تو توازن قائم نہیں رہتا اور یہ کمی بیشی موزونیت کے
خلاف ہے۔

بیدل ایں جا بہ ریش است فشاں ملت و کیش چہ معنی دارد
مقطع میں بادشاہ پر چوٹ کر گیا ہے کہ ملت و کیش تو صرف ریش و
فش میں محو ہو کر رہ گیا۔

بیدل

چند اشعار بغرض تفنن اور ملاحظہ ہوں :-

بیدل از افسوں گریٹ خرس و بڑا دم نشود
چنگ بر ریش مزن از ہوس شانہ برآ
اگر کچھ اور بکرے کو جادو کے زور سے آدمی بنا نام مقصود ہو تو نام ممکن
ہے۔ ہر وقت داڑھی پر ہاتھ پھیرنا اور شانہ کرنا تاکہ اس میں موڑونی اور
صفائی پیدا ہو جو آدمیت کا تقاضہ ہے، بے فائدہ ہے جب اصل شے ہی
انسانیت سے بعید ہے۔

از چہ پروانہ بزرگی نفرو شد زاہد
ریش بر تافتہ کم نیست بز اخفش را
اخفش مشہور نحوی عربی زبان کا ہے۔ اس نے ایک بکری پال
رکھی تھی۔ اسے اپنے سامنے باندھ کر صرف دھوکے درس میں مشغول رہتا،
اور کسی پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرتا ہوا پوچھتا کہ کیا یہ بحث صحیح ہے؟ بکری
عادتاں سر ہلاتی۔ اگر مسئلہ مزید غور کے بعد غلط ثابت ہوتا تو بکری کی خیر نہ
تھی، خوب پلٹتا۔ اس شعر میں تلخیص یہی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا
کہ اخفش تو خیر جو کچھ ہے سو ہے اس کی بکری بھی کسی نحوی سے بزرگی میں
کم نہیں، بیدل زاہد پر چوٹ کرتا ہے کہ زاہد کی بزرگی میں کیا کلام ہو سکتا
ہے ریش و فش بز اخفش سے کم نہیں۔

زاہد ز عیش رنداں پر غافلست بیدل
فردوس درہیں جاست گر ریش و فش نہ باشد
اس شعر میں بھی تلخیص ہے کہ بہشت میں سب عالم شباب میں ہونگے
اور کسی کی داڑھی نہ ہوگی۔ اگر زاہد سمجھے تو فردوس یہی دنیا ہے۔
بہشت ایں جا بہار ایں جانشاط ایں جا نگار ایں جا
تو کہ خود غافل صرف عدم کن دور بینی را

اور اس راز کو داڑھی منڈے رند ہی خوب سمجھتے ہیں جس سے زاہد مطلق بے خبر ہے۔

جز خارق معکوس ماں ریش و فش شیخ
آدم خری کرد دم و یال بر آورد
اسے شیخ کی کرامت ہی سمجھنی چاہئے اگرچہ یہ الٹی کرامت ہے کہ
آدم تنزل کر کے گدھا بن گیا اور دم اور یال ریش و فش سے پیدا ہوئے
سمجھ و زنا ر | بیدل سراں رشتہ بہ تحقیق نہ پیوست
در سمجھ و زنا ر جہلنے دل و دین داشت

بظاہر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیدل میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں
کہ ایک دنیا سمجھ و زنا کی دلدادہ ہے اور اسی کو دین سمجھتی ہے تحقیق کو
اس سے کیا نسبت ہے۔ یا سمجھ و زنا کے گرفتار تحقیق یا تقاضہ دل و دین
کو نہیں سمجھ سکتے۔ انہوں نے سمجھ و زنا سے رشتہ جوڑا ہوا ہے اور حق
سے توڑ رکھا ہے۔

تاب و تب سمجھ بہل، رشتہ زنا ر گسل

قطرہ می جوش زن و بر خط پیمانہ بر آ

سمجھ کے لئے ”تاب و تب“ نہایت موزوں الفاظ ہیں۔ اور قطرہ سے
تشبیہ بھی لا جواب ہے۔ یعنی مشرب آزادگان تو یہ ہے کہ بادہ آزادی
جوش پر ہو اور پیمانہ فکر لب تک لبریز ہو ”خط پیمانہ“ اور زنا میں مشابہت
لطیف ہے۔ خط پیمانہ بھی پیمانہ کے گرد لپٹا ہوا ہوتا ہے جیسے زنا جو رسم اور
مذہب پرست ہیں وہ سمجھ و زنا کی قید میں گرفتار ہیں تو یہ زنجیریں
توڑ پھوڑ کر رکھ دے اور نشہ آزادی میں سرشار رہ۔

چوں سمجھ دریں معبد عبرت چہ جنوں است
ذکر حق و برہم زدن و سر شکنیا

بیدل

پیدا است شغل ز ابد و وقت دگر چہ باشد
سر بایک دگر کوفت ہر گہ کہ یاد حق کرد

زمین ایک مسجد ایسی ہی ہے جیسے سموات بہاں ہر ایک شے ذات
باری کے حضور سجدہ کر رہی ہے۔ اس مجد میں تو عبادت الہی میں مشغول
رہنا چاہئے۔ لیکن ان زاہدوں اور پیسویوں کے سر پر کیا وحشت سوار
ہے کہ تسبیح اور مالا کے دانوں کی طرح خدا کی یاد کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے
کو بحث و مباحثہ میں نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے اور ایک دوسرے
کا سر پھوڑ رہا ہے۔

از بسکہ تنگ بود گذر گاہ اتفاق
چوں سبجہ خلق جز بیریک دگر نرفت
بیدل نے سبجہ و زنا پر بہت شعر لکھے ہیں بغرض تفسن یہ بھی
ملاحظہ ہوں۔

سختی دل نامہ را سنگ راہ آزاد گیت
رشتہ تا صاحب گرہ باشد رہش ہموار نیست
جمعیت دل است مارا فی کفر ہم
چوں سبجہ کوچہ داد بزنا دین ما

گر ہمہ کفر است فتواں سر ز ہمواری کشیا۔
سبجہ را دیدم طواف حلقہ زنا داشت

نقطہ دل گرد خود گشت و خط پر کار شد
گردش این سبجہ تا ہموار شد زنا ر شد
ان اشعار میں جو تخیل کا ر فرما ہے وہ غالب کے اس شعر میں بھی ہے۔

زنار پہن، سبھ صد دانہ توڑ ڈال
چلتا ہے راہرورہ ہموار دیکھ کر

صراط مستقیم یا راہ ہموار ہی منزل تک جاتی ہے۔ بیدل نے رشتہ
سبھ کو کوچہ اور سیدھے راستہ سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ یہ
کفر ہی ہے مگر ”ہمواری“ بہر حال پسندیدہ ہے۔ سبھ کے دانے بھی حلقہ زنار
کے گرد طواف کرتے ہیں، اور اگر دانہ سبھ (منکا) کو دل قصور کیا جائے
تو وہ بھی اپنے ہی گرد طواف کر رہا ہے، اور خط پر کار کی طرح جس نقطہ سے
شروع ہوا اسی پر اگر ختم ہوتا ہے۔ اس کی گردش جب تک ہموار ہے زنار
کی صورت ہے، مطلب یہ ہے کہ جادہ تحقیق پر انسان خواہ کتنی تنگ و دو
کرے اس کا مقصود اپنی ہی ”خودی“ ہوتی ہے۔

”ایں آئینہ سخت خود پرستی دارد“

دروادی عشق اگر دیدن باشد۔ ہر جادہ غیر خط کشیدن باشد
ماو سفرے کہ، بچو خط پر کار ہر جا برسی بخود رسیدن باشد

رسم و عادت

زندگی در بند و قید رسم و عادت مردن است

دست دست تست بشکن این طلسم ننگ را

اہل مذاہب ہمیشہ اپنے آباد اجداد کی روش پر چلتے ہیں اور یہ رسم و
رواج کی پابندی ہے۔ اصطلاح میں اس کو رانہ تقلید کو ”تعامل“ کہتے ہیں۔
یعنی جو عمل صدیوں سے بزرگ کرتے چلے آئے اسی پر کار بند رہتے ہیں،
یہ رجعت پسند وہی پُرانی لکیر پیٹے چلے آتے ہیں جو کسی وقت کسی بزرگ
نے خارجی حالات کے مناسب اختیار کی تھی، اس کی مذمت قرآن حکیم
نے فرمائی ہے۔ ان پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے اور ترقی یافتہ زمانہ کا

ساتھ نہیں دے سکتے یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کا جو کچھ تقاضہ ہے یہ بے حس اس سے بالکل غافل ہوتے ہیں، تو میں اسی جمود اور بے حسی کی وجہ سے ٹپتی رہیں۔ اور ہلاک ہو گئیں۔ بیدل کہتا ہے کہ اس رسم و عادت کی قید و بند میں قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں، اللہ نے مجھے دست و بازو دیئے ہوئے ہیں ان اغال اور سلاسل کو جو تیرے گلے کا ہار ہو رہے ہیں توڑ پھوڑ کر آزاد ہو جا، یہ ”طلسم ننگ و نام“ ہے، لوگ اس سے اتنے مسحور ہیں کہ کوئی جرأت نہیں کرتا کہ اسے توڑے، بدنامی سے ڈرتے ہیں اور بدنام کرنے والے جاہل رسم پرست شیعہ مؤدت بھی توڑ دیتے ہیں مگر رسم و عادت کے خلاف کوئی بات سُننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

گرفتار رسوم اندیشہ آرام کم دارد

عقاید آنچہ دارد خدمت دیرو حرم دارد

جو لوگ رسموں کے سختی سے پابند ہیں وہ تو ہمیشہ شہ گھڑی شہ لگن بہت دریافت کرتے رہتے ہیں، دیر کی یا تیرا اور حرم کا حج خواہ استطاعت نہ بھی ہو ضرور کرتے ہیں۔ دل میں پکڑ دھکڑ رہتی ہے کہ یہ رسم ادا نہیں ہوئی اور وہ کمی رہ گئی۔ غرض اپنی آسائش کے آپ دشمن ہیں۔ اپنی خدمت کرتے تو آرام و آسائش کے طالب ہوتے دیرو حرم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اس لئے آرام و کام کر رکھا ہے۔ گرفتار رسوم آزادی کے چھپے ٹھٹھے پھرتے ہیں۔

بیدل تو جنوں کن وریں ورطہ بدر زن

عالم ہمہ زندانی تقلید و رسوم است

آزادی پر بیدل نے دائر تحقیق دی ہے حقیقت یہ ہے کہ آزادی فکر محال ہے اگر انسان کے دل و دماغ پر عقاید اور رسم و عادت مسلط ہوں ان سے کنارہ کش ہو کر ہی آزادی ممکن ہے، اور حکومت خواہ اس کی

صورت کچھ بھی ہو سدا راہ آزادی ہے۔ ضمیر کی آواز بلند کرنا جرم ہے۔ صداقت اور حقانیت کا انکشاف ناممکن ہے اگر آزادی نہ ہو۔ انبیاء نے ہر ممکن تکلیف کفار کے ہاتھوں سے برداشت کی، ابتلا میں ثابت قدم رہے اور لوگوں پر حقانیت واضح کی، جو یائے حق مرد لیر شیر دل ہوتا ہے۔

”شیر مرداں را نباید بر طریق میش رفت“

بیدل کہتا ہے کہ

گر عروج آہنگی از زندانگہ گردوں برآ
ے سراپا نشہ شد تا دامن مینا گذاشت

لفظ ”مینا“ میں کیا لطافت پیدا کی ہے۔ آسمان مینا رنگ ہے اور شراب بھی مینا (صراحی) میں ہوتی ہے، شراب مینا سے باہر اگر کسی نشہ بنتی ہے۔ اسی طرح اگر تو عروج کی خواہش کرتا ہے تو گردوں سے بالا تر پرواز کر، نشہ بھی دماغ کو عروج کی طرف لے جاتا ہے۔

زندگی زیں انجمن یک گام آزادی خواست

ہر کرا دیدیم زیں جا بعد مردن رفتہ است

جسے آزادی کہتے ہیں اور جس کا تصور بیدل کے ذہن میں ہے وہ خود کہتا ہے کہ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔ زندگی خود ایک قید ہے۔

مخوذ خیر نفس بودن دلیل ہوش نیست

ہر کہ می بینی بقید زندگی دیوانہ است

اور اس قید میں جب تک ہے ایک قدم آزادی کی طرف اٹھ نہیں سکتا۔ البتہ جس کسی کو میں نے دیکھا مرکز ہی زندگی سے آزاد ہوا۔ اگرچہ کامل آزادی اس دنیوی زندگی میں ممکن نہیں مگر اتنا تو ہو کہ رسم و رواج کے اغلال و سلاسل کا بوجھ جہاں تک ممکن ہو ہلکا ہو۔

بیدل

بیدل کا نظریہ مذاہب یہ ہے کہ ہر ایک ملت اصل کی فرع ہے لیکن اہل ملت اصل کو جو غیر مرنی ہے اور محسوس نہیں ہوتی بھول جاتے ہیں اور فروغ کو جو محسوس ہوتی ہے پیش نظر رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

شیشہ و سنگ آتش و آبد دور از کو ہمسار

عالیے یا ہم، جدا از اصل، دشمن می شود

پتھر میں آگ ہے اور شیشہ میں آب اور آگ اور پانی کا آپس میں بیر ہے۔ پتھر اور شیشہ کی ایک ہی اصل پہاڑ ہے لیکن اصل سے جدا ہو کر دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ تو شاعرانہ تخیل ہے اور لطیف ہے، امر واقعہ بھی یہی ہے کہ عالم انسانی کی اصل انسانیت ہے اور سب مرد و زن "نفس واحدہ" میں جو اصل ہے متحد ہیں، لیکن یہ کثرت جو عالم انسانی میں مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ اختلاف الوان و لسان نفس واحدہ کی فرع ہی ہیں اور باہم دست و گریباں ہیں۔ اگر انسانیت کا صحیح تصور ان کے ذہن میں ہوتا تو اصل سے ذہنی پیوستگی، آشتی پرے آتی۔ اصل سے جدا ہو کر فروغ ہو کر ایک دوسرے کو اپنا "غیر" تصور کر رہے ہیں، حالانکہ اگر اصل پر نظر ہو تو ایک دوسرے کا "عین" ہے۔

از اصل دور ماند جہانے بذوق فرع ماہم یک آگینہ بخارا ز دیم پا

نومید اصل رفت جہانے بذوق فرع تا وضع قطره داشت ز دریا گہر زفت
جب تک گہر کی وضع قطره آب کی تھی دریا سے پیوستہ رہا جو اس کی
اصل ہے۔ لیکن "ذوق فرع"، میں اصل سے جدا ہو گیا۔ آب تو اس میں
اب بھی ہے مگر دریا تو اور یہ خشک۔

اخلاقیات

”خلق“ اور ”خلق“ دونوں ایک ہی لفظ ہیں حرکات کی تبدیلی سے مفہوم میں یہ فرق ہے کہ ”خلق“ ظاہری صورت کی بناوٹ ہے جو محسوس ہوتی ہے اور ”خلق“ ذہنی ہئیت ہے، اور ”عادت“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی سے کسی شخص کی ذہنی حالت کا پتہ ملتا ہے، اخلاق پر بیدل نے بہت کچھ لکھا ہے، اسی کی ذیل میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جن سے اخلاق کی درستی ہوتی ہے، مثلاً پند و نصائح، اوصاف حمیدہ اور خصائل ذمیہ، نیک و بد کا بیان، بیدل کا نظریہ خلق یہ ہے کہ خلق معرفت سے افضل ہے اور کرم عارف سے اکمل ہے، خلق و کرم جو ہر ذاتی ہے اور علم کسی، حق تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی ستائش خلق عظیم کی ہے (انک لعلى خلق عظیم) صفت عارف و عالم ایسی بات نہ تھی کہ قابلِ ذکر ہو۔

بیدل ایسی نصیحت مذموم سمجھتا ہے جو فضیلت ہو اور جو ناصح کا خود عمل نہ ہو۔ بقول عارف رومی :-
 ہر کسے ناصح برائے دیگران ناصح خود یا فتم کم درجہاں
 حافظ بھی کہتا ہے کہ

بیدل

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبر می کنند
چوں خلوت می روند آن کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانش مند شہرایں باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

اور یہ کہ وعظ بے عملان واجب است نشیندن۔ بیدل چہار عنصر
میں لکھتا ہے کہ دنیا میں ہر ایک شخص اپنے اپنے حال میں مست ہے تو
خود نادان ہے کہ دانا نا صبح مشفق بن کر لوگوں کے اوقات میں خلل انداز
ہو تلے، ہر ایک سر میں کسی نہ کسی امر کی دھن ہے، تکلف آمیز باتیں
بنا کر کیا ضرور ہے، تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نبیر تو، اگر تیرے دم میں کچھ
اثر ہے تو اپنے آپ پر صرف ارشاد کو تاکہ لوگ تجھے ہرزہ گو نہ سمجھیں، اور
اگر تیرا خن رسا ہے تو اپنی ہی گرہ کھول، دوسروں کے دل کو زخمی کیوں کرتا
ہے۔ بہر حال پسند و نسیحت ”فرخندہ بخت آنکہ سمیع رضا شنید“ لیکن
بر دل کس نخوری از دم سرد وعظ بے جا ہمہ جا مرد و داست
سب سے بہتر عملی نمونہ ”اسوۂ حسنہ“ ہے، زبانی وعظ ہمیشہ
بے اثر ہی ہوتا ہے۔

پند نا صبح پر منغنص کرد دقت مے کشاں
از کجا آورد این خر نغمہ جا بکامہ را

بیدل کہتا ہے کہ

من وما ہرچہ دارم در غبتے و نفرستے داد
جہاں وعظ است لیکن گوش بجای نصیحت را

لوگوں میں نفسانیت کی وجہ سے خود غرضی، خود ستائی، خود نمائی
مشاہدہ ہوتی ہے، اور دو حال سے خالی کوئی دل نہیں اور یہ رغبت اور
نفرت ہے، اگر لوگوں کے حالات مشاہدہ کئے جائیں تو یہ بجائے خود

دفتر و عطا و پسند و نصیحت ہے مگر گوش ہوش کہاں، سننا کون ہے یہی رغبت اور نفرت ہر ایک جگہ کار فرما ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص طالب نصیحت ہو تو اسے جو کچھ دنیا میں واقع ہو رہا ہے لوگوں کے حالات میں دیدہ عبرت سے مشاہدہ کرنا چاہئے، لقمان سے کسی نے پوچھا کہ دانا ئی کا سبق کس اُستاد سے سیکھا، جواب دیا نادانوں سے، جو کچھ وہ کرتے ہیں میں نہیں کرتا۔

حقیقت میں پسند و نصیحت بھی تحت الشعور ”محاسبہ“ ہی ہوتا ہے، اور یہ ”فقیہیت“ بن کر رہ جاتی ہے جب مخاطب کو تحت الشعور اس کا احساس ہو کہ ناصح مشفق اس کے اعمال کا جائزہ بلا اختیار و حکومت لے رہا ہے، اور اس طرح اپنا تفوق (جاری

ہے۔ اس لئے وعظ کا موضوع عیب و ہنر ہی ہوتا ہے، اور عیب جو یا تو خود مدعی فضل و ہنر ہوتا ہے یا اپنے عیوب چھپانا چاہتا ہے۔

کسے کہ نیک و بد ہوشیار و مست پوشند

خدا عیب و از چشم ہر کہ ہست پوشند

جو شخص کسی کے خواہ وہ ہوشیار ہو یا مست نیک و بد سے سروکار نہیں رکھتا آمید ہے کہ خدا اس کے عیب ہر ایک شخص کی آنکھ سے پوشیدہ رکھے گا۔

رنج خفت مکش با ظہار کمال

نزدایں طایفہ بے عیب نبودن ہنر است

اظہار کمال کا مفہوم یہ ہے کہ نقائص پوشیدہ ہوں، اگر تو اپنے کمال کا اظہار کر رہا ہے تو لوگوں کے ذہن نشین یہ کرنا چاہتا ہے کہ تجھ میں کوئی نقص نہیں۔ حالانکہ اہل کمال کا نظریہ یہ ہے کہ بے عیب نہ ہونا ہی ہنر ہے، اس لئے اگر تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تو بے عیب ہے تو اہل کمال نہیں کہتے ہیں کہ ”عیب کرنے کو ہنر چاہئے“ ہو سکتا ہے کہ تو اپنے عیوب ہی

بیدل

کو بطور ہنر پیش کر رہا ہو، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ واجب ہے کہ انسان میں عیب ہو، اگر نہ ہو تو وہ انسان نہ ہو گا حیوان مطلق ہو گا۔ عیوب کا رفع کرنا ہی طلب کمال ہے، عیوب ہونگے تو کمال کا حصول ممکن ہے لیکن انسان کبھی کامل نہیں ہو سکتا ورنہ ارتقاء ترک جائے گا۔

دعویٰ فضل و ہنر خوارسیت درانیئے دہر

آبرو خواہی گرایں جا اندگے ناداں بر آ

اگر کوئی شخص صاحب فضل و ہنر ہو اور اسے اس کا دعویٰ ہو تو وہ لاف زنی سمجھی جاتی ہے اور موجب خوارسی و رسوائی ہے آبرو اسی میں ہے کہ دانا ہوتے اپنے آپ کو تھوڑا سا نادان ظاہر کر دے۔

دانا نشود از ہنر خویش بر و مند

از میوہ خود بہرہ محال است شجر را

از دو شاگشتن ندارد چارہ غل میوہ را

قامت ہر کس بزیر بار می آید خم است

درخت اپنا پھل آپ نہیں کھاتا۔ دوسروں کو کھلاتا ہے اسی طرح جو دانا ہیں وہ اپنے ہنر کا پھل دوسروں پر ازراں کرتے ہیں (مصادقہ تمہم ینفقون) اسی کو تواضع کہتے ہیں، بیدل نے لفظ "بار" میں لطف پیدا کیا ہے۔ بار کے معنی پھل بھی ہیں اور بوجھ بھی، بوجھ سے بھی قامت جھک جاتا ہے اور درخت میوہ دار بھی جھکتا ہے جو تواضع کی صورت ہے۔

اگر علم و فنے داری نیاز طاق نسیاں کن

کہ رنگ آمیزیت نقاش می سازد و خجالت را

اگر تو صاحب علم و فن ہے تو بھول جا کہ تو ایسا ویسا ڈبل پیسہ ہے، یہ علم و فن طاق نسیان پر صرف کر، اسی طاق کو ضرورت آرائش و زیبائش

کی ہے، اسی پر پیل بوٹے بنا اور ان میں رنگ بھر، علم و فن نقاشی اسی پر ختم کر، چونکہ

”دعویٰ فضل و ہنر خوارِ یست در ابنائے دھر

آبرو خواہی گزراں جا اند کے ناداں بر آ“

دعویٰ علم و فن خوارِ ی و خجالت ہے۔ اس لئے دانائی یہ ہے کہ لوگوں میں خوار و خجل نہ ہو اسی خوارِ ی و خجالت کو نقاش اور طاق نسیاں کا گلہ ستہ و فن بنا، غالب نے بہت دیر کے بعد ہوش سنبھالی۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزمِ آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بر عیب خلقِ خوردہ نگیرند محرمات

اے بے خبر من و تو خدا نیست بندہ است

جونیک و بد کی حقیقت سے واقف ہیں اور محرم کمال ہیں وہ لوگوں کے عیب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور جو دیکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ میں اور تو خدا تو نہیں جس کی ذات ہر ایک عیب سے پاک ہے، بندہ ہیں اور خطا و تیاں تمام انسانی اور بندگی ہے یا تغافل از عالم یا از خود نظر بستن

زیں دو پردہ بیرون نیست ساز عیب شہبا

عیب پوشی کا ساز یہی تغافل ہے یا چشم پوشی ہے ان دو پردوں سے باہر ساز و سامان عیب پوشی نہیں۔

تغافل از بد و نیک اعتبار اہل حیا است کہ سرخ روئی چشم آور دغ خود نہا

اہل حیا کا اعتبار یا عزت و وقار تغافل میں ہے چشم پوشی میں ہے۔

جب نیند کا غلبہ ہو تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور خود بخود بندہ ہوتی ہیں۔ اس شعر میں سرخ روئی، ایک امر واقعہ بھی ہے اور مفہوم اعتبار اور عزت

و وقار بھی ہے۔

عاقبت بینی نظر پوشیدن است از عیب خلق
آنچه در انجام خواہی بستن از آغاز بند
عاقبت بینی، دور اندیشی و انائی کے ہم معنی ہے۔ انجام کار ہر ایک
شخص کی آنکھیں بند ہو جائیں گی، مناسب ہے کہ آغاز ہی سے چشم پوشی
سے کام لے اور لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔

مژہ بر بند و فارغ شوز مکروہات این محفل
تغافل عالے دارد کہ عیب این جا ہنر گردد
جب آنکھیں کھلی ہوں تو عیب و ہنر اور ہموار و پست سب یکجہ
نظر آئے گا۔

چشم پوشیدیم یکساں شد بلند و پست دہر
عالے را شوخی نظارہ تا ہموار داشت
محض دنیا کے مکروہات سے چشم پوشی کی جائے تو ان سے فراغت
بھی حاصل ہو جائے گی، تغافل یا چشم پوشی ایک ہنر ہے بلکہ ہر ایک قسم
کے مکروہات کو جو عیب ہی ہیں ہنر بنا دیتا ہے۔

خود نمائی بھی ایک عیب ہے اس موضوع پر بیدل نے بہت کچھ
کہا ہے ”خودی“ کا مذموم پہلو خود بینی و خود رائی و خود ستائی و خود نمائی
ہے، لوگ اس حقیقت سے بہت کم واقف ہیں کہ حسن و خوبی کا تقاضہ ہے
اور فطری تقاضہ ہے کہ ”خود نما“ ہو اور عیوب و مکروہات جتنے پوشیدہ
رہیں اتنا ہی اچھا ہے۔ فطرت کا منشاء ہے کہ حسن و خوبی کا اظہار ہو، لیکن
اس کا احساس عیب کی موجودگی کا بھی طالب ہے۔ بے مصلحت بیست
ظہور شیطان، لیکن حسن و خوبی خود بخود جاذب نظر ہوتی ہے اس کی
ستائش کرنے والے اہل نظر ہوتے ہیں وہ خود ستائی نہیں کرتی خود ستائی

لاف زنی کے ہم معنی ہے جو معیوب ہے۔

گر محرمی علم نفرازی بحرف پوچھو

اس پنبہ پر چسپیت کہ بردار بستن است

اگر تو محرم حقیقت حسن و خوبی ہے تو اپنے نام کو ہرزہ گوئی یا دعویٰ

خود ستائی سے مت اچھا لے۔ ”حرف پوچھ“ یہ ہودہ گوئی ایسے حرف سے اپنا

جھنڈا بلند نہ کر جو پوچھ اور فضول ہو، حرف پوچھ روئی کی طرح ہے جس کا

پھر یہ اس لائق ہے کہ دار یعنی صلیب پر آویزاں کیا جائے۔ اس شعر میں

اشارہ حسین منصور صلاح کی طرف ہے، شعر کی لطافت الفاظ علم اور پنبہ

اور پرچم اور دار میں ہے۔ منصور کا پیشہ حاجی تھا یعنی دھنیا تھا۔ مانا کہ اس کا

دعویٰ ”انا الحق“ صحیح تھا جب کائنات کی نسبت اہل ذکر و فکر کا فتویٰ

ہے کہ ربنا ما خلقت هذا باطلا تو جو کچھ اللہ نے پیدا کیا حق ہے،

منصور کو کیا امتیازی خصوصیت حاصل ہے؟ یہی ناکہ وہ اس راز سے

محرم تھا اور عوام نہیں ہیں۔ لیکن اس کا دعویٰ حرف پوچھ ہی تھا، اور اسی

لائق تھا کہ اسے صلیب دی گئی، وہ اپنے لئے ایک خصوصیت پیدا کر رہا

تھا جو غلط دعویٰ ہے۔

خود نمائی حرف پوچھ غواہی بودن۔ رد آئینہ زریں پیش سکندر زوہ است

مشہور ہے کہ آئینہ سکندر کی ایجاد ہے۔ اس میں عکس یا تمثال خود نمائی

ہے، سکندر نے بھی یہ دروازہ کھٹکھٹایا، نہ سکندر رہا اور نہ اس کی تمثال۔

اوج دولت سفہ طبعان را دوروزی بیش نیست

خاک اگر امروز بر چرخ است فردا زیر پاست

خاک پست اور پستی کے ہم معنی ہے۔ اگر طوفان باد یا انقلاب کی وجہ

سے عایبہا سا فلہا ہوں اور خاک اڑاؤ کر بلند ہو تو کب تک، فطری پستی

اسے پھر پستی کی طرف لے آئے گی۔ آج اگر خاک دھول لوگوں کی آنکھوں میں

پڑتی ہے اور لوگ اسے سراور آنکھوں پر بٹھاتے ہیں تو کل پاؤں کے نیچے
پامال ہوگی۔

جو تمکین مالی فطرت ازدوں ہمتاں بیدل
ثبات رنگ انجم نیست گلہائے زمینی را
جو تمکین یا استقلال مزاج مالی فطرت لوگوں میں ہوتا ہے وہ پست
فطرت، پست ہمت لوگوں میں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا زمین پست ہے
اور آسمان بلند۔ زمین سے جو پھول پیدا ہوتے ہیں ان میں وہ ثبات نہیں
جو تاروں کو حاصل ہے۔

حرص خلقے را دریں محفل بنموری گداخت
غیر چشم سیر جام، بیج کس سرشار نیست
آنکہ کو جام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سیر چشم ہی سرشار ہے لیکن اس
بزم ہستی میں لوگ حرص کے نشہ میں چور ہیں، سیر چشم اہل قناعت ہیں،
قناعت کا نشہ حرص کی مخموری سے بہتر ہے۔

معبد حرص، آستان سجدہ بے عزت نیست
عالیے ایں جا بآب روتیم کردہ است
حرص کی مسجد بے عزتی کے سجدہ کا آستانہ ہے۔ ایک دنیا جو اس کی
پجاری ہے آبرو سے تیمم کر رہی ہے، پانی سے وضو کیا جاتا ہے اور پانی
دستیاب نہ ہو تو مٹی سے تیمم کرتے ہیں۔ آبِ روتیم کو حرص خاک میں ملا دیتی ہے۔
از مائدہ بے نمک حرص میر سید

چیزیکہ بجز غصہ تو ان خورد محال است
بے نمک کھانا پھیکا بے مزہ ہوتا ہے، دسترخوان حرص پر کچھ اور تو
مزیدار چیز کھانے کو نہیں ملتی البتہ غصہ ہے جتنا چاہو کھاؤ۔
حرص مشکل کردہ فہم قناعت سپرو آب آئینہ پلے داشت سکندر نگذاشت

”رہ فہم قناعت“ وہ راستہ یا طریق جس پر چل کر قناعت کی سمجھ بوجھ پیدا ہو کہ ”حرص“ کا راستہ ترک کر کے قناعت اختیار کرنی چاہئے۔ لیکن حرص اس راستہ پر آئے نہیں دیتی اگر یہ ممکن ہوتا تو سکندر بھی یہی راستہ اختیار کرتا۔ آب سے عبور پل کے ذریعہ کیا جاتا ہے، سکندر تو خود آئینہ کا موجد ہے اور آئینہ میں آب ہے اگر وہ اس آب آئینہ میں غور کرتا تو آئینہ اس کے لئے پل کا کام دیتا اور اسے فہم قناعت ہوتا، مگر وہ گزر نہ سکا، تمام کرہ ارض کی تغیر ایک حرص ہی تھی، ہاتھ کیا آیا، خالی ہاتھ دنیا سے گیا۔ چوں سکندر دولت بکسے نیست مسلم پیدا است کہ ہر نقش انگلیں نقش بر آب است

بادشاہی در طلسم سیر چشمی بستہ اند
 کا سہ چشم گداگر پر شود جام جم است
 جمشید ایران کا بادشاہ تھا۔ اس کے پاس ایک جام تھا جس میں تمام ممالک کرہ ارض کے حالات مشاہدہ ہوتے تھے سیر چشمی یعنی قناعت میں بادشاہی کا طلسم باندھا گیا ہے گدا جو رلیں ہی ہوتا ہے اگر اس کا کا سہ چشم اسی قناعت سے پُر ہو تو وہ جام جم ہے یعنی بادشاہ وقت ہے۔
 اوج و حفیض قسزم امکان شگافتم

از آبرو گو ہمہ جا این گہر گم است
 زمانہ کی بلندی و پستی میں جستجو کی، بحر امکان کی سطح اور قعر میں غوطے لگائے مگر ”آبرو“ کی کیا پوچھتے ہو کسی جگہ اس کا نشان نہ پایا۔
 در شکست آرزو تعمیر خندیں آبرو ست

بنہم ایجاد است اگر موج ہو خواہد شکست
 ”ہوا“ کے معنی حرص و ہوس بھی ہیں اور غصہ بھی جس سے ہم زندگی کا سانس لیتے ہیں، اگر کرہ ہوا کی موج ٹوٹے تو بنہم پیدا ہوتی ہے،

شبنم آب ہے، اس لئے اگر آرزو، خواہشات نفس کو توڑا جائے تو آبرو کی تعمیر ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ خواہشات احتیاج کی تسکین چاہتی ہیں، اور اس کے لئے ہمیں دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے اور یہ آبرو کھونا ہے۔
از بسکہ بہ تخصیل غنا حرص تو جاں کند

قبر است نگینے کہ بنام تو تو اں کند
مال و دولت کی طمع میں اتنی کاوش کہ جان کئی تک نوبت آجائے
اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قبر کے پتھر پر تیرا نام کندہ کیا جائے اور بس، مفلس کی قبر پر تو کوئی کتبہ بھی نہیں ہوتا، مگر امراء کے سنگ مزار پر ان کا نام کندہ ہوتا ہے جو اس واقعہ کی یادگار ہے کہ اس شخص نے تمام عمر جان کئی میں بسر کی دولت کمائی جو تعمیر مقبرہ کے کام آئی۔ "جان کندن" انتہائی کوشش کرنا ہے۔

رحم بر قاروں سرشتاں گن کر از افسون حرص

ایں خراں زیر زمیں ہم بار دنیا می کشند
قارون حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، حکومت مصر کا منظور نظر تھا۔ بہت مالدار تھا مگر اننا بخیل اور خسیس تھا کہ خدا کی راہ میں ایک کوڑی بھی خرچ نہ کرتا۔ حضرت موسیٰ نے اسے کہا کہ خدا نے تجھے اتنا دیا ہوا ہے اگر اس میں سے کچھ قوم کی مدد کے لئے خرچ کرے تو کارِ ثواب ہے، قوم محکوم اور مفلس مدد کی محتاج ہے۔ مگر قارون نے پرواہ نہ کی، آخر جب اس کے کاروبار میں تزلزل واقع ہوا اور حکومت کی نظروں سے گر گیا تو سب شان و شوکت جس کا اظہار فخر یہ کیا کرتا خاک میں مل گئی۔ روایت ہے کہ وہ جہنم کا خزانہ زمین میں دھنس گیا۔ اس شعر میں تلحیح کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ قاروں سرشت بخیل ہوتے ہیں ان کی حالت قابلِ رحم ہے کہ مگر کبھی یہ گدھے دنیا کا بوجھ پشت پر لا رہے ہیں۔ اگر امراء کے مقبروں کو دیکھا جائے تو وہ بھی

ذیوی جاہ و شہادت دیتے ہیں جو ان گدھوں کے سر پر کھڑے ہیں
ہلاک شد جم و خمیازہ ہائے جام بجاست

برگ نیز ندارد و خمار جاہ شکست

جمشید تو مر گیا مگر جام پیچھے چھوڑ گیا جو انگڑائیاں لے رہا ہے۔ نشہ جب
اُتر جائے تو شرابی انگڑائیاں لیتے ہیں جسے خمار کہتے ہیں۔ جاہ و شہمت
جمشید سے بطور ضرب المثل منسوب ہے، اور نشہ دولت تو جمشید کے ساتھ
ہی جاتا رہا مگر خمار جاہ موت کے بعد بھی نہ ٹوٹا کیونکہ قبر میں خمیازہ بھگت
رہا ہے۔

برغنا زد احتیاج خست انبائے دہر

تنگ دستی در عزیزاں ماند یک ازا گذشت

اہل دنیا کی خست اور بخل انتہائی احساس احتیاج کی وجہ سے ہے۔
وہ ہاتھ اس لئے بند رکھتے ہیں کہ دولت ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور وہ
محتاج ہو کر نہ جائیں، اس لئے وہ تنگ دل، تنگ دست ہی رہے اور
تنگ دستی یعنی احتیاج اہل قناعت میں نہیں، آنا کہ غنی تر اند محتاج
تراند (سعدی)

بگذر ز غنا تا نشومی دشمن اجباب اوّل سبق حاصل زر ترک سلام است
اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کم ظرف پست فطرت کو دوات ملے، تو
اپنے ابتدائی دوستوں سے ملنا بھی عار سمجھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زر جو
پہلا سبق سکھاتا ہے وہ ترک سلام ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بیگانہ آشنا ہوتا جاتا
ہے اور بسا اوقات اپنے روٹی سے دوستوں کو بھی دشمن بنا لیتا ہے۔

چہ خوش است اگر بود آفتد رہوس بندی منظر

کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گرد شے غورت سرت
زیادہ بندی پر چڑھو تو سر چکرانے لگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہے کہ بندی

کی ہوس اتنی حد تک ہو کہ جب تو وہاں قدم رکھے تو تیرا سر نہ پھرے ہم نے بہت سر پھرے دیکھے ہیں۔ بہر حال یہ عارضی شے ہے، اس پر اتنا کام بہتی ہے۔ بیدل اپنی نسبت کہتا ہے کہ ”خلقے بجاہ تکیہ زد و ماز و دیم پا“ لوگ تو جاہ و حشمت کا سہارا لیتے ہیں میں نے اسے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔

دیں زمانہ زبں طبع دول رواج گرفت

عنان کسب کمالات سوئی ناں گردید

صرف بیدل کے زمانہ میں ہی نہیں بلکہ ہمارے زمانے میں بھی یہ حالت ہے کہ پست فطرت اتنی عام ہے کہ کمال اسی میں سمجھ رہے ہیں کہ روٹی ہو اور بس۔ ہر ایک کسب کا مقصد اور غرض و غایت صرف روٹی ہے۔ اور جتنی روٹیاں زیادہ ہوں اتنا ہی وہ کسب میں کامل ہوگا بلکہ کمالات کا کسب کرنا روٹی ہے۔ ہر ایک کی عنان توجہ اسی نان کی طرف ہے۔

جز ہم چیدن کسے را با تصرف کار نیست

گندم انبار است ہر سو لیک قحط آدمیت
اگرچہ گندم کی فراوانی ہے مگر قحط انرجال بھی ہے۔ آدمیت انسانیت تو مفقود ہے گاؤں و خیر چارہ کی فکر میں ہیں۔

از ترسم تاروت و ز مدارا تا وفا

ہر چہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفته است
ترحم اور مروت اور مدارا اور وفا اعلیٰ اخلاقی امور ہیں، میں نے انکی تلاش کی تو دیکھا کہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔

نور دل خواہی غبار طبع منطلو ماں مباش

بایدت آئینہ جائے برد کا نجا آہ نیست

دل آئینہ کی مثال ہے، صاف اور کینہ و بغض و حسد سے پاک ہونا چاہئے اس کی صفائی گرد و غبار رکھ کر کرتا ہے اگر آئینہ پر آہ کریں تو اس کی

سطح مکدر ہو جائے گی۔ اس لئے اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا آئینہ دل نورانی رہے تو مظلوموں کے دل پر غبار نہ آنے دے۔ مناسب یہی ہے کہ آئینہ کو ایسی جگہ رکھا جائے کہ اس پر آہ کا اثر نہ ہو مظلوم کے دل پر کسی کی طرف سے غبار آجائے تو وہ آہ ہی بھرے گا۔

درکھِ اخلاق تست رشتہ تسخیرِ خلق

غافل از احسان مباشر ہیج کست بند نیست

تیرے اخلاق کے ہاتھ میں خلق کی تسخیر کا رشتہ ہے اور یہ احسان ہے، جس کسی پر احسان کرے گا اس کا دل مسخر کرے گا لیکن اتنا یاد رکھ کہ مخلوق تو خدا کی ہے، اور سب اللہ کے بندے ہیں تیرا بندہ نہیں جس پر تو احسان کر رہا ہے۔ جو شخص کسی پر احسان کر کے جتنا ہے اور جو اس نیت سے احسان کرتا ہے کہ بندہ خدا میرا حلقہ بگوش ہو جائے اور عموماً اہل دنیا ایسا ہی کرتے ہیں وہ احسان نہیں کرتے وہ سرمایہ دار لوگوں کے جان مال کو خرید کرتے ہیں اور غرض روپیہ قرض دے کر اصل مع سود وصول کرنا ہوتا ہے۔

زتازہ روئی اخلاق نگذری بیدل بہارتنا اثر رنگ و بو ست می باشد
جب تک گلشن میں رنگینی ہے اور پھولوں کی مہک سے فضا بھری ہوئی تب تک بہار کی موجودگی محسوس ہوتی ہے، اس لئے اخلاق کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کہ زندگی کی تروتازگی اسی سے ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ دستِ سوال دراز کرنا انتہائی ذلت ہے تو کبھی تاقیامت سوال نہ کرے۔

دل از شکایت افلاس بہ کہ جمع نمائی

زباں بکام تو بس گر جہاں بکام تو نیست
بہتر یہی ہے کہ فقر و فاقہ قبول کرو اور افلاس کی شکایت اس لئے نہ

کہو کہ کوئی مختیر تم پر احسان کرے۔

از رفتن آبرو خسر گیر ہر جا اظہار مطلب آمد
زبان تیرے منہ میں ہے اس پر قابو تیرا ہے یا پاسکتا ہے، جہاں اگر
تیرے کام نہیں آتا تو اس پر تیرا زور نہیں چل سکتا البتہ زبان میری ہے
اسے آلودہ شکوہ و شکایت نہ کر۔ اس شعر میں یہ ”کام“ دو معنوں میں
استعمال ہوا ہے۔

غنا مسلم آں کس کہ در قلم و حاجت

غبار گرد و در راہ آشنا نہ نشیند

استغنا اس شخص کا قابل تسلیم ہے کہ باوجود احتیاج خواہ پس
جلے اور پس کر غبار بن جائے مگر کسی دوست کے راستہ میں نہ پڑے۔
گرد و غبار اڑ کر آنکھوں میں پڑتا ہے، خاطر آلودہ ہوتا ہے، مطلب یہ
ہے کہ انسان کو اتنا بے نیاز ہونا چاہئے کہ کسی کا احسان قبول نہ کرے
خواہ احتیاج اسے خاک میں ملا دے دامن سوال کسی دوست کے آگے
بھی نہ پھیلائے۔ اسی کے ہم معنی دوسرا شعر ہے کہ
غبار غیرت آں مطلبم کہ کاہ تنہا

رود بباد و بروئے کف دعا نہ نشیند

غیرت کا تقاضہ ہے کہ غیرت مطلب برآرمی کی خواہش نہ کی جائے
دستور ہے کہ دعا کے بعد کھلے ہاتھ چہرہ پر ملتے ہیں۔ اور دعا کسی
حاجت برآرمی کے لئے ہی مانگتے ہیں، کسی مطلب کے لئے ہی ہوتی ہے۔
اگر اس پر غبار عزت ہو تو منہ کو خاک آلودہ کر گیا۔ بہتر ہے کہ یہ غبار
ہوا میں تنکے کی طرح اڑے مگر کف دعا کو آلودہ نہ کرے۔ مطلب تو
صرف اتنا ہے کہ تنہا کے تنکے ہو ایں اڑیں مگر دست دعا پر آکر نہ
ٹھہریں اگرچہ یہ غیرت کا تقاضہ ہے مگر میں اس غیرت پر بھی خاک

ڈالتا ہوں کہ آخر یہ بھی ایک مطلب ہے میں طلب سے بھی بے نیاز ہوں۔
ہجوم شکوہ ہر کس زد و مفلسی باشد

نخیزد نالہ از نے تا بود مغز استخوانش را
جب تک بانسری کی ہڈی میں مغز ہے یعنی گودا ہے اوردہ اند سے
خالی نہیں ہوتی اس سے نالہ جاسوز پیدا نہیں ہوتا اسی طرح مفلس جب
ہاتھ خالی ہوتا ہے تو مفلسی کا رونار دوتا ہے، اگر کسی کے پاس مال ہو تو
شکوہ مفلسی نہیں کرتا۔

شود کم ظرف در نعمت ز شکر ایزدی غافل

کہ سیری مہر خاموشیت چوں ساغر دہانش را
کاسہ بھرا ہوا ہو تو گویا اس کے منہ پر مہر خاموشی لگی ہوئی ہوتی ہے
اسی طرح کم ظرف جب سیر ہو تو اللہ کی نعمت کا شکر نہیں کرتا۔ ساغر بھی
کم ظرف ہے۔ ایک چھوٹی سی چیز خیم کے مقابلہ میں ہے۔
دونوں باتیں ہیں مفلس شکوہ سے زبان آلودہ کرتا ہے اور اپنی احتیاج
کا اظہار کر رہا ہے اور خیرات بھی قبول کرتا ہے اور کوئی کم ظرف ہے تو شکر
نعمت نہیں کرتا ممنون شکر گزار بندہ ہونا چاہئے۔
تا نگردی پائمال منت امداد خلق

بے عرق گلے دو پیش از خجالت احسان برآ
مناسب یہ ہے تو لوگوں کی امداد کے بار احسان کے نیچے دب کر نہ رہ
جائے تو اس ذلت اور شرمندگی سے جو کسی کے احسان سے گوارا کرنی پڑتی
ہے باہر ہے۔ محاورہ ہے کہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ خجالت اور ذلت
سے آبرو جاتی رہتی ہے اگر تو کسی کا احسان قبول نہ کرے تو شرمندہ احسان
بھی نہ ہوگا۔

کم زیوسف نیستی لے قدر ادا عافیت چاہ و زندان مغنم گیر از صفا خواں برآ

حضرت یوسف کو بھائیوں کے حسد کی وجہ سے چاہ اور زنداں میں جانا پڑا۔ اگر بھائی چاہ میں نہ ڈالتے تو آخر الامر زنداں میں بھی نہ جاتے اور جو واقعات وہاں رونما ہوئے پیش نہ آتے ان مصائب کا اصل سبب بھائی ہی تھے اس لئے اگر تو عافیت کا قدر داں ہے تو چاہ و زنداں کو غنیمت سمجھ آخر یہ ٹھکانہ ہی تو ہے مگر بھائیوں کے زمرہ میں شامل نہ ہو۔

زقطع آفت دلہا حسود آسودہ نہ نشیند

شود خمیازہ مقرض افروں در برید نہا

مقرض جب انگریزی کی صورت اختیار کرتی ہے یعنی جب اس کے دونوں پھل کھلے ہوتے ہیں تو کاٹ میں تیز ہوتی ہے خمیازہ مقرض نئی ترکیب ہے۔ اسی طرح حاسد تو دلوں کو جو بوجہ آفت جڑتے ہیں قطع کرتا رہتا ہے۔

تہمت اعمال زشت ننگ حقیقت مباد

آدمی ابلیس نیست لیک حسد لغت است

آدمی کی فطرت تو پاک ہے لیکن بد اعمالی حقیقت انسانی پر بدنامدہ ہے، آدمی شیطان تو نہیں مگر حسد کی وجہ سے مورد لعنت بن جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ شیطنت حسد ہی ہے شیطان نے بوجہ حسد آدم پاک سرشت کا نکار کیا اس لئے اگر انسان بھی حاسد ہو تو گول سے شیطان نہیں کہیں گے مگر جس طرح شیطان ملعون ہوا یہ بھی لعنت کی زد میں آجائے گا۔ نہایت نرم اور لطیف پیرایہ میں حاسد آدمی کو شیطان ہی کہا گیا ہے۔

کجا روم کہ شوم امین از لب غمازہ عالم آدمیاں ہم فرشتہ اند مرا کہتے ہیں کہ فرشتے (کرام کا تمہیں) ہمارے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے اعمال اکثر بُرے ہوتے ہیں یہ تحریر یا ہمارا نامہ اعمال بروز حشر کھولا جائے گا گویا فرشتے غمازی کریں گے اس دنیا میں بھی لوگ غمازی کی وجہ سے

یہی کام میرے لئے فرشتوں کا کر رہے ہیں اب جائیں تو کہاں جائیں نہ دنیا میں غماز سے چھٹکارا نہ حشر میں نجات، دنیوی زندگی تعلقات ہی ہے اور انہی تعلقات میں ہر ایک انسان جکڑا ہوا ہے۔ اور ان کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔

سرمایہ نشاط تو رفع تعلق است از ترک برگ نے بمقام نوارسید
لفظ ”مقام“ رانگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بانسری کے
پتے علیحدہ ہوئے تو نغمات بھی الپنے لگی۔ ظاہر ہے کہ نغمہ نشاط آور ہے۔
اس لئے رفع تعلق سے انسان نشاط کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔
در خور رفع تعلق عیش خرم کن جو شمع

خارہ پانچہ اندک می آرد بروں گل می شود
”خار“ کے معنی کانٹا بھی ہے اور وہ دھاگہ یا جی ہے جو شمع میں جلتی ہے
”گل کے معنی پھول اور گل شمع، ظاہر ہے کہ پھول سامان عیش و نشاط ہیں
خار شمع یعنی جی جلتی بھی باہر نکلے گی اتنے ہی گل شمع پیدا ہوں گے کانٹا اگر
پاؤں کے اندر ہے تو تکلیف دہ ہے نکالا جائے تو راحت محسوس ہوگی۔
اس لئے خار تعلق جو خلش پیدا کرتا ہے عیش کے منافی ہے راحت اسی
میں ہے کہ یہ کانٹے جو ہمارے راستہ میں بچھے ہوئے ہیں پاؤں میں نہ چھیں۔
اگر مروی در تخفیف اسباب تعلق زن

کز انگشت دیگر انگشت نزدیک دارد
اگر تو مرد آدمی ہے تو اسباب تعلق کو کم کر، انگشت نری یعنی انگوٹھا کا
ایک بند یا جوڑ یا پور دوسری انگلیوں سے کم ہوتا ہے۔ لفظ ”نر“ سے
مردمی اور مردانگی کا خیال پیدا کیا گیا ہے۔ تعلقات بندھن ہے اس
گرہ کو کھولتے جاؤ یہی ہمت مردانہ کا کام ہے۔ التوحید اسقاط
الاضافات ”کثرت جو امور اضافی ہیں ان کو محو کرتے جاؤ تو وحدت رہ

جائے گی۔

سبب قیدِ علایق زخرد پر سیدم گفت در چاہ ہیں فطرت کو رم افگند
میں نے عقل سے پوچھا کہ توجہ علایق کی قید میں جکڑی ہوئی ہے اس کا
سبب کیا ہے، جواب دیا یہی میری اندھی فطرت ہے جس نے مجھے کنوئیں
میں گرایا۔ یہ شعر نہایت لطیف ہے، عقل کی فطرت کا تقاضا منہ ہے کہ وہ
علایق کی طالب ہے۔ اندھا نشیب و فراز دیکھ نہیں سکتا راستہ میں گڑھا
آیا تو اس میں آ رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقل ہی ہے جس نے ہمیں علایق
کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، اور اندھے کنوئیں میں گرایا۔ عقل حریص
کثرت کی طالب ہے۔

حرص قانع نیست بیدل در نہ اسباب معاش

آنچه مادر کار داریم اکثرے در کار نیست

حریص قانع نہیں ہوتا ورنہ جتنے بھی اسباب معاش میں ہم کام میں
تھوڑے ہی لارے ہیں باقی بیکار پڑے ہیں یعنی اسباب معاش میں
سے تھوڑے ہی کام کئے ہیں۔ لیکن عقل کثرت پسند انھیں جمع کر رہی ہے
اور دورانِ اندیشی یہ ہے کہ ممکن ہے کہ بوقتِ ضرورت اسباب کی کمی ہو اس لئے
ذخیرہ رکھنا چاہئے تاکہ بوقتِ حاجت کام آئے۔

بیدل اسباب تعلق بود رنگ آگہی

آئینہ صیقل زدند آنہا کہ پشت پا زدند

لفظ ”آگہی“ بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا ہے۔ غالب نے بھی
اکثر اشعار میں استعمال کیا ہے۔ معرفتِ اشیاء جو عقلاً حاصل ہوتی ہے
در اصل آئینہ پر زنگ ہے۔ جن لوگوں نے ان اسباب تعلق کو ٹھکرا دیا
وہی آئینہ دل کو صیقل کرتے ہیں جس سے زنگ کدورت دور ہوتا
ہے۔

آگہی طوفان غفلت ریخت بیدل بر جہاں

عالی بیدار بود ایں فتنہ ناخوابیدہ بود

ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی آگاہ ہوگا اتنا ہی باشعور ہوگا جو عین بیداری کا تقاضا ہے، بیدل کا نظریہ یہ ہے کہ آگاہی معرفت اشیاء اور کثرت اشیاء اسباب تعلق کا شعور ہے۔ چونکہ عقل اسی کی طالب ہے۔ اس لئے ہر ایک شخص زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور عالم انسانی میں فتنہ جاگ اٹھا، جب تک یہ فتنہ سویا ہوا تھا یہ سمجھو کہ ہم بیدار تھے، یہ فتنہ جاگا تو ہم سو گئے یعنی آنکھوں پر پردہ غفلت پڑ گیا، جب ہر ایک شخص اسباب معاش زیادہ سے زیادہ جمع کرے گا تو ظاہر ہے کہ جو زبردست ہیں وہ کمزور کو اس کے حق زندگی سے محروم کر دیں گے، زبردست وہی ہے جس کو ذہنی تفوق حاصل ہے اور یہ قوت عقیدہ ہے جس کے بل بوتے پر یہ فتنہ برپا ہے۔ وضع دنیا بیچ بردیوانہ تاثیر نکر د

بیشتر ایں برق عبرت خرمین فرزا ز سونت

دنیا اور دنیا داری کا طور طریق دیوانہ پر اثر انداز نہیں ہوتا، اکثر ”اہل الجنتہ بلہم“ سادہ لوح آدمی مزے میں رہتے ہیں یہ بجلی اگر گرتی ہے تو اکثر و بیشتر اہل عقل پر ہی گرتی ہے۔ کچھ عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ تا توانی گاہے گاہے بے تکلف زیستن

زیں تعلقہا کہ داری اندکے دارستن است

ذوقی مرحوم کہتا ہے کہ:

اے ذوق تکلف میں ہے تکلف سراسر

آرام میں وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

جہاں تک ہو سکے کبھی کبھی بے تکلف زندگی بسر کرنی چاہئے تکلف کے اسباب بھی تعلقات ہیں ان سے تھوڑا سا کبھی علاحدہ ہونا چاہئے۔

اچھے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
پتھ کس ازبے تکلف زیستن آگاہ نیست

آدمی بودن خلل در عیش مردم می کند
سامانِ تعیش تکلفات کا ساز ہی ہے، اور لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے
کہ ”کو میت“ یہی ہے کہ یہ تکلفات زیادہ سے زیادہ ہوں، یہ تکلف زندگی
بسر کرنا انسانیت کے مناسب خیال نہیں کیا جاتا، یہ نظریۂ انسانیت غلط
ہے۔ یہ تکلفات خورد و نوش و پوشش میں ختم ہو جاتے ہیں ان سے بہرہ ور
تو بہائم بھی ہیں۔ انسان ان میں تکلفات پیدا ضرور کرتا ہے، لیکن خود شناسی
کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ بخود نمی رسد تا بخدا نمیرسد۔

گاؤ خراز آگہی انسان نگشتہ است بیک

آدمی گر اند کے غافل شود خسری شود
شعور و آگاہی انسان کی امتیازی خوبی ہے۔ اگر محض خورد و نوش و
پوشش کے تکلفات پر صرف ہو تو آدمیت سے بعید تر ہے، اگر انسان
خود شناسی سے ذرا غافل ہو تو گدھا بن کر رہ جاتا ہے۔

آگاہی و افسردگی دل چہ خیال است

تا دانہ بخود چشم کشود است نہال است
و ادب آنکھ کھولتا ہے یعنی پھوٹتا ہے تو درخت بن جاتا ہے،
جب تک آنکھ بند ہے افسردہ دل خود شناس نہیں ہوتا، خود آگاہ اپنے
مقام انسانیت سے واقف ہوتا ہے۔

غبارِ غفلت و روشن دلی نگر درد جمع

کجا ست دیدہ آئینہ را غنود تہا
روشن دل غافل نہیں ہوتا، آئینہ کبھی نہیں اونگھتا اور نہ سوتا ہے

اور ہمیشہ بیدار ہے۔ اس لئے غفلت کی کدورت اور روشن دلی کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

پیش کس دربار گاہ آگہی مردود نیست

صافی آئینہ با گبر و مسلمان آشناست

آئینہ کے سامنے جو بھی صورت نظر آئے ہو ہو نظر آئیگی سائینہ کو اس سے غرض نہیں کہ کوئی نیک ہے یا بد، کوئی گبر یا مسلمان، آئینہ کا کام اتنا ہے کہ بتا دے کہ تم کیا ہو، اور صحیح صورت بلام و کاست پیش کر دے گا، آئینہ سب کا شناسا ہے اور کسی کو مردود قرار نہیں دیتا، خود شناسا کبھی مردود نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کی شرح حسب ذیل شعر ہے :-

شامل است اخلاق حق یا طور خوب و زشت خلق

شخص دیں را بیدل از گبر و مسلمان چارہ نیست

دین حقیقت واحد ہے اور اصل تمام مذاہب کی ہے (وہ دینہ السبیل اما شا کرا و اما کفورا) مذاہب تمام فروغ ہیں۔ فطرتاً ہر ایک کو دین کا احساس ہے کوئی کفر کرے یا شکر یہ اختیار اسے دیا گیا ہے (لا الہ الا فی الدین) لوگوں کے طور اچھے ہوں یا بُرے اس کا اثر دین پر نہیں پڑتا، لیکن دین ان کے احساسات و جذبات پر ضرور مؤثر ہوتا ہے۔

در افتادون بروئے یک دگر دو داستان از آگاہی

زمزگاں ہم اگر ایں اتفاق افتد خواب افتد

ایک دوسرے کا لڑنا، دست و گریباں ہونا آگاہی سے بعید ہے۔

”دو عاقل را نبا شد کیں و پیکار“ آگاہی اور بیداری ہم معنی ہیں، بیداری میں زمزگاں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں، مان میں آدیزش نہیں ہوتی، خواب یا غفلت آگاہی کی ضد ہے، اگر زمزگاں ایک دوسرے پر گرتی ہیں تو خواب میں ویسا اتفاق ہوتا ہے۔

تا دل الم نہ چیند از کینہ محترز باش گرتنی از حلاوت گل کردہ میوہ اغیست
پھل میٹھا اگر دماغی ہو تو اس میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح دل
اگر کینہ سے داغدار ہو تو اس میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔
کلفت زدائی کینہ دلہا تو وضع است زین تیشہ می توان گرہ سنگ باز کرد
کینہ سے دل پر گرہ پڑ جاتی ہے اور دل سخت اور کلفت زدہ ہو جاتا
ہے، تو وضع سے یہ خرابی اسی طرح دور ہو سکتی ہے جس طرح کلہاڑا سے پتھر
توڑا جاسکتا ہے۔

از چرخ نہ ہر ابلہ نادان گلہ دارد جائی گلہ این است کہ انسان گلہ دارد
اگر گردش ایام کی شکایت ہر ایک نادان اور احمق کرتا ہے تو کہہ سکتے
ہیں کہ وہ توبہ و قوف ہیں اس لئے ان کی شکایت بے معنی ہے، لیکن جب
انسان ہی شکوہ و شکایت کرے تو جائے شکایت ہے، یعنی انسانیت اور
آگاہی اور علم و فضل ہم معنی الفاظ ہیں ان کو تو کبھی کوئی شکایت گردش
روزگار کی نہ ہونی چاہئے، جو ان کی زندگی کو تلخ بنا دے۔ لیکن جب شکایت
کریں تو پھر گلہ صحیح ہے۔ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان جو
حقیقت آگاہ ہے اگر گردش کار کا گلہ کرے تو انسانیت کی شان سے بعید ہے۔

لے بے خبر از کم خرداں شکوہ چہ لازم آدم نہ بود آنکہ ز حیوان گلہ دارد
آدمی اگر بہائم کی شکایت کرے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی "پشو" ہے۔ کم
عقل بہائم ہی ہیں اگر ان سے کوئی حرکت ناشائستہ سرزد ہو جائے تو جائے
شکوہ و شکایت نہیں آدمیت سے بعید ہے کہ ان کا گلہ کرے۔

بر بزرگان از طواف خاکساراں ننگ نیست

چرخ با آں سرکشی گردن میں گردیدہ است
اگر بزرگ خود سے تعظیم کے ساتھ پیش آئے تو ان کی بزرگی کو بڑھ
نہیں لگتا، آسمان باوجود رفعت و بلندی زمین کے گردش کر رہا ہے یعنی
"تو اضع ز گردن فرازاں نحوست"

قطعات

اصناف شعر میں سے کوئی صنف ایسی نہیں جس کو بیدل نے نظر انداز کر دیا ہو۔ کوئی بحر نہیں جس سے وہ آشنا نہیں، زمین شعر کا گوشہ گوشہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے۔ ہم نے قصائد اور قطعاً و تاریخ اور ترجیعات و مخمس وغیرہ کو چھوڑ دیا ہے۔ چند قطعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ کم از کم ایک ہی موضوع تشذیب تکمیل نہ رہے۔

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست

چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست

بحر میں تموج اور اضطراب تلاش گوہر میں ہے۔ وہ نایاب ہے حالانکہ

وہ بحر کی تہ میں صدف کے آغوش میں ہے، دوسرے مصرع میں آیہ ”اللہ نور السموات والارض“ کی طرف اشارہ ہے، یہ نور تمام کائنات کو روشن کر رہا ہے۔ مگر کائنات تو مشاہدہ ہو رہی ہے اور یہ نور بوجہ انتہائی لطافت نظر نہیں آتا، ایک تاریک مکان میں شمع روشن کی جائے تو مکان اور مکان کی ہر ایک شے نظر آئے گی۔ نور شمع پر جو اشیاء پر پڑتا ہے نظر سب سے اول پڑتی ہے مگر ہمیں اس کا شعور نہیں۔ اسی طرح کل کائنات اللہ کے نور سے روشن ہے مگر ہم اس نور کو نہیں دیکھتے اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات بذاتہ

روشن ہے، اس کو وسطی یا حسی مشاہدہ کہتے ہیں، لیکن تفکر و تدبیر سے جو عقلاً ہوتا ہے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے جس کا مذکور ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں۔

دیرانی غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
کعبہ زیں در دسیہ پوش کہ محراب کجا ست
دیر میں گبر آتش ہر وقت روشن رکھتے ہیں اور کبھی بجھتے نہیں دیتے وہ
اگنی کی پوجا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نار منظر نور یزدان ہے۔ ”صنم“ تو پتھر
کی مورتی ہے اور آگ بھی ایک مادی شے ایسی ہی ہے جیسا آب و باد و خاک
دیر اسی غصہ میں جل بھن رہا ہے کہ صنم نظر نہیں آتا، کعبہ کا غلاف سیہ ہے اور
کعبہ میں محراب نہیں جو سجدہ کی جگہ ہے، کعبہ اس بات کا ماتم کر رہا ہے کہ
محراب یعنی جہاں اور جس کی بندگی کے لئے یہ تعمیر ہوا یعنی رب کعبہ وہ
کہاں ہے، ظاہر ہے کہ دیر و کعبہ بھی سنگ و خشت کی عمارت ہے جس کی
بندگی اور عبادت کے لئے مخصوص ہیں وہ تو وہاں نہیں اور اگر وہاں ہے
تو دیر و کعبہ کی کیا خصوصیت ہے ہر ایک زمان و مکان میں ہے، سوال تو
اس ذات کے بارہ میں ہے جو مرجع کل ہے۔

اے سمندر بہوس داغ فروش، آتش کو

ماہیاں تشنہ بمیزند دم آب کجا ست

کہتے ہیں کہ آتش کدہ چونکہ ہزار ہا سال سے جل رہا ہے اس میں بھی
زندگی پیدا ہو جاتی ہے اس میں ایک جانور یا کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جس کو
”سمندر“ کہتے ہیں، سمندر ہندی میں بحر کو کہتے ہیں، آگ کی ضد پانی ہے،
اور یہ تو اہل علم جانتے ہی ہیں کہ پانی مایہ حیات ہے، بحر میں پھلیاں ہیں،
سمندر کے دل پر اس خواہش کا داغ ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ آگ کہاں
ہے حالانکہ آگ ہی سے اس کی زندگی ہے، پھلیوں کو پیاس اسی شے کی

ہے کہ سرچشمہ آب معلوم کریں حالانکہ پانی ہی میں ان کی زندگی ہے، ان سوالات کا جواب ذیل کے قطعہ میں دیا گیا ہے۔

بیدل آں گوہر نایاب سراغ بھیٹے است کہ پرسیدن نیست
وہ گوہر وہ حقیقت جس کا سراغ ہی نایاب ہے ایسا محیط یا بحر ہے کہ
چند وجہ و چوں لاکھ سوال پوچھو اس کا پتہ نہ کسی کو ملا اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔
عکس افتادہ در آئینہ ہوش گل تو ان گفت وے چیدن نیست
آئینہ شعور میں اتنا تو نظر آ رہا ہے کہ کچھ تو ہے۔

پیش بیناں بارگاہ الست پیش ازیں رہ نبرہ اند کہ ”ہست“
(سعدی)

لیکن آئینہ تو صرف عکس ہی عکس ہے
فرض کرو کہ یہ ایک پھول کا عکس ہے اس پھول کو آپ توڑ نہیں
سکتے اصل پھول جو آئینہ اور آپ کی نظر سے باہر ہے دسترس سے بھی بالاتر
ہے عکس ہی سہی مگر یہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

عجز ادراک اگر فہمیدی معنی این است کہ فہمیدن نیست
جو امر ہمارے قیاس و گمان و دہم سے بالاتر ہو اور جہاں عقل و فکر کی
رسائی نہ ہو اس کا ادراک ہم کر نہیں سکتے، اس لئے جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ
یہ حقیقت ہمارے ادراک سے باہر ہے اور اس کے فہم سے ہم عاجز ہیں تو
وہ حقیقت بلا ریب معنی تو ہے مگر فہم سے بالاتر۔

سخنہ ہا در بغل و فہم محال جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست
کائنات کا ذرہ ذرہ پتہ پتہ دفتر امکانات ہیں اور ہمارے تمام علوم
کا ماخذ یہی کتاب کائنات ہے یہ سب کچھ ہے مگر یہ درس علم معرفت کون
دے رہا ہے، اس کا فہم نہیں دو عالم میں ہر طرف اسی حسن اثری کا جلوہ مشاہد
ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وجہ ذوالجلال والا کرام نظر نہیں آتا۔

سوادِ نسخہ تحقیق بیدل وقتے دارد

دو عالم جلوہ باید خواندن و بیزنگ نمیدن
سخن طرفہ بشنیدن دارد کہ کم از معنی نشنیدن نیست
یہ عجیب بات بھی سننے کے لائق ہے کہ نہ سنا بھی معنی سے کم نہیں جو
فہم سے بالاتر ہے۔ اس حد تک تو بیدل لا ادیت کا ترانہ منج ہے۔ اس کے
بعد کہتا ہے کہ۔

احوال دیگران زچہ بر خود فسرده

بیدل ز خود بگو کہ تو ہم کم نبود
ہمارے تمام علوم معرفت غیر پر ختم ہو جاتے ہیں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے
ہیں کہ ہمارے گرو و پیش کیا ہے اور تمام طبقات کی حماک چھانٹتے ہیں۔
اپنی خودی، اپنے نفس سے ہم بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ حالانکہ
راز حیاتِ خضر سے بے فائدہ نہ پوچھ
زندہ ہے اپنے دم سے میجا کہیں جسے

جو کچھ بھی ہماری ذات سے وابستہ ہے، اس کا شعور ہمیں ہے۔ اگر
ہم نہ ہوں تو عدم ہے اس لئے سب سے مقدم تو معرفت نفس خود کی ضرورت
ہے۔ جگ بیتی تو وہ ہے جو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور ہمارے ہی تصورات
ہیں لیکن آپ بیتی، ثابت شدہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

گر ریشہ ز تخم تو آید بروئے کار بند نقابِ خرمن امکاں کشودہ
ایک بیج میں ایک درخت کی حقیقت پوشیدہ ہے جب یہ بیج ریشہ
کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کے امکانات جو پہلے پوشیدہ تھے ظاہر
ہو جاتے ہیں حقیقت انسانی وہ ہے جسے اصطلاح میں لفظ ”من“ یا ”انا“
() کہتے ہیں اور ہر ایک شخص اپنی حقیقت سے جیسا واقف ہو سکتا
ہے اس کا غیر نہیں ہو سکتا۔ اور اس حقیقت کا نشو و نما جو کچھ اس پر

منکشف ہے وہ غیر پر نہیں ہو سکتا۔ یہ اصل اصول تحقیق ہے اگر اس کا فہم ہو گیا عالم امکان پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور تمام امکانات کی حقیقت بھی منکشف ہوگی۔

برگ گلت ہزار چمن عرض رنگ و بو ست

آئینہ ”خودی“ وجہا نے نمود

تو ایک پھول ہے اور اس پھول کی ہر ایک پنکھڑی میں ہزار چمن کی رنگینی اور خوشبو سی ہوئی ہے۔ تیری ”خودی“ ایک آئینہ ہے جس میں ایک جہان منعکس ہو رہا ہے، یعنی تو خود ایک جہاں ہے، نہاں در ہر کف خاک کے جہان نیست، جہاں تو تیرے قلب میں سمایا ہوا ہے، اس لئے تیری خودی ہی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے جس کا جلوہ دو عالم ہے۔

مرزاں قسمت بست و کشا دلم و دہر

اے چشم آگہی بجہ غفلت غنودہ

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر ہم مرزاں کا اٹھا کر دیکھیں تو ایک جہاں کا نظارہ پیش نظر ہے اور اگر بند کر دیں تو سب کچھ بمنزلہ عدم ہے، یہ دلم و دہر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تیری پلکوں کے کھلنے اور بند ہونے پر موقوف ہے۔ تیری آنکھ بصر و بصیرت ہے کس غفلت میں سویا ہوا ہے۔

عالم تمام عرض پیام خود است و بس

لے شوق نالہ کن چہ از خود ستودہ

تمام عالم اپنی ہی خودی کا پیام دے رہا ہے اسے غیر کا عشق نہیں، نور ظلمت سے اور ظلمت نور کے حال سے بے خبر ہے، ہستی میں ہر ایک امکان ظہور کا طالب ہے۔ ہم اسے حسن و خوبی سے موسوم کریں یا بُرے ناموں سے یاد کریں، مدح کریں یا ذم یہ ہمارا اپنا تصور کسی شے کی نسبت ہے۔ وہ شے ہماری مدح و ذم سے بے نیاز ہے، اور اپنے حال میں مست ہے۔

ہستی میں ہر ایک شے پیامِ حق لے کر آتی ہے، یعنی جو خوبیاں اس میں
فطر تاً ودیعت ہیں اس کا اظہار کرتی ہے اور یہ باطل نہیں، ہوائیں، بشرات
ہیں، بارش کی خبر دیتی ہیں، مینہ برستا ہے تو مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے،
آگ کا خاصہ جلاتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس، ہر ایک شے اپنے ہی خواص اور
حقائق کا اظہار کرتی ہے یعنی اپنی ہی "خودی" سے واقف بھی ہے اور اس کا
مظاہرہ بھی کرتی ہے اسے غیر اور اس کے حسن و قبح سے کوئی غرض نہیں۔

فہم اگر نبود شنیدن ہم غیبت گیر و بس

نغمہ ما بسیار دارد تار موہوم نفس

اگر کوئی شخص عقل سے کام لینا جانتا ہے اور جو کچھ اسے فہم حاصل
ہے بیان کر سکتا ہے تو ایسے شخص کا کلام اس شخص کو گوشِ ہوش سے سُنا
چلے جو خود فہم سے بے بہرہ ہے۔ اگر مُنہ سے بول نہیں سکتے تو خاموشی سے
دوسروں کی سنو، اگر کان شنوائیں تو گو ایک شخص گنگ ہو اس شنوائی سے
بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اگر سمع سے بے بہرہ ہو تو زبان اسے کچھ
فائدہ نہ دیگی، وہ بول نہیں سکتا، اس لئے ثابت ہو کہ سماعت حصول
فہم کے لئے مقدم ہے، تارِ نفس موہوم ہے، ہر ایک سانس دم بھر میں
فنا ہوتا رہتا ہے، اس تارِ نفس سے بے شمار نغمات نکلتے ہیں اور ان کا تعلق
"سمع" سے ہے۔

از طلسم ما دمن بیگانہ نتوان زیستن

شوقِ مفتِ زندگیہا عشقِ اگر نبود ہوس

یہ جہاں من و تو بھی ایک طلسمی کارخانہ ہے، اس سے الگ ہو کر ہم
زندہ نہیں رہ سکتے، اور ظاہر ہے کہ جو مر گیا وہ الگ ہو گیا، اگر ہوا و ہوس
عشق کا درجہ حاصل نہ بھی کرے پھر بھی شوق سے تو خالی نہیں اور زندگی اور
لطفِ زندگی اسی ہنگامہ آرائی میں ہے خواہ یہ ہوس ہو یا عشق۔

ایک از فہم حقائق دم زنی خاموش باش

عمر با باید کہ دریابی زبان خویش را

سطور بالا میں ”نطق“ کا مذکور ہو چکا ہے۔ علم منطق صحیح خیالات کی ترکیب و ترتیب سے واقف ہونا ہے، خیالات ممکنات خارجہ کے ذہنی تصورات ہیں۔

ان تصورات ذہنی اور اشیاء خارجہ کی صورتوں میں عین مطابقت کا نام

علم الاشیاء ہے، ان صورتوں میں حقائق اشیاء رونما ہوتے ہیں۔ یہ علم حقائق

ہے، ان کا فہم بہت مشکل ہے، اور فہم کے بعد ایسے موزوں اور مناسب الفاظ

میں اس کا اظہار کہ تشکلم مخاطب کے دل میں اپنا مافی الضمیر فہم من وعن ڈال

دے۔ علم ”بلاغت“ سے موسوم ہوتا ہے، ہمارا مافی الضمیر کیا ہے؟ وہی خارجی

کائنات کا تصور، یا یوں کہو کہ یہ کائنات کے تصویری حروف ہیں۔ اور تمام

کائنات چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویریں ہی تو ہیں یہ تصویری حروف اپنے

معانی یا حقائق ہم پر واضح کر رہے ہیں، یہ تصویری حروف کائنات کی زبان

ہے۔ یہ حروف کتاب کائنات کے ہیں اور یہی ہمارے آئینہ دل پر منعکس

ہوتے ہیں ان کے معانی کی ترجمانی ہمارا قلب اپنی مادری زبان میں کرتا

ہے۔ یہ ہے ”زبان خویش“ جس کی حقیقت وہی کائنات کے تصویری حروف

اور معانی ہیں۔ اگر ہمیں اس حقیقت کا فہم ہے اور اس فہم کی صحیح ترجمانی

کر رہے ہیں تو ہمیں علم حقائق حاصل ہے مگر عموماً اس میں ہمارے توہمات

اور تمنائیں دخل دیتی ہیں اس حالت میں یہ ”ظنیات“ سے تعبیر ہوتا ہے اور

”حق“ سے دور تر ہے، بیدل کہتا ہے کہ حقائق کا فہم بلا آمیزش ظنیات بہت

مشکل ہے، ”حق“ کا مشاہدہ یا کائنات کو اسی صورت میں دیکھنا جیسی کہ وہ

ہے تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے ساتھ ہی ممکن ہے اور اس کے لئے ایک عمر چاہئے۔

روزگارے در قفائی و ہم باید تا خلق

تا دیریں صحرا بدست آری عنان خویش را

ہم عرصہ دراز تک توہمات اور ظنیات کو حق سمجھ کر ان کا اتباع کرتے ہیں۔ اس صحرائے تحقیق میں قرن ہا قرن گزر جاتے ہیں پھر کہیں جا کر ہماری عنانِ توجہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہے۔ عالم انسانی کے ذہنی ارتقا و تاریخ کی ورق گردانی کرو یہی کائنات ہے جس کی اشیاء ہمیں دیوتا اور دیویاں نظر آتی ہیں اور ان کی صورتوں کو ہم پوجتے رہے، یہی سورج اور چاند۔ دیوتا ہیں جو آج ہمارے گھر کے چرلہ ہیں، یہی کائنات ہے جو کسی وقت ہماری معبود تھی اب ہم صحیح فہم کے ساتھ مسخر کر رہے ہیں۔ اب یہ ہماری بھجارت ہے۔

درہوائی بے نشانی تا نگردی بے نشان

سخت دشوار است پے بردن نشانِ خویش را

جب تک تو اپنے نفس کی خواہشات، توہمات، ظنیات غرض سب مکروہات سے خالی الذہن نہیں ہوتا جسے اصطلاح میں ”تقوے“ کہتے ہیں تو اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا کائنات ہماری پیدا کردہ نہیں اس کے تصورات ہمارے پیدا کردہ نہیں ان کا ایک شعور ہے، فہم ہے جسے ہم اپنے کہتے ہیں لیکن ہم کچھ آپ بھی پیدا کرتے ہیں خواہ اچھا ہو یا بُرا۔

مے برہم زدن دارد قماشِ خوب و زشت

تاشناسی جنس موہوم دکانِ خویش را

ہماری دکانِ قلب کا سرمایہ اصلی تو یہی تصورات ہیں جن کا مذکور ہو چکا، لیکن مصری، یونانی، رومی، ایرانی، ہندی، ”مائی تھولوجی“ کا مطالعہ کرو آپ کو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا رولڑا بھان متی نے کتبہ جوڑا یہ سب جنس موہوم ہے اور باطل ہے حق کو ہماری قوتِ واہمہ باطل بنا رہی ہے۔ شیخ چلی نے جو اسباب اپنے تحیل میں جمع رکھے تھے انھیں حق کی ایک ٹھوکرنے پاش پاش کر کے رکھ دیا، غرض جب تک

تقوٰا! اختیار نہ کرو گے حقیقت کا فہم محال ہے۔ تیری ہستی کا سرمایہ بھی خوب زشت ہے جو مہموم ہے

ہوش اگر باشد کتاب و نسخہ در کار نیست

چشم واکردن زمیں تا آسماں فہمیدن است

دور گردیہای وہم آنسوئی خویشتمی برد

ورنہ ہر چیز کے کہ می بینی ہماں فہمیدن است

”واہمہ“ ہمیں ہر ایک وادی میں سرگزداں لئے پھرتا ہے اور ہم کائنات کے

باہر تو ہماں کے پروبال پر پرواز کرتے ہیں، ورنہ حقیقت یہی ہے جو ہماری

آنکھوں کے سامنے بلکہ اس سے بھی نزدیک تر ہے، ہمارے شعراء کا تخیل عموماً

یہی واہمہ ہے۔ صحیفہ فطرت یہی ”کتاب“ کائنات ہے جو ہماری آنکھوں

کے سامنے کھلی ہے۔ ذرہ ذرہ اس کی آیت ہے ذلک الکتاب لاریب

فیہ، اور اسی سے ہمارے تمام علوم ماخوذ ہیں۔ اس لئے اہل عقل و فکر

اسی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ”واہمہ“

ہے جو صحیح معنی میں شیطان ہے جو ہمیں دور تر رکھتا ہے اور ہم شبہات اور

دوسوئوں میں مبتلا رہتے ہیں، ورنہ جو کچھ کہ تو دیکھ رہا ہے اور دور جانے کی

ضرورت نہیں، نزدیک تر دیکھ رہا ہے یہی کچھ سمجھنے کی بات ہے۔



مقامِ بیدل

بیدل کا جو کچھ مرتبہ ہے اس کے کلام سے اس کا پتہ مل سکتا ہے ہم نے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں، ان میں اس کا حکیمانہ تفکر زیادہ تر کارفرما ہے۔ ایک خشک مضمون میں اس کے شاعرانہ تخیل نے جو لطافت اور رنگینی پیدا کی ہے وہ خاص بات ہے جو اسی کا حصہ ہے ہم چاہتے تھے کہ ایسے اشعار کا بھی انتخاب کریں جس میں زیادہ تر شعریت پائی جائے، مگر وہ ہر ایک بات میں وہ بات پیدا کرتا ہے جو دل پر نقش ہو جاتی ہے جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ چند اشعار تلاش سے ہم نے منتخب کئے ہیں، شاید ان سے اس کی بلندی فکر کا کچھ اندازہ ہو سکے، بیدل نے اکثر دو غزل، سہ غزل بلکہ چہار غزل اور شش غزل بھی ایک ہی زمین میں کہی ہے، طویل بحر میں کہنا تو اس کا حصہ ہے۔

یارب چہ بلا بود کہ تر دستی ساقی

بر خرمین مخمور نشانہ آتش تر را
شراب کوہ آتش تر کہا گیا ہے۔ آگ کا کام جلانا اور تری کا بجھانا ہے۔ ”خرمین مخمور“ میں ”خرمین“ کو ڈراگ کا ہے اور پانی کی تری اس خطرہ کو رفع بھی کرتی ہے مطلب یہ ہے کہ عالمِ اضمحلال ہے اور اضمحلال ایک دوسرے

کو فنا کرتی ہیں مگر ان میں عدل سے توازن ایسا قائم کیا گیا ہے کہ دونوں موجود بھی ہیں اور مخلوط بھی اور ایک دوسرے کے اثر کو زائل بھی کر رہی ہیں اور حمایات بھی ہیں، ساتی اصطلاح میں ذات حق تعالیٰ ہے، (و سقمہم دیہم شراباً طہوداً)

زیر باد یہ رفتم کہ بسر چشمہ خورشید

چوں سایہ بشویم ز جبین گرد سفر را
اس شعر میں چند خیالات کے اختلاط سے ایک مضمون باندھا گیا ہے، بیدل کے کلام کی طریز یہ خاص ہے ”بادیہ“ یہ خاکدان کرۂ ارض ہے، سایہ بھی اسی پر پڑتا ہے، سایہ سی شے کا ہوتا ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے انسان کا جسم بھی خاکی ہے۔ بخار کو دچہرہ کو چشمہ کے پانی سے دھویا جاتا ہے، یہ تصورات ہیں، شعر میں آیہ کریمہ (کیف مد الظل الا یہ) کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس بادیہ ہستی میں کہیں سے مسافر آئے ہیں اور اس سے گزر رہے ہیں۔ اس بادیہ کی گرد و غبار سے ہم اثناء سفر میں ضرور آلودہ ہوئے اب چشمہ خورشید پر جا کر منہ ہاتھ دھوئیں گے۔ جس طرح سایہ خورشید کی روشنی میں فنا ہو جاتا ہے اسی طرح یہ گرد بھی دور ہو جائے گی یعنی جب ہم اصل آفتاب حقیقت کی طرف رجوع کریں گے تو اس جسم خاکی کی آلودگی دور ہو جائے گی اور روحانی لطافت باقی رہ جائیگی۔ یکتائے آفرید لب خود ستائی عشق در نقطہ دہن الفی داشت میم ما
نقطہ ما، میں دو حرف میم اور الف ہیں سب سے بڑا وصف اور تعریف کسی کی یہ ہے کہ وہ یکتا ہے، بے مثل ہے، اگر ویسا ہی کوئی اس کا بے مقابل ہو تو ظاہر ہے کہ وہ وصف یکتائی قائم نہیں رہے گا۔ منہ کی صورت بھی ”نقطہ“ کی ہے عشق خود ستا ہے اپنی حمد و حدت آپ کر رہا ہے کہ وحدت یکتا ہے جیسا الف، الف نقاط کا مجموعہ ہے، ”الف“ کے معنی عربی میں یکہ و

تنہا شخص، الف تو وحدت بلا شرکت غیرے پر دلالت کرتا ہے، وحدت سے وحدت ہی کا ظہور ہو گا۔ ”میم“ بولفظ ”ما“ میں ہے الف سے پیوستہ ہے اور ایک ہی حرف ہے۔ عربی میں حرف ”میم“ کے معنی جوڑنے والی شے ”موم“ بھی یہی لفظ ہے۔ کچھ شک نہیں کہ خالق تو ذات یکتا ہے ہمتا ہے مگر مخلوق بھی یکتا ہے اور مخلوق کی یکتائی ہی ستائش یکتائے ذات الہی ہے۔ اور یہی اس کی یکتائی پر دلالت کرتی ہے، ”دہن“ کو لفظ سے تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ ریاضی میں یہ ایک مہموم شے ہے جس کا نہ طول ہے نہ عرض، ”لب خود ستائی عشق“ نے لفظ دیں میں الف وحدت کو ”ما“ کی میم سے ربط دیا ہے۔ نثنوی عرفان میں نعتیہ اشعار میں بیدل یہی خیال اور واضح کرتا ہے کہ نہ گنجدر احد غیر از احد، بیچ۔ احد“ کے دہن سے ایک حرف میم نکلا (احمد) تو وہ بھی ایک ہی ہے یعنی آنحضرتؐ کا نظیر بھی موجود نہیں، احد کا ظہور حرف دہن سے جو ”میم“ سے مل کر ہوا اور یہ احد ہے (لولاک لما خلقت الا فلا کے)۔

کشتہ آں چشم مخمورم کہ حد سرمہ اش
تاسر کوئی تغافل می کشد دنبالہ را
میں تو اس مست آنکھ کا متوالا ہوں کہ اس میں سرمہ کا دنبالہ اتنا
کچھا ہوا ہے کہ کوئے تغافل کی حد سے مل گیا ہے
بازرگست چہ عرض تمنا دہد کسے دیدیم سرمہ کہ نگاہ شد صدائے ما
محاورہ میں ”سرمہ کھانا“ سے مراد کسی کو چپکا کرنا ہے کہتے ہیں کہ سرمہ کا
اثر یہ ہے کہ اگر کوئی کھلے تو گلابیٹھ جاتا ہے اور آواز نہیں نکلتی۔ سرمہ کا
تعلق آنکھ سے ہے۔ زرگس استعارہ میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر یہ ہے کہ
تیری آنکھوں کے سامنے اپنی خواہشات کا اظہار کوئی کیا کرے ہم نے ان
آنکھوں میں سرمہ دیکھا تو کچھ بول نہ سکے ہماری صدائے نگاہ بن گئی، یعنی بول نہ

سکے دیکھتے رہے، اور سمجھ گئے کہ سرمہ کا ایسا یہ ہے کہ دیکھو اور چپکے رہو، اللہ تعالیٰ بصیر ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ بھی جو گڑبچکا اور گڑبڑنے والا ہے اس کے حضور عرض تمنا کی حاجت ہی کیا ہے، جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔

عدم گفتن کفایت می کند تا آدم و حوا

دگر اے ہرزہ دیں وہم طو مار نسب کشا
آدم و حوا کی اولاد تمام عالم انسانی ہے اور آدم و حوا کا نسب عدم سے شروع ہوتا ہے (لم یکن شی من کوذا)
ایں آدم و حوا شرف نسبت ہستیت

بیدل نتواں پیش عدم نام نسب برد
خلقے، امدادے، مدارے، نیازے خدمتے

اے زمعنی غافل آدم شو بایں مقدار ما
انسانیت کا تقاضہ ہے کہ خلق سے پیش آئے، جو مخلوق ہیں ان کی
امداد کرو، دلجوئی کرو، انکسار سے کام لو، اور بزرگوں کی خدمت کرو۔

سر شکم، دود آہم، شعلہ ام، داغ دلم بیدل
چو شمع از حاصل ہستی سراپایم ہمیں دارد
شمع آنسو، دھواں، شعلہ، داغ سب کچھ ہے، میرا سراپا شمع کی طرح
ہستی سے یہی کچھ حاصل کر رہا ہے۔

داغ زیر پا و آتش بر سر و در دیدہ اشک

شمع را در انجمن بودن چہ جائے خرمیست
اس انجمن ہستی میں ہم شمع کی مانند ہیں آنکھ میں آنسو، سر پر آگ،
پاؤں آبلہ پا، اس حال میں ہمیں خوشی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔
دل وفا، بلبلی نوا، واعظ فسوں، عاشق جنوں
ہر کسے در خورد ہمت یشہ سدا می گنہ

ہر کسے را بہر کارے ساختند، ہر ایک شخص اپنی فطری استعداد کے مطابق اور قابلیت کے مناسب عمل کرتا ہے (کل شی یعمل علی شاکلتہ)

رنگ حال پہنچ کس برینچ کس روشن نشد
شمع گل کردند یا راں یا ز محفل بردہ اند
کسی پر کسی کا حال روشن نہ ہوا کہ کس رنگ میں ہے معلوم ہوتا ہے
کہ اس محفل ہستی میں یا تو یاروں نے شمع ہی بجھا دی ہے یا محفل سے باہر
لے گئے ہیں شمع ہوتی تو روشنی میں ہر ایک کا رنگ روپ بھی روشن
ہوتا۔

در سراغ عافیت بیہودہ می سوزی نفس
زیں بیاباں رفتگاں باخوش منزل بردہ اند
منزل تو عافیت ہے جب مسافر دوڑ دھوپ کے بعد منزل پر پہنچ
جاتا ہے تو آرام و آسائش سے بیٹھ جاتا ہے اس منزل عافیت کا سراغ
اس زندگی میں تو ملنے سے رہا۔

مدعا از ہستی مایس ہمیں آزار بود
ورنہ در کینچ عدم آسودگی بسیار بود
اس بیاباں ہستی میں تو بے فائدہ عافیت کی تلاش میں سعی کر رہا
ہے۔ جو بھی اس بیابان سے باہر نکلے وہ اس منزل کو اپنے ساتھ لے گئے
یعنی عافیت اور آسودگی قبر ہی میں نصیب ہوگی۔

کردم از بہر کہ دریں خانہ سراغ تحقیق
گفت از آمدنت پیش ہمیں جائش بود
اس خانہ ہستی میں جس کسی سے میں نے ”تحقیق“ کا پتہ پوچھا تو جواب
یہ ملا کہ تیرے آنے سے پہلے اسی جگہ تھی یعنی تیرے آنے سے پہلے تو یہاں تھی

تو آیا وہ گئی ”تحقیق“ کے معنی ہیں حق شناسی، بیدل کہتا ہے کہ میرے
زمانہ میں رحلت فرما چکی تھی۔

از ترحم تا مروت وز مدار تا وف
ہرچہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفته است

گاہ در چشم تر و گہ بر مژہ گاہے بخاک
ہچو اشک نا امید سی خانہ بردوشیم ما
انسان عالم یاس میں روتا ہے، میں بھی آنسو کی طرح کبھی دیدہ تریں،
کبھی مڑگاں پر، کبھی خاک پر آ رہتا ہوں، اسی طرح خانہ بدوشی میں عمر
گزر گئی، آخر خاک میں مل گئے۔

بخاموشی توان شد این از ایذائی کج بحثاں
نفس وز دید نست اینجا فسوں نیش عقربہا
کہتے ہیں کہ اگر بچھو کاٹے تو دم بند کر لینا چاہئے، زہر اثر نہیں کرتا،
جس طرح ”بچھو“ کر دے ”ہے اسی طرح کج بحث بھی بچھو ہی ہوتے ہیں ان کے
ڈنگ سے بچنے کا علاج یہی ہے کہ خاموشی اختیار کر دو۔
ہر کہ آمد مشیت خاک کے بر سر اور ریختند

تاکے آخر گرد این ماتم سرا خواہد شکست
جو بھی اس خاکدان میں آیا اس کے سر پر آخر مٹھی بھر مٹی ڈالی، نہ معلوم
اس ماتم سرا کا بھار کب بیٹھے گا آدمی مڑتا ہے تو اس کو سپرد خاک کرتے ہیں اور
ایک مٹھی بھر مٹی ہر ایک شخص کا رِ ثواب سمجھ کر ڈالتا جاتا ہے یہاں تک
کہ قبر میں جاتی ہے خدا معلوم یہ دنیا ماتم سرا کب تک قائم رہے گی۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی منظر
کہ براں مکاں چو قدم نہی خم گردشے خورت سرت

ہر ایک شخص کے سر میں اقتدار اور علو کی ہوا سائی ہوئی ہے اس میں کچھ قباحت نہیں کیونکہ ارتقاء پسندیدہ امر ہے مگر ایسی بلندی تک جانا کہ سر چکرائے مذموم ہے، عموماً پست فطرت سفلے جب کسی بلند مرتبہ پر پہنچتے ہیں تو ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہتا وہ لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور جتنی بلندی پر آپ جائیں اتنی ہی چھوٹی پستی پر ہر ایک شے نظر آئے گی۔

بگذر ز غناتنا نشوی دشمن احباب اوّل سبق حاصل زر ترک سلام است
بیدل اکثر اشعار میں اضداد جمع کرتا ہے اور ان سے ایک بات پیدا کرتا ہے اس شعر میں احباب یعنی دوست اور دشمن اور حاصل اور ترک اضداد ہیں۔ عام دیکھنے میں آتا ہے کہ اہل زر اپنے دوستوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔

بیدل اکثر سنگلاخ زمین میں بھی اسی طرح بے تکلف چلتا ہے جس طرح بحر طویل میں شناوری کرتا ہے۔

شوکت ملک و ملک تا اوج اقبال فلک

جملہ پامال است ہر گہ میفشانی پشت دست

از کفم بیدل نمیدانم چہ گل دامن کشید

کویندامت کردم آخر از غوانی پشت دست

پہلے شعر میں پشت دست جھاڑنا یعنی دست بردار ہو جانا اور دوسرے شعر میں ندامت سے ہاتھ کاٹنا اسی طرح اس غزل میں اس نے ”پشت دست“ خوش اسلوبی سے نبھا لیا ہے۔ اسی طرح ”تیغ است ردیف“۔

غنجہ نیست کہ ز رخ ز تبسم نغورد

با خبر باش کہ انداز شگفتن تیغ است

مصرع تازہ کہ از بحر خیال موجیست

دوست را آب حیات است دشمن تیغ است

مثل ما و قنا موج و جاب بست ایں جا
 سرزقن نیست کسے را کہ بگردن تیغ است
 جاب کو سرے اور موج کو تیغ سے کیا اچھی تشبیہ ہے۔ اور امر واقعہ بھی
 یہی ہے کہ امواج میں جاب اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کٹے ہوئے سر۔
 غالب مرحوم کا ایک شعر ہے کہ
 تیغ تو ناز و بسر فشانے عاشق موج ہی بالدار جاب شکستن
 یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ لفظ ”جاب“ کو بیدل نے اکثر اشعار میں باندھا
 ہے۔ مثلاً ”موج ہی بالدار جاب شکستن“ کے تحت ہم چند اشعار پیش کر چکے ہیں۔ غالب
 مرحوم کی کلیات فارسی شروع سے آخر تک اس غرض سے دیکھ ڈالی، کہ
 مرحوم نے یہی لفظ کس مضمون میں باندھا ہے۔ تین شعر لے ایک تو اوپر
 درج کیا گیا دواور ہیں۔

وقت است کز روانی مے ساقیان بزم
 پیمانہ را جباب لب آب جو کنند
 تیسرا شعر بیدل کے اس شعر کے بعد پڑھے۔
 بہ بحر عشق ہر موج از جابے سرخوش است اما
 سرے کو تا بعرض گردش آرد ساغر تیغش
 تیغش کی زمین کتنی سنگلاخ ہے۔

جاب از فرق عشاق است و موج از تیغ خوابش
 شہادت گاہ ارباب وفادریا ست پنداری
 (غالب)

مثل ما و قنا موج و جاب بست ایں جا
 سرزقن نیست کسے را کہ بدامن تیغ است
 (بیدل)

ممکن ہے کہ تلاش سے ایک دو شعر اور بھی مل جائیں مگر مجھے تلاش سے
یہی تین شعر ملے۔ بیدل کہتا ہے کہ
گر آرزو شکندی شود عمارت دل

شکست موج بود باعث بنائے جناب
غالب کہتا ہے کہ (موج بھی بالدار جناب شکست) بیدل نے دل کو
جناب سے تشبیہ دی ہے اور موج میں اضطراب ”ہوا“ کا پیدا کردہ ہے
اگر یہ ٹوٹے تو جناب کی صورت پیدا ہوتی ہے ہوا دھوس محو ہو تو عمارت
دل ہے۔

بیدل نے ”جناب“ کو جن اشعار میں باندھا ہے علاوہ مثنوی طور
معرفت ان کی تعداد بہت ہے اور انہی سے ایک دیوان مرتب ہو سکتا ہے
میں نے ایک صد اشعار جمع کئے تھے۔ اس مقام پر انھیں درج کرنا موجب
طوالت ہے ایک غزل کی ردیف ہے ”زیر پوست“ دو شعر ملاحظہ ہوں۔
از لب خاموش نتوانم حریف عشق شد

چند دار دایں جناب پوچ عمارت زیر پوست
چوں جناب از پیکر حیرت سرشت ما پیرس
نقش ما بے پردہ پنہاں ست عریاں زیر پوست
اس مضمون کا ایک شعر ہے کہ

کہ دار دے سرو سامانی وضع جناب من
برنگے گشتہ ام عریاں کہ گوئی پیر من دادم
باس اور عریانی کا تخیل ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

نشہ حجاب خیال غبار جسمانی جناب راتہ پیرا ہفتست عریانی
جس طرح جناب پیرا ہن کے نیچے بھی عریاں نظر آ رہا ہے اسی طرح
ہمارا خیال یا دل ہے کہ غبار جسم خاکی کے پردہ میں بھی عریاں ہے جناب

اور عریانی افساد ہیں گرد و غبار ہر ایک شے کی صورت پوشیدہ کرتا ہے
جسم خاکی بھی یہی گرد و غبار ہے اصل فنے دل ہے۔

نہی گنجم بعالم بسکہ از خود گشتہ ام فانی

جہاں را لباس بحر تنگ آمد بعریانی

مکان وز ماں کی قید میں ہر ایک شے معین اور محدود ہے، اگر یہ حدود
ٹوڑ دئے جائیں تو ہر ایک شے آزاد غیر محدود ہے، عالم تو انہی حدود اور
حجاب سے بنا ہے جس میں ہم بھی مقید ہیں اگر ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے
تو آزادی ہے۔ اسی تخیل کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔

زیرِ اہن بروں آئے شکوے نیست عریانی

جنوں کن تاجا بے را لباس بحر پوشانی

”جنوں“ میں کپڑے پھاڑتے ہیں، لباس زینت اور شکوہ کی شے
ہے اور عریانی اس کی ضد ہے مگر بیدل کہتا ہے کہ عریانی بے شکوہ نہیں لباس
تعیّنات کو پھاڑ کر اپنی حقیقت کو عریاں کر دے اگر حجاب اپنے لباس تعین کو
پھاڑ دے تو ظاہر ہے کہ بحر کا لباس پہن لے گا یعنی خود بحر ہو جائے گا (علیٰ
کل شئی محیط)

زیرِ اہن بروں آ، تا یہ بینی دستگاہ خود

حجاب آئینہ دریا ست از شریف عریانی

دریں دریا کہ عریانی ست یکسر سازا مواجش

حجاب ما بہ زیرِ اہن رسید از چشم پوشیدن

حجاب از زیرِ اہن آئینہ داری می کند روشن

پوشش ساختہ تا ایں قدر دیدند عریانم

جب ہم آئینہ کو عیاں دیکھنے کے لئے اسے دیکھیں تو ہماری صورت خود بخود اس میں منعکس ہوگی جو اس کی پوشش بن جائے گی۔ اور پوشش محدود شے پر ہوگی، یہی کیفیت رونما ہوتی ہے جب ہم اپنے آئینہ قلب میں نظر کرتے ہیں ہم غیر محدود ہونے پر بھی محدود دکھائی دیتے ہیں۔

دیدہ داری چہ می پرسی ز جیب و دامنم
چوں جاب از شرم عریانی عرق پیرا ہنم
”عرق پیرا ہن“ کیسی لطیف ترکیب ہے شرم کے مارے پانی پانی ہونا محاورہ ہے جیب و دامن سے مراد سرمایہ داری ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ سرمایہ ہستی میرے جیب و دامن میں کتنا ہے، تو دیکھ رہا ہے کہ شرم ”نیستی“ کی وجہ سے عرق پیرا ہن ہوں۔

ایک اور مشکل زمیں کی ردیف ”زنجیر پاست“ ہے۔

چوں جابم الفت و ہم بقا زنجیر پاست
خانہ بردوش طبیعت را ہوا زنجیر پاست

آدمی گھر بنا تا ہے تو رہائش اور آسائش کے لئے جو باقی رہنے والی ہو، ہوا میں قلعہ تعمیر کرنا اُمید موہوم سے تعبیر ہوتا ہے جاب نے بھی ایک خانہ کی صورت اسی ساز و سامان ہوا سے بنا رکھی ہے بام خانہ کے اوپر ہوا ہی ہوتی ہے ”وہم“ کی بھی کچھ حقیقت نہیں ہوتی مطلب شعریہ ہے کہ ہم بقا کے طالب ہیں اور انہی تقیدات و تعینات میں ہم بقا پاتے ہیں یہ خام خیال ہے لیکن وہم کا کرشمہ ہے کہ اسی کو پختہ کئے ہوئے ہیں کہ دنیا میں نہیں تو عاقبت میں ضرور فرداً فرداً اسی نعین کے ساتھ دائمی زندگی ملے گی یہ ہوا ہوس ہے، یہ وہم ہے، جاب نے نو آخر ٹوٹنا اور پھوٹنا ہے، اگر بقا کی طلب ہے تو محیط میں محویت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس میں تیری انفرادی خودی محو ہو جائے گی۔

غریب بجز ز فکر جناب مستغنی است
 رسیدہ ایم بجائے کہ بیدل آنجا نیست
 ہستی و عدم میں جو ربط ہے وہ اسی فردیت میں مفہوم ہو سکتا ہے
 اس لئے بیدل کا مشورہ ہے کہ ”زیں دو مصرع دور گزرا ند کے پیوستہ
 باش“

از ہوا برپا ست بیدل خانہ وہم جناب
 در لباس ہستی مابجز نفس یک تاز نیست
 زندگی میں سکون نہیں اس دنیوی زندگی میں جو ہم ایک دم ٹھہرے
 ہوئے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ
 یک نفس ساکن و امان جناب ہم امروز
 ورنہ چوں آب رواں است ہماں پیشہ ما
 ز بسکہ می برم افسوس ازیں میط نہ امت
 جناب آبلہ دار و چو موج سودن دستم
 کفِ افسوس ملتے ملتے ہاتھوں میں چھالے اس طرح پر گئے جس
 طرح موجوں میں جناب یہ پھپھولے تو ہاتھ کے ہیں پاؤں کے چھالے
 ملاحظہ ہوں۔

رہرو از رنج سفر چارہ نہ اربیدل موج دایم ز جناب آبلہ پا دارد
 اس شعر میں جناب و موج کو مسافر اور جادہ سے تشبیہ دی ہے
 منزل دل ہے۔

در طلب گاہ دل چو موج و جناب منزل و جادہ ہر دو در سفر است
 اس شعر میں جناب کو ”جرس“ کا رواں سے تشبیہ دی ہے اور قافلہ
 کو موج سے۔ بے جنبش دل راہ بجائی نتواں برد
 یکسر جرس قافلہ موج جناب است

بیدل کے بعض اشعار میں ”مبالغہ“ ہے اور یہ ایک صنعت ہے مگر وہ مبالغہ میں بھی ”واقعیت“ ہی بیان کرتا ہے۔

بدل شکستہ ازیں چمن زدہ ایم بال گزشتنی

کہ شتاب اگر ہمہ نوحں شود نرسد بگرد رنگ ما

”شتاب“ اور ”درنگ“ اخذ اد ہیں، جو شخص دل شکستہ ہو اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اس باغ دنیا سے گزر گیا۔ اور قیاس ہو سکتا ہے کہ میں کتنا آہستہ آہستہ رُک رُک کر گذرا اس لئے بہت دیر سے گندا مگر واقعہ یہ ہے کہ ”درنگ“ اتنا تیز رفتار تھا کہ خود ”شتاب“ اگر سرتاپا سعی ہو تو اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا عموماً دنیا سے جانے وقت دل شکستہ ہی ہوتے ہیں اور کون مرنا چاہتا ہے مگر دنیوی زندگی کیلئے ایک عرصہ ہے جس کا فاصلہ مڑگاں سے مڑگاں تک ہے آنکھیں کھلی ہیں تو زندہ ہے بند ہوئیں تو مردہ۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

سایہ ام را میتواں چوں زلف خویاں شانہ کرد

بسکہ طبع من بصد فکر پریشاں آشناست

نستم آگہ چہ گل می چنیم از باغ جنوں

ایں قدر دانم کہ دستم با گریباں آشناست

بیدل ایں محفل نہاں در گریہ شمع است و بس

داغ آں زخم کہ بالب مائی خندان آشناست

بیدل کی نازک خیالی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا

چاہتا ہے ایک کیفیت ہے جو ذہن میں اس کے اشعار کے الفاظ

پیدا کرتے ہیں، محبوب کی زلفیں بھی پریشان ہیں اور ان کو سنوارنے اور ہموار کرنے کے لئے شانہ کی ضرورت ہے، اسی طرح میری طبع میں سینکڑوں

پریشان خیالات ہیں جو میرے وجود کا ایسے ہی جزو ہیں جیسا میرا سایہ، مگر سایہ میرے جسم سے جدا ہے اور یہ پریشانی ہے۔ خیالات کا اظہار حروف میں ہوتا ہے اور خیالات اور حروف میں ایسی ہی مماثلت ہے جیسی جسم اور سایہ میں اس لئے میرے سایہ کو بھی اسی طرح شانہ کی ضرورت ہے جیسے محبوب کی زلف پریشان کو۔

”گل چینی“ کے معنی فائدہ اٹھانا، گل کا گریبان بھی تار تار ہوتا ہے، اس کی پنکھڑیاں جدا جدا ہوتی ہیں اور جنون میں بھی کپڑے پھاڑتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغ جنوں کی سیر سے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میں کیسا حاصل کر رہا ہوں یہ ”تجامل عارفانہ“ ہے، اتنا جانتا ہوں کہ میں دست و گریباں ہوں یعنی یہی گل چینی کر رہا ہوں۔

مقطع میں نازک خیالی اور بلندی فکر و نوں جمع ہیں ظاہر ہے کہ محفل کو روشن شمع کر رہی ہے۔ لفظ ”نہاں“ یعنی پوشیدہ روشنی کی ضد ہے۔ اضداد جمع کرنا بھی صنعتِ شعر ہے، شمع نہ روئے تو روشن بھی نہیں ہوتی، اس لئے محفل کی رونق کا از شمع کے ایک گریہ میں مضمحل ہے، مجھے تو اس زخم کے لبوں پر رشک آتا ہے جو خندہ سے واقف ہے۔ زخم کا ٹنڈ کھلا ہو تو وہ خندہ مماثلت ہے کہ ہنسی کے وقت لب کھل جاتے ہیں لفظوں میں زخم کا کھلنا بیان نہیں کیا لفظ ”خندہ“ سے یہ بات پیدا کی ہے، خندہ اور گریہ اضداد ہیں، لیکن خندہ تو بوجہ مسرت ہوتا ہے اور گریہ بوجہ غم، زخم کا خندہ مسرت کی وجہ سے کیسے ہو سکتا ہے مگر شعر میں یہی بات پیدا کی گئی ہے کہ دنیا تو غم و الم کی ماری شکوہ و شکایت و گریہ و زاری کرتی ہے اور جو اسباب گریہ و زاری کے موجب ہیں وہی عشاق کی فرحت و انبساط کا باعث ہیں کہ زخم خوردہ ہیں اور ہنستے ہیں، یہاں تک تو شعر کا مفہوم لفظی ہے، لیکن بیدل اس سے ایک کیفیت پیدا کرتا ہے، کہ شمع میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں، گریہ و زاری بھی

بیدل

ہے، وہ اہل بزم کے حال پر ہے اور اسی غم میں گُل رہی ہے۔ آگ میں جل رہی ہے اور داغدار بھی ہے، محفل کو روشن کر رہی ہے اس کا معاوضہ اسے داغ ہی ملتا ہے، لیکن وہ گلریز بھی ہے اور گل زخم خوردہ لب خنداں ہے۔ یہ مثال ان مصلحان بالخصوص انبیاء و رسل پر صادق آتی ہے جو ہر ایک ممکن مصیبت میں لوگوں کے بھلے کے لئے مبتلا ہوتے ہیں اور بخوشی خاطر برداشت کرتے ہیں، چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے کہ

مرگ صاحب دل جہانے را دلیل کلفت است

شمع چوں خاموش گردد داغ محفل می شود

صاحب دل ہی بزم ہستی کی رونق کا سبب ہیں جب یہ شمع خاموش ہو جاتی ہے تو محفل بھی تاریک ہے۔

نیست نقش پا بگلزار خرامت جلوہ گر

دفتر برگ گل از دست بہار افتادہ است

”نقش پا“ افتادہ ہوتا ہے، تیرے خرام میں چمن کی رنگینی ہے۔ تیرا نقش پا کیا ہے ادراق گل کا ایک دفتر ہے جو بہار کے ہاتھ سے گر کر بکھر رہا ہے، یہ تو ہے نغفی مفہوم، ہم بیدل کے نظریہ ہستی پر بحث کر چکے ہیں کہ کثرت جو ہم کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں وحدت ہے جو مختلف صورتوں میں رونما ہے، اور صورتیں نقوش ہیں۔ مگر یہ صورتیں کتنی حسین ہیں کتنی دلکش ہیں، یہ حسن یہ رنگینی جو ان میں مشاہدہ ہوتی ہے وہ عکس اسی حسن ازلی کا ہے جو بیرنگ ہے، ”نقش پا“ خاک پر نمایاں ہوتا ہے، اور یہ انسان خاکی ہے، یہ نقش اور اس کی چمن بندی انسان ہی ہے۔

دوستان ظلمے بحال نامرادم رفتہ است

داشتم چیزے و من بودم ”زیادہ رفتہ است“

کتنا تازک خیال ہے، کتنا لطیف شعر ہے، کتنا دقیق مضمون ہے، یارو میری حالت قابلِ رحم ہے کتنا ظلم مجھ نامراد پر ہوا ہے (ربنا ظلمنا انفسنا) میرے پاس ایک چیز تھی اب بھول گیا کہ وہ کیا تھی، کتنا تجاہل عارفانہ ہے جب یہ گراں قدر شے میرے پاس تھی میں ”باخود“ تھا، ”من بودم“ اب ایسا بیخود ہوا ہوں کہ خودی کھو بیٹھا، یہ ”من“ یا ”انا“ ہے جس پر بیدل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

شکر اللہ خاں کے ہاں محفل شعر و ادب گرم تھی، ہم عصر شعرا میں ناصر علی بھی موجود تھا، بیدل نے ابک غزل پڑھی۔ مطلع ہے :

نشد آئینہ کیفیت ما ظاہر آرائی

نہاں ماندم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

ناصر علی نے اعتراض کیا کہ معنی تابع لفظ ہے، جب لفظ ظاہر ہے تو معنی بھی ظاہر ہیں۔ بیدل نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جس معنی کو آپ لفظ کے تابع سمجھ رہے ہیں۔ ”اُن نیز لفظے بیش نیست، اما رنجہ من چیست ہی معنی است پہنچ لفظے درنی آید، مثلاً صفت انسان کہ بایں ہمہ شرح و تفصیل، کہ در کتب مندرج است پہنچ مکشوف نگردیدہ“ ناصر علی چپکا ہو رہا مطلب یہ ہے کہ ”من“ جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے معنی دار وہ کہ در گفتن نمی آید۔

بیدل کے اشعار میں جو تخیلات کا زفر ماہیں ان سے بہت خیالات اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اسی شعر سے یہ تخیل بھی اخذ کیا جاسکتا ہے۔

یاد نہیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نیاں ہو گئیں

اسی غزل کے چند اشعار اور بھی ملاحظہ ہوں، ہر ایک فرد ہے۔

قل وسواس است چشم من دریں عبرت سرا

پچھو مرثاں عمر در بست و کشاد مرفقہ است

بے نفس در ملک عبرت زندگانی می کنم
 خاک برجا مانده است امروز بادم رفته است
 سیر گل نذر جنون بے دماغی کرده ام
 پیش پیش رنگ و بو اعتماد رفته است
 بر خیال خلد بیدل ز اہداں رانا ز ہفت

ایک ازین غافل کریں ویرانہ آدم رفته است
 قفل او چشم میں نشیب اور مڑگاں کے ساتھ بست و کشاد، گویا یہ کلید
 ہے جو قفل چشم کو کبھی کھولتی اور کبھی بند کرتی ہے اسی بست و کشاد میں
 اسی توڑ جڑ میں دوسو سوں میں عمر بسر ہو رہی ہے، جب دم ہوا ہو جائے تو
 مٹی میں ہماری مٹی ہی باقی رہتی ہے اور جو بے نفس آدمی ہیں ان میں بھی
 ہوا و ہوس نہیں ہوتی، کیا بیدماغی ہے کہ رنگ و بو کی طرح اعتماد بھی
 اٹھ گیا، جہاں آدمی نہ ہو ویرانہ ہے، جنت بھی خانہ بے آدمی ہے، زاہد و
 کو آدمیت سے کچھ نسبت نہیں، ورنہ طالب جنت کیوں ہوتے۔
 ایک غزل کا مطلع ہے۔

دی ترنگے از شکست ساغرم گل کرد و ریخت
 شش چہت کیفیت چشم ترم گل کرد و ریخت
 اس غزل کی ردیف ”گل کرد و ریخت“ ہے اور قافیہ ساغرم،
 ترم ہے، اس غزل کا ایک شعر ہے کہ
 شب چو شمع وعدہ دیدار جدا آتش نشاند
 تا سحر آئینہ از خاک ترم گل کرد و ریخت

رات بھر وعدہ دیدار کی آمید پر شمع کی طرح انگاروں پر لوٹتے رہے،
 دیدار اور آئینہ میں مناسبت ہے، رات تو اس طرح گزری صبح ہوئی تو
 شمع بھی جل کر خاکستہ ہو چکی تھی، لفظ گل نے ایک قطف پیدا کر دیا ہے،

شمع صبح دم گل ہو جاتی ہے یعنی بجھ جاتی ہے، اور شمع صبح تک گلگریزی کرتی رہی، میں شمع کے گل جھاڑتا رہا کہ روشن رہے۔

کوہکن در تلخ کامی جوئے شیر ایجاد کرد

برزبان تیشہ گوئی نام شیریں رفتہ است

شیریں و فریاد کا قصہ مشہور ہے۔ فریاد کی عمر تو تلخ کامی ہی میں گزری مگر زبان تیشہ پر شیریں کا نام تھا کہ جوئے شیر بہادی ”جوئے شیر کوڑن“ محاورہ ہے یعنی ناممکن کام کے لئے سعی بے حاصل ہے، اگرچہ فریاد کی کوشش بھی بے فائدہ ہی تھی مگر اس میں بھی ایک ذائقہ تھا وجہ یہ ہے کہ شیریں کا نام درمیان تھا۔

ذوق وفای وعدہ ات از دل نمیرود

قاصد ثمر نبود کہ گویم رسید و رفت

اس شعر میں لفظ ”رسید“ میں لطف پیدا کیا گیا ہے۔ ثمر کے ساتھ معنی پختگی ہے، پھل جب پکتا ہے تو گر جاتا ہے ”رسید و رفت“ ”قاصد“ کے ساتھ ”رسید و رفت“ یہ کہ آیا اور گیا۔ مطلب شعر یہ ہے کہ قاصد نے جو وعدہ دیدار سنایا تو اس اُمید پر کہ ضرور وفا ہوگا کچھ ایسی لذتِ دل محسوس کر رہا ہے کہ یہ احساس دل سے نہیں جاتا اور نہیں جائے گا، یہ قاصد جو اس خاص مقصد کا حامل ہے پھل کی طرح نہیں کہ ”رسید و رفت“ یعنی یہ مقصد بالذات مستقل ہے، عارضی نہیں، بات بھی یہی ہے کہ اس وعدہ دیدار پر خواہش میں ہوں زندگی ہے۔

گفتم رموزِ مطلب ہستی بیان کنم

تا برزباں رسید سخن لب گوید و رفت

میں نے چاہا کہ اسرارِ ہستی کے مطالب بیان کروں، ابھی یہ بات یعنی میرا کہنا کہ ”رموزِ ہستی بیان کرنا ہوں“ لبوں تک آئی تھی کہ کٹ

گئی، اتنا کہنا ہی ادھورا رہ گیا، اصل سخن رموز ہستی تو دل کے دل ہی میں رہے، یعنی یہ کہنے سننے سے باہر ہیں۔

گر ہر حرف حق است آندم کہ گفتی باطل است
ہر چہ بیروں آداز لب خارج آہنگ ل است
عمریست سراغ دل گم گشتہ ندارم

یار بیکجا این ورق ازد فتر من ریخت
ایک عمر گزر گئی اور مجھے دل گم گشتہ کا سراغ نہ ملا۔ خدا معلوم میرے دفتر ہستی سے یہ ورق کہاں گرا۔

چگونہ عسرا قامت کند براہ نفس

گرہ نمی خورد این رشته بسکہ کوتاہ است

نفس کو رشتہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس رشتہ سے زندگی والبتہ ہے۔ لیکن یہ رشتہ اتنا کوتاہ ہے کہ اس میں گرہ نہیں دی جاسکتی ”گرہ کو اقامت سے تعبیر کیا ہے، ویسے ہی تار نفس کوتاہ ہے۔

نہ لفظ دائم و نہ معنی این قدر دائم

کہ اگر سخن ز تو باشد جواب دشوار است

لفظ و معنی سے ہی متکلم کا مافی الضمیر واضح ہوتا ہے۔ لیکن بخند و چہ وچوں کا جواب نہیں اگر ”ذات“ باری کے متعلق ہو۔

نقش ہستی جو بخار دقت نظارہ نیست

ذره را آئینہ گر ہست چشم روزن است

فضا میں ذرات نظر نہیں آتے مگر روزن میں سورج کی کرن پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی کیفیت نقش ہستی کی ہے کہ اس کا مشاہدہ جزوی تنگ تر محدود ہی میں ممکن ہے مثلاً برقی تمام فضا میں موجود ہے اس کا علم ہمیں نہ ہوتا اگر اس کو ققمقہ کی تاروں میں نہ لاتے، ذرہ کو چشم

روزن ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ فہم ہستی کتنا دقیق ہے۔
 خموشی نالہ می گرد و مہر سید کہ آں نا آشنا بیگانہ کیست
 یہ مت پوچھو کہ وہ نا آشنا کس کا آشنا نہیں ہے، یعنی سب کا آشنا
 ہے بادہود اس کے کہ آشنا ہے، کوئی اس سے واقف نہیں ہے، اگر
 پوچھو گے تو میں جو اس حقیقت سے واقف ہوں اور خموش ہوں بیانگ
 دہل کہوں گا کہ

معشوق من بہ شیوہ ہر کس برابر است
 باماشراب خورد و بزابد، نماز کرد
 (حافظ)

شعورم رنگ گرداند از کہ پرسم
 ”ز خود رفتن“ رہ کا شانہ کیست
 اس شعر میں بیدل نے اضماد سے ایک بات پیدا کی ہے، شعور اور
 لاشعور اضماد ہیں، شعور خودی کے ساتھ ہی ممکن ہے کسی راستہ کا علم شعور
 کے ساتھ ہی ہوتا ہے، لیکن جب راستہ کا نام ہی ”از خود رفتن“ یعنی
 بیخودی یا بے شعوری ہو تو شعور کیا بتائے گا؟ میں نے اس راستہ کی
 نسبت شعور سے دریافت کیا تو اس کا رنگ فنی ہو گیا، اس شعر میں
 بیدل نے خودی اور بیخودی کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم کافی
 بحث بحوالہ بیدل کر چکے ہیں۔

گر بہ تحسین نکشاید لب یا رواں برجاست
 در نیستال قلم معنی ماشکر داشت
 مٹھاس سے لب چمٹ جاتے ہیں قلم کو بھی ”نے“ کہتے ہیں گستاکی
 پوری پوری قلم ہے اور اس سے شکر پیدا کی جاتی ہے قلم کا جوف نے کی
 طرح خالی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل قلم حضرات اگر داد تحسین نہ دیں

تو بچا ہے کیونکہ جن معانی کا اظہار میں کر رہا ہوں وہ تو شکریں، اس کی
مٹھاس سے لب بند نہ ہوں تو کیا ہوں۔

ہر چہند کہ عنقا ز خیال تو بروں است

ہر رنگ کہ داری بہ نظر نقش پراوست

اگرچہ ذات ہاری تعلق تیرے خیال و قیاس و گمان دوہم سے
بالا تر ہے مگر جو بھی رنگ جو بھی صورت تو دیکھ رہا ہے اسی کے پر کا
نقش ہے۔

سواد نسخہ تحقیق بیدل دقتے دارد

دو عالم جلوہ باید خواندن ویرنگ قہمیدن

اسی ذات کے اسما و صفات کا پر تو دو عالم ہیں۔

بیدل غبار قافلہ اعتبار ما

بارے دگر نہ داشت ہمیں چشم بست و رفت

تمام کائنات عالم اعتبارات ہے کہ اس کی ہر ایک شے کسی نام سے
تعبیر ہوتی ہے، قافلہ جارہا ہو تو غبار راہ سے اس کا سراغ ملتا ہے، کہ یہ مجرد
قافلہ کی رفتار کی پیدا کی ہوئی ہے، قافلہ اسباب سے لدا ہوا ہوتا ہے،
بیدل علاقہ دنیاوی سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا ہے کہ مجھ بے نوا کے پاس
آنکھوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہی اسباب باندھا اور چلتا ہوا، یعنی آنکھیں
بند نہ ہوئیں تو دنیا سے گزر گئے، اس خاکدان کا غبار جسم خاکی یہیں رہ
گیا، ”چشم بست“ گویا یہی اسباب باندھا اور چل پڑے۔

وارث دیگر ندارد دودمان زندگی

ہر کہ حسرت بردازیں جا عبرتے با ما گذاشت

لوگ مرک ”حسرت“ تو ساتھ لے جاتے ہیں، وراثت میں پیچھے

”عبرت“ پھوڑ جاتے ہیں وہ مجھے پہنچتی ہے، (فاعتبروا یا اولی الابصار)

عالی یافتہ می جوشد ز مرگ اغنیاء

خواب این ظالم سرشتاں بدتر از بیداری است
کوئی مالدار مر جائے تو وراثت میں تنازع شروع ہو جاتا ہے، صاب
تخت و تاج مرے تو قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے، ان کا میزان کی
زندگی سے بدتر ہے، زندگی میں جس فتنہ و شر کا باعث رہے اس سے
بڑھ کر مرنے کے بعد ہوئے، زندگی میں فتنہ خوابیدہ مرنے کے بعد جاگ
اٹھتا ہے۔

بیدل نے فرمائشی غزل ”حنا“ کی تعریف میں کہی، چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

مشاطہ شوخی کہ بدست دل مابست
میخواست چمن طرح کند رنگ خوابست
آز چمنے را بسر انگشت تو پیچید
وا کرد نقاب شفق و غنچہ نما بست
زین نور کہ از شمع سر انگشت تو گل کرد
تا شعلہ زند آتش یا قوت خوابست
آں رنگ کہ می داشت در رخ از دلق گل
از دور کف دست تو بوسید و بیا بست
آبست ز شبنم دل ہر برگ گل امروز
کایں رنگ چمن ساز و فاختہ بجا بست
تا چشم کشاید مژدہ آغوش بہار است
رنگ سرناخن چقد رنجدہ کشا بست
بیدل تو ہم از شوق چمن شو کہ بایں رنگ
شیرازہ دیوان تو امروز حنا بست

بیدل

نقاشِ ازل تا کر موکراں بست
 تصویرِ میانِ ت بہاں موی میاں بست
 از غیرت ناز است کہ آن تحسِ جہان تاب
 واکرد نقاب از رخ و برشم جہاں بست
 آنچہ نتوان داد جز در دستِ محبوبانِ دل است
 و آنچہ نتوان ریخت جز در پایِ خیالِ دل بست
 وہ شے جو کسی کے ہاتھ میں سوائے محبوب نہیں دی جاسکتی دل ہے
 اور آبروِ خوبروؤں کے پاؤں کے سوا کہیں اور نہیں گرائی جاسکتی۔

چقدر عالم بیدلِ خیالِ آئندہ ایم
 ہر کہ بر ما نظرے کرد دل از ما برداشت
 ”دل از ما برداشت“ میں شعر کی لطافت ہے، جس کسی نے مجھ پر
 نظر کی دل برداشتہ ہو گیا یا میرا دل لے گیا، اس لئے میں بیدل ہی
 رہ گیا۔

ہر کجا گل کرد داغے بر دل دیوانہ سوخت
 این چراغے بکیسی تا سوخت در دیوانہ سوخت
 وضعِ دنیا، پیچِ بر دیوانہ تاثیرے نکرد
 بیشتر این برقِ عبرتِ خرمنِ فرزانه سوخت
 داغِ دل شد رہنمائیِ کوہِ دہاموں لالہ را
 سرِ بصرِ امیزند ہر کس متاعِ خانہ سوخت

شب کہ شد ناہد بغیضِ گردشِ جامِ آشنا

سبحہ جائی جڑ عہ مے برہ میں زندانہ ریخت
 دستور زنداں ہے کہ شراب پینے سے پہلے تھوڑی سی زمین پر
 چھڑک دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ کہتا ہے کہ
 اگر شراب خوری جرہ فشاں بر خاک

ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک
 حضرت زاہد گردش جام سے فیض یاب ہوئے تو دستور کے موافق
 ایک دو گھونٹ زمین پر چھڑکتے مگر آپ نے سبحہ کو زمین پر پھینک دیا،
 یعنی زہد دریا سے توبہ کی۔

ہر کہ آمد سیریا سے زیں گلستاں کرد و رفت
 گر ہمہ محل بود خون خود بداماں کرد و رفت
 نعل بر شعلہ، اٹھکے توشہ، آپے را ہبر
 شمع در شبگیر فرصت طرفہ ساماں کرد و رفت

گو ہر اشکے کہ پروردہم بچشم انتظار
 در تماشا شائی تو از دست نگہ غلطید و رفت
 چشم عبرت ہر کہ براء وراق روز و شب کشود
 ہچو بیدل معنی بے حاصلی فہمید و رفت

کس نہ رفتے بعدم ہستی اگر جا میداشت
 خلق از تنگی این خانہ بصحرا زدہ است
 خانہ ہستی کتنا تنگ ہے کہ لوگ صحرا کی طرف جا رہے ہیں،
 عدم ہی کشادہ مقام ہے۔

بیدل

ہر رنگ رنگ خرابات دگر میریزد
کس ندانست کہ ان چشم چہ صہبار ذات

حق رفاقت یاراں بجا نیا وردم
بیا یک آبلہ دل بود عذر خواہ شکست

حق رفاقت تو تب ادا ہوتا کہ یاروں کا ساتھ دیا جاتا وہ تو تنہا چلے
گئے، پاؤں میں چھالے مائع رفتار ہیں، میرے بھی پاؤں میں ایک آبلہ
تھا جسے دل کہتے ہیں پھوٹ کر ٹوٹ گیا، اتنا ہی عذر میں پیش کر سکا کہ
چلنے سے معذور ہوں۔ دوستوں کی جدائی پر دل کا شکستہ ہونا اور
دل کو آبلہ سے تشبیہ، مضمون آفرینی اسے کہتے ہیں۔

ہلاک شد جم و خیمازہ ہائی جام بجا ست
برگ نیز نندار د خمار جاہ شکست
جم تو مر گیا مگر اس کا جام ابھی تک نشہ کی ٹوٹ کی وجہ سے اگلڑاٹیا
لے رہا ہے، اہل جاہ خواہ مر جائیں خمار جاہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

گا ہے بکعبہ میروم و گہ بسوئے دیر
دیوانہ ام زہر طرّم سنگ میزنند
دیوانہ کے سر کی تواضع سنگ و خشت ہی سے ہوتی ہے، کعبہ و
دیر بھی سنگ و خشت کی عمارت ہیں سنگ آستانہ پر ماتھا رکھو۔
رہے آباد سنگ و خشت سے بچانہ و کعبہ
علاج شورش سراس سے بہتر ہو نہیں سکتا
آئینہ حضور دل تحفہ دیر و کعبہ نیست
آنچہ نثار ناز تست در ہمہ جا کہ میبرد،

رنگ ہاگم کردہ ام در خامہ نقاش عجز
 خار پائی گر کشتی تصویر من پیدا شود
 بوبر دیگر ہم نمی خواہد گداز دہسم وطن
 مے بساغر ریز تا اکسیر من پیدا شود

خواہد آخربے نفس گشتن بعریانی کشید
 مدتہ شد رشتہ از پیراہن مامی کشند
 تار نفس سے ہی رشتہ زندگی وابستہ ہے، میرے لباس وجود سے
 یہ تار ایک ایک کر کے نکال رہے ہیں آخر مجھے تنگا کر کے ہی چھوڑینگے،
 جب یہ رشتہ ہی نہ رہا تو زندگی بھی ختم ہوگئی۔
 اُس طرف احتیاج انجمن کبریاست
 چوں زطلب در گذشت بندہ خدای شود
 بندگی ادا احتیاج لازم و ملزوم ہیں، خدا بندہ نہیں ہے کہ غنی عن العالین
 ہے اور ادا احتیاج سے پاک ہے، اگر بندہ بھی محتاج نہ ہو تو یہ بھی خدا ہو جائے،
 مگر یہ ممکن نہیں۔

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین
 زمین فلک شود آدمی خدا نشود
 البتہ اخلاق الہی حاصل ہو سکتے ہیں۔
 اگر تسخیر و لہا در خیالات گزرد بیدل
 با حسان جہد کن کا یخا خدائی بندہ می گردد
 اگر دماغم دریں خمستان خمار شرم عدم نگیرد
 ز چشمک ذرہ جام گیرم باں شکوہ کہ جسم نگیرد
 اس شراب خانہ ہستی میں اگر ہمارے ذہن میں عدم کا خیال نہ ہو تو

ہر ایک ذرہ کی چشمک سے وہ جام لوں اور اس شان کے ساتھ کہ جم کو
بھی یہ بات نصیب نہ تھی، جم تو مر گیا اور عدم میں ہے، کتنا نازک خیال ہے
اور لفظوں کی بندش میں کیا لطف پیدا کیا ہے، نشہ ہستی ہرن ہو جاتا
ہے جب عدم کا خیال ذہن میں ہو۔

زحرص منعمان سعی گداہم کم مداں بیدل
کہ خاک از بہر خوردن بیش از آتش اشتہاد ارد
صرف آگ ہی ہر ایک شے کو نہیں اس سے بڑ کر مٹی کھا رہی ہے،
اس لئے دولت مند تو حریص ہیں مگر گدا بھی کم نہیں، ایک لوگ اور دوسرا
خاک دونوں "خوردن" میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر گل کہ دیدم آبلہ خوں چکیدہ بود
یار بچہ خار در دل گلشن شکستہ اند
ہر ایک پھول ایک آبلہ ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے، خدا ہی
جانتا ہے کہ گلشن کے دل میں کیا کائنات تھا کہ ٹوٹ کر رہ گیا۔
صد برق در کین نفس موج می زند
مردم نظر بشعلہ ایمن شکستہ اند
لوگ تو شعلہ طور کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں
حالانکہ ہر ایک دم میں سو بجلیاں کوند رہی ہیں، یعنی تیرے ہی سینہ
میں جلوۂ سینا ہے۔

ہستی برائے بیچ کس آسودگی خواست
گر دوست این کند بتو دشمن چہ می کند
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسان کیوں ہو (غالب)

ہستی سے ہمیں محبت ہے مگر یہ محبت تو دشمنی مول لینی ہے کیونکہ کوئی
زندگی میں آسودہ نہیں، البتہ ”کنج عدم میں آسودگی بسیار بود“
اور عدم ہستی کا دشمن ہے۔

جہاں نے می کند جاں یک جز عبرت کہ می داند
کہ سقف خانہ فرہاد آخر بیستوں گردد
لفظ ”بیسٹون“ اصل ”بہ ستون“ ہے، عام بول چال میں ”بے ستون“
رہ گیا، اگر گھر کی چھت ستون پر نہ کھڑی ہو تو قائم نہیں رہ سکتی، ایک
دنیا کوشش میں جان توڑ رہی ہے مگر دیدہ عبرت ہی دیکھ رہا ہے کہ فرہاد
کی طرح کوہ بیستوں سے ندی لانا جوئے شیر لانا ہے۔ فرہاد کے گھر کی چھت
آخر بیستون ہی تو ہے۔

جان پاکم فارغ از تیمار ہسم کردہ اند
عیسیٰ بر چرخ بردم خرنمیدانم چہ شد

دیرین زمانہ تقدس کجا تنزہ کو
مسح رفتہ و نقش سم خرافتا و است

مرآیائے پاچہ مشکل افتاد است
کہ تا قدم زدہ ام پائی بردل افتاد است

بقد رسی دراز است را و مقصدا
و گرنہ در قدم عجز منزل افتاد است
تو در کنارے و ما بے خبر، غلابے نیست

فروغ شمع تو بیروں محفل افتادہ است
 اُمید گوہری دیگر ازیں محیط کراست
 ہمیں بس است کہ گرے بساحل افتادہ است
 نہ نقش پا است کہ در وادی طلب پیدا است
 ز کارواں جرس چند بیدل افتادہ است
 یہ تمام غزل مرصع ہے، مقطع کتنا لطیف ہے کہ وادی طلب میں نقش پا
 نہیں، ”کارواں جرس“ سے چند بیٹو اگرے پڑے ہیں یعنی کوئی بھی منزل
 تک نہ پہنچا، راستہ میں دم توڑ دیا۔ ”جرس“ کی آواز سے کارواں کا سُرخ
 ملتا ہے اور نقش پا سے بھی سرو کا پتہ چلتا ہے، جرس بے صدا ہو کر رہ گئی
 اور نقش پا بیدلوں کی داستان مایوسی سناتا رہے ہیں۔

چسماں ز خلوت بروں خرامد نقاب نکشودہ نازنینے ؛
 کہ شش جہت ہجوم موج گوہر، ہجوم آغوش کرد تنگش
 نازک خیالی بیدل پر ختم ہے۔ شعر کی لطافت میں دقیق نکات
 معرفت کا حل بھی ہے، یعنی ذات باری تعالیٰ تو ابھی تک انہیب
 ہے، ابھی وہبہ ذوالجلال والا کرام زیر نقاب اسما و صفات ہے کہ شش
 جہت یعنی ابھی اسما و صفات نے اسے آغوش میں تنگ کیا ہوا ہے۔
 ”موج گوہر“ کیسی اچھی تشبیہ ہے گوہر بھی ہر طرف سے اسی امواج آب
 کے آغوش میں ہے۔

یار در آغوش و نام او نیدانم کھیت
 سادگی ختم است چوں آئینہ بر نیان ما
 یہ شعر نہایت لطیف اور دقیق ہے، آئینہ سادہ لوح ہے، اس کی
 آغوش میں حسین صورت ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کی تعریف کیا ہے؟

تعریف اسم اور صفت سے کی جاتی ہے، اور وہ ذات منزہ اسما و صفات ہے، اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں، حقیقت بیرنگ ہے اور یہ حقیقت انسانی ہے لیکن ہم اس کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتے، بات یہ ہے کہ مجھے میرے نام ہی سے بھلاتے ہیں، میں اپنے آپ کو اس نام کے بغیر ہی جانتا ہوں، لیکن دوسرے نام ہی سے تیری جان پہچان ہوں گی۔ اسی طرح ذات کو اسما و صفات سے موسوم اور متصف معرفت کے لئے کر رکھا ہے، ذات اس سے بے نیاز ہے، "باید بزاں خلق موسوم شدن" اسما و صفات کو ہم نے طاق نیاں پر رکھ دیا، ہم ذات پرست ہیں، اور وہ حقیقت مجروحہ ہے۔

بحر ہزج سالم میں جوابش را نقابش را کی زمین میں اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے، بیدل نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بتدبیر دگر ز اں جلوہ نتوان کام دل بردن
غبار من نگر از پیش بردار و نقابش را
خرامش مصرع شوخ رمیدن درمیاں دارد
نخواہم رفت اگر از خود کہ می گوید جوابش را
ندارد نازیلی شیوہ بے پردہ گردیدن
مگر مجنوں ز جیب خود در دطف نقابش را
دراں وادی کہ از خود رفتہ پیر می زند بیدل
شرع عرض خرام سنگ می داند شتابش را

بلبل بنا لہ حرف چمن را مفسر است
یارب زبان نگہت گل ترجمان کیست

نالہ بیل اور بوئے گل دونوں پریشان ہیں، "حرفِ چمن" کی
 شرح تو نالہ بیل ہے مگر بوئے گل کس کی ترجمانی کر رہی ہے حسن و عشق
 کس کی نمایندگی کر رہے ہیں۔

شیرازہ گل تھا بکھرا ہوا بے ربط عبارت نگہت تھی
 یہ مصرع بہار ہستی کا موندوں نہ تھا، انشا ہونہ سکا
 کوشش تو بہت کی غالب نے اور اختر نے بھی ریختہ میں
 انداز وہ طرز بیدل کا اشعار میں پیدا ہونہ سکا

تمام شد

